مدیر **صفدر علی خاں**

پاکستان اور کینیڈا سے بہ یک وقت شائع ہونے والا مجلّہ

ادب کی زندہ اقدار کا ترجمان　　مسلسل اشاعت کا انیس واں برس

انشا

خاکہ نمبر

خصوصی شمارہ: جنوری تا جون ۲۰۱۱ء　رجسٹرڈ نمبر ۹۳-۴-۸۸۹ H(P)

مدیر (اعزازی):
صفدر علی خاں

نائب مدیر:
عظیم راہی

معاونین:
محمد ایوب خان
سعد علی خاں

نمائندگان
☆ سید ثروت صبحیٰ (امریکہ)
☆ دانش حسنات (کینیڈا)
☆ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (انڈیا)
☆ نجمہ عثمان (برطانیہ)

مشاورت
☆ ڈاکٹر احمد سلطان
☆ پروفیسر ضیاء شاہد

مقام اشاعت: لطیف آباد، حیدرآباد (پاکستان)

ہماری مطبوعات اور سہ ماہی انشا کے لیے،

پوسٹ بکس نمبر 8712 صدر، کراچی

یا

صفدر علی خاں A-221، ارم ایونیو، فیز 1، سیکٹر 15/A-2، بفر زون، نارتھ کراچی

موبائل نمبر:092-0301-2037910۔ فون نمبر:021-6943932

Email: insha_hyd@live.com

ناشر: انور علی خاں مطبع: احمد برادرز، ناظم آباد

کمپوزنگ: ثاقب جاوید (بساطِ ادب) پاکستان

انشا کے چار شماروں کی قیمت

امریکا، کناڈا، آسٹریلیا، یوروپی ممالک اور شرق وسطیٰ کے لیے

۱۶۰۰ پاکستانی روپے یا ۱۲۵ امریکی ڈالر

دیگر ممالک (بشمول بھارت)

۱۲۰۰ پاکستانی روپے یا ۱۲۰ امریکی ڈالر

قیمت پاکستان میں:

فی شمارہ: ۶۰ روپے، سالانہ ۵۰۰ روپے بذریعہ رجسٹری

قیمت: خصوصی شمارہ ۲۰۰ روپے

maablib.org

فہرست

تبصرہ کتب:

نجیب عمر۔ شاہین زیدی۔ بہرام طارق۔ غالب عرفان۔ عشرت رومانی۔ سید شاہ عالم زمرد۔ اسد عباس خان۔ کرامت بخاری

توجہ فرمائیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد عرض یہ ہے کہ ہمارے نصف سال کی محنت اور کاوش کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خاکہ نمبر کا جو خاکہ ذہن میں بنایا تھا وہ ملک کے حالات اور ساتھ ہی ساتھ ادب کے حالات کے پیشِ نظر ممکن نہ ہو سکا۔ حالانکہ کوشش تو دلِ ناتواں نے خوب کی۔ کسی خاص موضوع پر نمبر ترتیب دینا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اپنے اعلان کے مطابق نمبر آپ کے سامنے ہے۔

میں ان تمام قلم کاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بیرونِ کراچی اور بیرونِ ملک سے اس نمبر کی اشاعت کو اہم بنانے کے لیے اپنی تحریروں سے نوازا۔

اب ذکر ہے ان دوستوں اور بزرگوں کا جو اس سال ادب کا ساتھ چھوڑ گئے مگر ان کی فکر اور کاوش ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ایسے لوگوں میں افتخار اجمل شاہین جیسے فی البدیہہ لکھنے والے اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے مفکر، عزم بہزاد جیسے خوش گو شاعر اور بزرگ اہلِ قلم جمیل عظیم آبادی (کراچی) اور زاہد رانکوی (میر پور خاص) جیسے صاحبانِ قلم شامل ہیں۔ تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی جا سکتی ہے۔

آخر میں ایک گزارش انشا کے ان قارئین سے ہے جو انشا کو پڑھتے رہے ہیں اور اب خاکہ نمبر ان کی نظر کے سامنے ہے۔ وہ اپنی بے لاگ رائے سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔ اور درویش کی صدا کیا ہے۔

صفدر علی خاں

maablib.org

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

بابائے اردو خاکہ نگاری کے آئینے میں

اب تک اردو زبان وادب میں خاکہ نگاری کا واضح تصور قائم نہیں ہوسکا اس کا واضح تصور نہ تو قارئین کے پیش نظر ہے اور نہ ہی اس کی واضح تعریف خاکہ نگاروں کے سامنے ہے جس طرح انشائیہ کی واضح تعریف یا ایسی تعریف جس پر سب متفق ہوں نہیں ملتی۔ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں بھی ادیبوں اور نقادوں میں اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ خاکہ نگاری کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے اب تک لوگ سوانح عمری، شخصیات نگاری، (شخصیت نگاری) سیرت نگاری یادداشتوں اور مرقع نگاری کو خاکہ نگاری کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ دور کیوں جائیں صرف بابائے اردو کی خاکہ نگاری پر جن تین بڑے ادیبوں اور نقادوں (لکھا تو اوروں نے بھی مگر صرف تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں) نے لکھا ہے ان مضامین کے عنوانات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام لوگ شخصیت نگاری، سیرت نگاری، اور مرقع نگاری کو ایک ہی قبیل کی چیزیں سمجھتے ہیں۔ بابائے اردو اس قسم کی تحریروں کو مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابن فرید نے جب بابائے اردو کی اس قسم کی تحریروں کا جائزہ لیا تو اس کا عنوان 'شخصیات کی پردہ زنگاری' میں رکھا۔ جب کہ اسلوب احمد انصاری نے مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری پر مضمون لکھا ہے۔ اور پروفیسر وقار عظیم نے اپنے اس قسم کے مضمون کا عنوان 'بابائے اردو کی سیرت نگاری' رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان ادیبوں اور نقادوں کا بھی زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ بابائے اردو کے اس قسم کے مضامین جو 'چند ہم عصر' میں شامل ہیں سب کے سب خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ہاں ان میں سے چند عمدہ خاکوں کے ذیل میں ضرور آتے ہیں اور اسی حوالے سے ان پر بات بھی کرنی چاہیے تھی۔ ان کے بیشتر مضامین میں خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری یا یادداشتوں کی ملی جلی خصوصیات یا اوصاف پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگ انہیں مختلف نام دے دیتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر صابرہ سعید اپنے

مضمون 'خاکہ نگاری' (مطبوعہ 'افکار' کراچی) کے اختتام پر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ خاکہ کی کوئی ایسی جامع تعریف کرنا ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام ادبی اور فنی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ محترمہ آمنہ صدیقی بھی اپنے مضمون میں خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے ایک شخصی خاکہ ہے یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جسمیں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جس کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے اس میں تفصیل سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے''۔

شخصیت نگاری بڑی حد تک خاکہ نگاری سے قریب تر صنف ہے مگر شخصیت نگاری میں خاکہ نگاری والی بات پیدا نہیں ہوتی دراصل خاکہ نگاری کے لیے انگریزی میں Pen portrait کا لفظ استعمال ہوتا ہے مگر بقول ڈاکٹر بشیر سیفی خاکہ پورٹریٹ کا نہیں بلکہ اسکیچ کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس فرق کو اور زیادہ اس طرح واضح کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''مصوری کی زبان میں بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی مضمون رنگین پورٹریٹ ہے...... جبکہ خاکہ پنسل اسکیچ ہے جس میں کم سے کم لائنوں میں چہرے کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو ابھارنے کے لیے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے''

ہم خاکے کی مختصر تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ وہ مختصر مضمون ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکہ (شخصیت) کے تمام خدوخال نمایاں نہیں کرتا بلکہ مخصوص الفاظ اور مخصوص انداز میں اس شخصیت کے انہیں خدوخال کی تصویر پیش کرتا ہے جس سے اس کے مخصوص اور مطلوبہ ظاہری اور باطنی نقوش موثر انداز میں اُبھر کر سامنے آ جائیں۔ اس طرح جب ہم بابائے اردو کے 'چند ہم عصر' پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں شامل سارے مضامین تو خاکے کے ذیل میں نہیں آتے مگر چند شخصی مضامین ایسے ضرور ہیں جنہیں ہم خاکہ کہہ سکتے ہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے چند اہم خاکوں میں کر سکتے ہیں۔ ان کے کامیاب خاکوں میں 'گدڑی کا لال'، 'نور خان'، 'نام دیو مالی'، 'مولوی محمد عزیز

مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، محسن الملک، مولانا محمد علی مرحوم، سر سید راس مسعود، ڈاکٹر محمد اقبال، عبدالرحمن صدیقی، اور ڈاکٹر بجنوری وغیرہ ان موخر الذکر دو خاکوں کے علاوہ دیگر شخصی مضامین جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں ۸۰ فیصد سے زائد خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں اس لیے ہم ان کو خاکہ نگاری کی ذیل میں رکھیں گے۔

ڈاکٹر بشیر سیفی نے اپنی کتاب 'خاکہ نگاری فن وتنقید' میں تمام قابل ذکر اور اہم خاکہ نگاری کی کتابوں کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں:

> "خاکہ نگاری کے مجموعوں کے اس تنقیدی جائزے سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اردو میں اس صنف کے واضح تصور کے تحت بہت کم خاکے لکھے گئے ہیں"۔

اور بالعموم شخصیات پر لکھے گئے ہر قسم کے مضامین کو خاکے سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے اس سلسلے میں انہوں نے مشفق خواجہ کا خیال بھی پیش کیا ہے۔ بقول مشفق خواجہ اس غلط فہمی کا سبب یہ مروجہ خیال ہے کہ اگر کسی فرد کے بارے میں کتاب لکھی جائے تو وہ سوانح عمری کہلاتی ہے اور مضمون لکھا جائے تو وہ شخصی خاکہ ہوگا۔ مشفق خواجہ خاکہ نگاری سے متعلق کہتے ہیں شخصی خاکہ صرف شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے اس رو سے جب ہم بابائے اردو کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے بیشتر مضامین شخصی خاکوں کی عمدہ مثالیں ہیں ان کی واحد شخصی مضامین کی کتاب 'چند ہم عصر' میں چند شخصی مضامین ایسے ہیں کہ جو نہ صرف طویل ہیں بلکہ ان میں مذکورہ شخصیت کے حوالے سے بہت سی ایسی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو خاکے کی تعریف میں نہیں آتیں مثلاً سرسید احمد خان پر ان کا شخصی مضمون جو اس عنوان سے اس میں شامل ہے ۲۲۳ صفحات سے لے کر ۲۵۳ صفحات پر مشتمل یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ اسے ہم خاکہ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ طوالت ہے بلکہ یہ خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس مضمون میں انہوں نے سرسید کے علمی اور زبان وادب کی خدمات (بالخصوص اردو زبان) کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ہندو مسلم اتحاد، کانگریس اور مسلم لیگ کا ذکر بھی تفصیل سے ملتا ہے غرضیکہ سرسید اردو کانگریس اور مسلم لیگ ہندو اور مسلمانوں کے حوالے سے بے شمار تفاصیل اس میں شامل ہیں، تہذیب الاخلاق کے لمبے لمبے اقتباسات دیئے گئے ہیں ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان

کی تالیف و تصنیف کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ دراصل یہ سرسید کی منجملہ خدمات کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اسے ہم سرسید سے متعلق ایک بھرپور مضمون تو کہہ سکتے ہیں مگر اسے خاکہ نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح نواب عمادالملک پر ان کے تحریر کردہ شخصی مضمون کو خاکہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں خاکہ نگاری کی بنیادی خصوصیات نہیں ملتیں اور یہ بھی دوسرا طویل مضمون ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اسے ہم ایک اچھا شخصی مضمون تو کہہ سکتے ہیں مگر خاکہ نہیں کہہ سکتے۔ اردو میں فرحت اللہ بیگ کے شخصی مضمون 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا بڑا شہرہ ہے اور بلاشبہ یہ ایک عمدہ مضمون ہے جسے لوگ خاکہ کہتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کے اندر خاکہ تو ہے مگر یہ بہ ذات خود خاکہ نہیں ہے کیوں کہ اس میں خاکہ نگاری کے برخلاف ایسی تفاصیل ہیں جو خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتیں۔

حلیہ نگاری اور مرقع نگاری اور مختلف واقعات کا ذکر خاکہ نگاری کے جملہ خصوصیات میں آتے ہیں مگر یہ خصوصیات شخصی مضامین، سوانحی مضامین، سیرت نگاری میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسے ہم یوں سمجھ لیں کہ شاعری کی بہت سی خصوصیات نظم میں پائی جاتی ہیں اور غزل میں بھی مگر بعض ایسی بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنا پر ہم ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ یعنی وہ واضح فرق جس کی بنا پر ہم مختلف اصناف سخن کو علاحدہ کرتے ہیں انہیں بنیادی فرق کے باعث ہم بابائے اردو کے ہر شخصی مضمون کو خاکہ کہنے سے قاصر ہیں۔

خاکہ نگار کو کس قسم کے واقعات کو اپنے خاکوں میں پیش کرنا چاہیے اس سلسلے میں بھی کوئی واضح اصول متعین نہیں ہے اس سلسلے میں حفیظ صدیقی نے (نقوش طفیل نمبر) لکھا ہے کہ 'موضوع خاکہ کی شخصیت کی روشنی میں لانے کے لیے تین قسم کی باتوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔

(۱) وہ باتیں جنہیں اخلاقی محاسن سمجھا جاتا ہے جیسے حیا، خلوص، معصومیت، رواداری، ایثار، تحمل، خوش معاملگی اور تبحر علمی وغیرہ۔

(۲) وہ باتیں جنہیں اخلاقی معائب سمجھا جاتا ہے جیسے مغلوب الغضبی، خود غرضی، الحاد بدزبانی اور جنسی بے راہ روی وغیرہ۔

(۳) وہ باتیں جنہیں نہ اخلاقی خوبیاں سمجھا جاسکتا ہے، نہ خامیاں جیسے ایک خاص قسم کا

لباس پہننا، کرسی پر اکڑوں بیٹھنا، ایک خاص انداز میں چلنا، بلند آہنگ قہقہے لگانا، بلیاں یا کبوتر پالنا، پتنگ اڑانا، ہجوم میں بدحواس ہو جانا، چٹپٹی چیزیں کھانا، حقے یا پان سے رغبت، یادوں سے بہلانا، خیالی پلاؤ پکانا وغیرہ۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن میں سے بیشتر باتوں کا ذکر ایک خاکہ نگار اپنے خاکوں میں کرتا ہے مگر ان کو باقاعدہ یا کلیہ نہیں بنایا جاسکتا کیوں کہ ان باتوں کا ذکر کوئی شخص اپنی شخصی یا سوانحی مضامین میں بھی کرسکتا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ خاکہ نگاری میں بھی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے ہاں لکھنے کا انداز علاحدہ ہوتا ہے۔

اردو میں شخصی مضامین زیادہ تر مرحومین پر لکھے گئے ہیں یعنی ان کے مرنے پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رقم کیے گئے ہیں مگر اس سلسلے میں بابائے اردو بہت سے دوسرے شخصی مضامین لکھنے والوں سے منفرد نظر آتے ہیں، انہوں نے اپنے شخصی مضامین اور خاکوں میں زندہ شخص کے منفی پہلوؤں اور معائب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے خاکوں میں اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی غلطیوں، کوتاہیوں، اور ان کے معائب کا ذکر بھی کیا ہے کہ جبکہ مرحومین کی یاد میں لکھے گئے شخصی مضامین یا خاکوں میں لوگ ان کے معائب سے چشم پوشی کرتے ہیں اور ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر ابن فرید لکھتے ہیں کہ:

> "انسان کے بارے میں بابائے اردو کا ایک واضح تصور ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان آدمی ہونے کی بنا پر اپنے اندر کچھ کمزوریاں رکھتا ہے (بے عیب ذات خدا کی، کون ہے جس میں عیب نہیں؟")

وہ اپنے ممدوح کو ایک فرشتہ بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتے...... اس سلسلے میں وہ حالی کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بابائے اردو نے حالی کی منکرانہ اور ہمدردانہ شخصیت میں بھی ان کی بشری کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

بابائے اردو کی خاکہ نگاری کی اس خصوصیت کا ذکر امجد کندیانی (اردو میں خاکہ نگار، نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء) میں کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ 'محمد علی جوہر کی تعریف کرتے کرتے ایک دم ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیتے ہیں اس سے لہجے کا توازن تو کچھ مجروح ہوتا ہے مگر رائے کا

توازن اجلا ہو جاتا ہے۔ محمود' مسعود' سید علی بلگرامی وغیرہ کے حال میں یہ توازن پورا ہے جیسا کہ ان کی اکثر تحریروں میں ہونا چاہیے۔ امجد کندیانی 'چند ہم عصر' کے مضامین کو خاکہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اپنے مواد اور تکنیک کے اعتبار سے اس کتاب کو خاکہ نگاری کے ضمن میں لانا بہت مشکل ہے مگر مجھے امجد کندیانی کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے۔ میں چند ہم عصر کے بیشتر مضامین کو خاکہ ہی سمجھتا ہوں کیوں کہ ان میں تکنیک اور مواد خاکہ نگاری ہی کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اپنے موقلم سے شخصیتوں کی ایسی کامیاب، پراثر اور دل نشیں تصویر بناتے ہیں کہ ان میں جان ڈال دیتے ہیں اور ان کی یہ تصویریں ہمیں چلتی پھرتی یعنی متحرک نظر آتی ہیں ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ اور اکثر خاکوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں پین پورٹریٹ نہیں بلکہ پنسل اسکیچ کا کمال کر دکھایا ہے۔ اکثر اپنے خاکوں اور شخصی مضامین کو ایسے جملوں سے شروع کرتے ہیں کہ جن سے اس شخصیت کا چہرہ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے جس کے بارے میں وہ لکھنے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے خاکے میں جگہ جگہ ایسے پرمعنی اور وقیع جملے استعمال کرتے ہیں جس کی تفصیل اگر کوئی لکھنی چاہے تو اس مقصد کے لیے کئی اوراق درکار ہوں گے۔ یہ بابائے اردو کے خاکوں کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت ہے چند مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہو جائے گی۔

"نواب عظیم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت لیاقت و فضیلت حاصل کی اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے"۔

(مولوی چراغ علی مرحوم)

"آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن ایسے شخص کی موت سے دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کی بہبودی وابستہ ہو، جس قوم کی رہبری اور سرداری کے لیے ملک کی نظر انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی ہوئی نظر نہ آتی ہوں ہزار حسرت و افسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے"

(مولوی عبدالعزیز مرزا مرحوم)

"وہ اپنے فن اور رنگ میں ایک تھا۔ اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لاابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور دشمن کا پکا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا مگر خیال میں اس نے ایک عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثل بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی۔ عداوت تھی تو انتہا درجے کی"۔ (حکیم امتیاز الدین)

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں"۔

(مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی)

"لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں، میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید یہ کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں اور امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے"۔

(گدڑی کا لال۔ نور خان)

"قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے"۔

(نور خاں)

"ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وضع داری سے آگے نہ بڑھے"۔ (نور خاں)

"سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض اوقات اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں"۔

(نورخاں)

"دوسرے روز مقبرے میں آئے۔ باغ کا رجسٹر منگایا اور نورخاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے"۔

(نورخاں)

"نواب محسن الملک اس شاہراہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسید ڈال گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا اور بڑھایا یہ انہیں کا کام تھا۔ ان کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار ہے"۔ (محسن الملک)

"ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے مولانا محمد علی مرحوم عجیب وغریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا ان دونوں میں عظمت اور شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی ہے"۔

(مولانا محمد علی مرحوم)

"گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا دنیا کے معاملات سے بے خبر، لاابالی، اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ دیوانہ سمجھتا گھر کا حال گھر والی جانے اور باہر کا حال باہر والے جانیں۔ وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا"۔

(شیخ غلام قادر گرامی)

"قوموں کا امتیاز مصنوعی رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی حسن کسی کی میراث نہیں یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں"

(نام دیو مالی)

"وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا"۔

(نام دیو مالی)

"تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا"۔

(نام دیو مالی)

"ضرورت تو اس بات کی تھی کہ چند اور مثالیں پیش کی جاتیں مگر طوالت کے خوف سے انہیں چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان مثالوں سے یہ بات وضح ہو جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق چند جملوں میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جسے بیان کرنے کے لیے دوسروں کو کئی صفحات درکار ہوں گے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ان چند جملوں میں یا چند الفاظ میں اپنی پسندیدہ شخصیات کی خصوصیات اور ان کے اوصاف کی ایسی واضح اور مکمل تصویر پیش کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخص کا واضح تصور آ جاتا ہے اور وہ اپنے چشم باطن سے ایسی شخصیتوں کو چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ بابائے اردو کی خاکہ نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں"

"چند ہم عصر میں کل ۲۳ شخصی مضامین پائے جاتے ہیں جن میں ایک شخصی مضمون پروفیسر مرزا حیرت، مولوی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس طرح ۲۲ شخصی مضامین مولوی عبدالحق کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جن میں سے کچھ طویل ہیں اور کچھ مختصر کچھ کو ہم بلا تامل خاکہ کہہ سکتے ہیں اور کچھ کو خاکہ کہنے میں مجھے تامل ہے جس کا اظہار میں پہلے کر چکا ہوں۔ بہر حال ان کے چند خاکوں اور کامیاب خاکوں کی وجہ سے انہیں اردو کا ایک اہم اور منفرد اور ممتاز خاکہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ آخر میں ابن فرید صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے مضمون کے ایک اقتباس پر اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

"بابائے اردو نے 'چند ہم عصر' لکھ کر صرف اپنے معاصرین ہی کی شخصیت کا جائزہ نہیں لیا

ایضاً، ص ۴۲ سر

سعید حسن

اردو خاکے کی روایت اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری
کاروان رفتہ کی روشنی میں

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت مختصر افسانے کی طرح سے ہے یہ انگریزی sketch سے مستعار ہے قدیم نمونوں میں اس کی مثال سوانح نگاری میں نظر آتی ہے۔ جس میں مختلف ادوار کی نفسیات، افراد کے حالات زندگی، افتادِ مزاج، فنی مزاج، اور تہذیبی شعور کا عکس نظر آتا ہے لیکن اس ضمن میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تحسینی انداز میں تزئین کا عنصر شامل ہو جاتا ہے گویا کہ:

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستان کے لیے

ڈاکٹر پروفیسر شاہ علی نے سوانح اور خاکہ نگاری کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا:

"سیرت ایک قدِ آدم تصویر ہے اور شخصی مرقع صرف چہرے کے کسی ایک رخ سے ایک ہلکی اور مختصر جھلک جو زیادہ تر مرقع نگار کے اپنے تصور کی ترجمانی کرتی ہے لیکن یہ تصور اس کی سوجھ بوجھ اور قوت متخیلہ وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جس سے شخصیت کی ایک عمدہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر قائم ہو سکے"

شاہ صاحب کے اس بیان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاکہ نگار لیے لازمی نہیں کہ وہ صاحب ممدوح کے متعلق واقعات و جزئیات پر تحقیق کرے اس کے ذہن وفکر کی رسائی پر بے اعتدالی یا لغزش کا حکم صادر کرے اس کے نامہ اعمال پر کوئی فردِ جرم عائد کرے یا اس کے حالات و واقعات اور جذبات کے مشاہدے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ بلکہ ایک سرسری نگاہ جو ہیرو کی شخصیت کا بھرپور تعارف کرا دے کافی ہے۔

خواجہ نثار احمد فاروقی نے اچھے خاکے کی پہلی شرط بیان کی ہے:

"وہ خاکہ ہو غیر ضروری تفصیل سے کام نہ لیا جائے وہ تاریخ ،سوانح نہ ہو"

ڈاکٹر شاہ علی کا خیال ہے شخصی مرقعے دلچسپی اور مقبولیت میں غزل اور مختصر افسانے کے حریف ہیں۔افسانہ کیا ہے؟ خیالی افراد کے شخصی مرقعے ہی تو ہیں۔اگر حقیقی افراد کے مرقعوں میں فنی انداز کو کام میں لایا جائے تو یہ افسانے سے زیادہ دلچسپ ہو سکتے ہیں۔افسانوں میں افسانہ نگار اپنے مختلف تجربات و مشاہدات کے پیوند لگا کر ایک رنگا رنگ مرقع پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شخصی مرقعے میں اس کی ضرورت اور اجازت نہیں حقیقی مرقعوں میں صرف جلا پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔

اردو کے قدیم تذکرے کسی حد تک خاکے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔خاکوں کی ضرورت کے پیش نظر محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھی جس میں خاکوں کی جھلک نظر آتی ہے لیکن شاعروں کی انفرادیت (خاکوں کے اعتبار سے) واضح نہیں ہوتی اس کا اظہار خود آزاد نے اس طرح کیا ہے کہ:

"خیالات نے مجھ پر یہ ضروری سمجھا کہ بزرگوں کے حالات جو مجھ تک پہنچے ان کو اسی طرح یکجا کر دیا جائے کہ ان کی زندگی کے مختلف پہلو چلتے پھرتے نظر آئیں"۔

چنانچہ آزاد نے اپنے بزرگوں کی وضع قطع ،جسامت لباس وغیرہ کو حقیقت کے دلکش پردے میں اس طرح بیان کر دیا کہ اس دور کی ایک مکمل تہذیب ہمارے سامنے نظر آتی ہے یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہم آب حیات کو خاکہ نگاری کا اولین نمونہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن یہ پیش نظر رہے کہ ان خاکوں کی کوتاہیوں کی بنیادی وجہ آزاد کے پاس خاکہ نگاری کا مستند نمونے کا نہ ہونا ہے۔

چنانچہ آب حیات تذکرہ نگاری کے زمرے میں آتی ہے۔لیکن یہ ضرور ہے کہ شعراء کے یہ تذکرے خاکوں کے قریب ہیں۔

محمد حسین آزاد کے بعد باقاعدہ لکھا جانے والا خاکہ مرزا فرحت بیگ نے ۱۹۲۷ء میں لکھا جس کا نام ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی تھا اس میں انہوں نے اپنے استاد کے حالات واقعات بیان کیے اس کی اول کمزوری طوالت ہے دوسری یہ کہ جگہ جگہ ڈپٹی صاحب کی زبانی

کئی بیان فنی کمزوری شمار ہوتے ہیں۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس خاکے سے ڈپٹی صاحب کے لباس،
عادت واطوار رہن سہن اور پڑھانے کے طریقے یکجا ہونے سے معلومات دلچسپ انداز میں یکجا
ہوگئی ہیں یہ فن خاکہ نگاری کے لوازمات کافی حد تک پورا کرتے ہیں۔مرزا کی دوسری کتاب 'دہلی کا
یادگار مشاعرہ' ہے اس کا زاویہ نگاہ آب حیات ہے جو کئی ادوار کا احاطہ کرتی ہے جبکہ دہلی کا یادگار
مشاعرہ صرف ایک دور کا مشاعرہ ہے ۱۹۳۹ء میں جے نند کمار نے منشی پریم چند کا خاکہ انتہائی سادہ
انداز میں لکھا ہے۔اس دور میں ظہیر الدین جامعی کی 'اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی'
سامنے آئی۔

ریڈیو کی بدولت ایک نیا انداز سامنے آیا مختلف ادیبوں کے خاکے ریڈیو سے نشر کیے گئے
جسے ۱۹۴۱ء میں یکجا کر کے کتاب کی صورت 'کیا خوب آدمی تھا' کے نام سے شائع کیا گیا۔۱۹۴۳ء
میں ایسے ہی خاکوں کا ایک مجموعہ ''گفت وشنید'' کے نام سے سامنے آیا جسے بشیر احمد ہاشمی نے مختلف
پیشوں مثلاً چپڑاسی، کلرک اور معاشرے کے نچلے طبقے کے لوگوں کے حوالے سے لکھا جس میں
بنیادی خامی یہ رہی کہ مصنف نے سطحی اور بے جان طنزیہ لہجہ اختیار کیا گویا خاکہ لکھا نہیں اڑایا گیا۔
بعد کے ادوار میں انتہائی کامیاب خاکہ نگاری کا مجموعہ ''گنج ہائے گرانمایہ'' سامنے آیا جسے رشید احمد
صدیقی نے لکھا اس کی اہم خوبی یہ ہے کہ خاکہ نگاری کافی جاندار ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن
اگر جاندار طریقہ پر برتا جائے تو عام آدمی بھی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے دوسرا مجموعہ ہم نفسان رفتہ ہے
جو خاکوں کے بنیادی مقصد شخصیت کی سیرت کو ابھارنا اور کم سے کم الفاظ میں ایک جامع تصویر کشی
کرنا تاکہ شخصیت مذکورہ ابھر کر سامنے آئے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد بابائے مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔نام
دیو مالی اور نور خاں، مولوی صاحب کے جذبہ خلوص کے آئینہ دار ہیں۔چند ہم عصر کی سب سے بڑی
خوبی یہ ہے کہ اس میں امارت اور غربت کی تقسیم نہیں ہے۔

۱۹۵۲ء میں سعادت حسن منٹو کی ''گنجے فرشتے'' شائع ہوئی۔جو منفرد انداز میں لکھی گئی۔
خاکے افسانوی انداز میں لکھے گئے۔منٹو کی دوسری کتاب ''لاؤڈ اسپیکر'' ہے جو پرانے انداز میں لکھی
گئی۔

۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب 'ملک ادب کے شہزادے' شائع ہوئی اس میں شعراء کے متعلق مختصر مضامین ہیں جو خاکہ نگاری کے لبادے میں ان کے خدوخال، صورت وسیرت بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر شائع ہوا جس کا بنیادی مقصد مشاہیر کی زندگی کے مشاہدات قریبی لوگوں کی واقفیت اور حقائق واقعات کو جمع کرنا تھا لیکن یہ کسی حد تک نیم سوانحی ہونے کے سبب خاکوں سے دور نظر آتا ہے۔ عصمت چغتائی کا دوزخی (اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی) گوکہ اس کا انداز افسانوی ہے مگر یہ خاکے کے فن کے قریب قریب ہے۔ عصمت چغتائی کا دوسرا خاکہ اسرار الحق مجاز کے بارے میں ہے یہ خاکہ کم جذباتی مضمون زیادہ ہے۔ عبدالمجید سالک کی یاران کہن صحافتی انداز لیے ہوئے ہے۔ شوکت تھانوی کی ''شیش محل'' اشرف صبوحی کی ''چند عجیب ہستیاں'' عبدالرزاق کانپوری کی ''یاد ایام''۔ شاہد احمد دہلوی کی ''گنجینۂ گوہر'' اور ''بزم خوش نفساں'' مولانا ابوالحسن کی ''پرانے چراغ''، ضمیر جعفری کی ''سرور رفیقانہ کی رو''، چراغ حسن حسرت کی ''مردم دیدہ''، میرزا ادیب کی ''ناخن کا قرض'' اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''رہ نوردان شوق''، آوارگان عشق، جلوہ ہائے صد رنگ، شجر ہائے سایہ دار، یاران دیرینہ، غزالان رعنا شامل ہیں علاوہ ازیں چند اور نام جن کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، ان میں ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، عطاالحق قاسمی، فارغ بخاری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر اسلم فرخی، اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری شامل ہیں جن کی تحریروں نے زبان وادب کے دامن کو وسیع تر کیا ہے۔

کاروان رفتہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے ۳۶ خاکوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات ورسائل میں چھپے۔ ان کی اہم بات یہ ہے کہ خاکے تحقیقی انداز سے پُر ہیں یہی ان کی انفرادیت ہے اس میں سے بعض ایسے ہیں جو متعلقہ افراد کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے اور بعض ایسے ہیں جن کا انتقال ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران ہوا۔ ایسے افراد کے بارے نئی اور اہم معلومات کی فراہمی کا بطور خاص خیال رکھا گیا، کاروان رفتہ کے دیباچہ میں مشفق خواجہ نے تحریر کیا ہے:

''قادری صاحب کے شخصی وسوانحی مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ ایک مجموعہ میں نہیں سما سکتے''۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے ٹھیک ہی کہا:

''مرحوم اس کتاب کا دوسرا حصہ شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اب خود اس کتاب کا عنوان بن گئے۔ افسانے کہتے کہتے افسانہ بن گئے ہیں۔ افسوس کہ بوڑھے زندہ ہیں اور ایسے جوان

جن سے بوڑھوں کو سہارا تھا رخصت ہو گئے دنیا کی یہی ریت ہے "کل من علیہا فان"

والد محترم محمد ایوب قادری روہیل کھنڈ کے تاریخی قصبہ انولہ ضلع بریلی میں جولائی ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۵۰ء میں انٹر کا امتحان پاس کر کے پاکستان ہجرت کی ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی اے اور ۱۹۶۲ء میں ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا زمانہ طالب علمی ہی سے تصنیف و تالیف میں مصروف تھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(۱) مولانا فیض احمد بدایونی رسوا (۲) مولانا احسن نانوتوی (۳) تواریخ عجیب عرف کالا پانی (۴) مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۵) مجموعہ وصایہ اربعہ (۶) تذکرہ نوری (۷) فرحت الناظرین (۸) سیر العارفین (۹) مآثر الامراء تین جلدیں (۱۰) ارباب فضل وکمال (۱۱) جنگ آزادی واقعات شخصیات (۱۲) جنگ نامہ آصف الدولہ (۱۳) علی گڑھ اور قومی نظمیں بطور شریک مصنف، غالب عصر غالب (۱۴) تذکرہ علمائے ہند (۱۵) مرقع شہابی (۱۶) نقوش سیرت، (۱۷) طبقات اکبری ۳ جلدیں (۱۸) ایوب نامہ (۱۹) حضرت ابوبکر صدیق (۲۰) حضرت عمر (۲۱) حضرت عثمان غنی (۲۲) مثنوی بولوے ازعیب (۲۳) عہد بنگس میں علمی وثقافتی تاریخ (۲۴) علم و عمل (دو جلدیں) ۱۴ عدد ذاتی ڈائریاں جس میں باقاعدہ روزنامچے تحریر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ۵۰ کتب پر مقدمہ تقریباً ۲۰۰ مضامین برصغیر پاک وہند کے ممتاز علمی و تحقیقی رسائل وجرائد کی زینت بنے۔ مآثر الامراء کے ترجمہ پر ۱۹۷۰ء میں مبلغ ۵ ہزار روپیہ انعام بھی ملا۔ اتنی بڑی تعداد میں علمی شاہکار تخلیق کرنا کوئی آسان کام نہیں وہ بھی اس طرح کہ تصنیف و تالیف ذریعہ معاش نہ ہو جز وقتی مشغلہ ہو اور بالآخر ۱۹۷۹ء میں بہ عنوان 'اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ' (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) پیش کر کے ۱۹۸۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس مقالے پر ان کے انتقال کے بعد صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔

کاروانِ رفتہ میں والد صاحب نے شخصیت سے متعلق معلومات کا وسیع ذخیرہ یکجا کیا میں سمجھتا ہوں کہ یہ تاریخ وتحقیق کے صہبات ومسائل ہیں جن کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کسی خاکہ نگار اور خاکے میں اس قدر مواد یکجا نہیں ملتا۔ مواد کی فراہمی کا یہ انداز آپ کے محقق ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ ان خاکوں میں آپ نے ہیرو کے حوادث زندگی اور علائق حیات کے پس منظر

میں اس کے ذہنی اور نفسیاتی وجود کو تلاش کیا ان میں ہیرو کی انفرادیت ذوق جمال انانیت اور علم و فضل کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کچھ خاکے ایسے ہیں جن سے خاکہ نگار کی عقیدت نظر آتی ہے۔ مگر عقیدت و محبت ہونے کے باوجود خاکہ نگاری کے تقاضوں کے پیش نظر شخصیت کو مسخ نہیں ہونے دیا بڑی کاوش انتاہی صائب انداز میں سیرت کے نقوش اس طرح واضح کیے کہ ممدوح کردار کی مضبوطی، عالی حوصلگی، ہمت کا اندازہ ہوتا ہے والد محترم کے زبان و بیان میں غیر معمولی قدرت اور اظہار گرفت نظر آتی ہے واقعات کا تسلسل اور قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے آپ چونکہ بنیادی طور پر محقق ہیں لہذا ان میں رنگین بیانی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی اسلوب سادہ ہے اور یہی سادگی اس کا اصل جوہر ہے اس تخیل کی رنگینی پردے کے بجائے آئینے کا کام کرتی ہے۔ ایک کامیاب خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیر تحریر شخصیت کے کردار کو بخوبی سمجھتا ہو بظاہر یہ کام جتنا سادہ نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔

جب تک کہ خاکہ نگار اپنے موضوع کے داخلی اور خارجی عوامل سے کماحقہ واقفیت نہ رکھتا ہو یعنی جب لکھنے بیٹھے تو زیر مطالعہ شخصیت کو تہہ در تہہ دیکھ سکے اور ایک خاص بات کہ خاکہ نگار کو انسان شناسی کا احساس ہو اس نے شخصیت کو قریب سے دیکھا ہو سمجھنے اور برتنے کا پورا پورا موقع ملا ہو۔

اگرچہ والد صاحب اپنے بیشتر خاکوں سے اس طرح نہیں ملے کہ ان کے ایام زندگی (ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے) ان کے سامنے ہیں مگر ان کے ہاں ایک کامیاب محقق بولتا ہے۔ اس کی بہترین مثال پیر جی محمد یوسف (جاورہ) کا خاکہ ہے جو سوانح عمر یوسفی کے قلمی نسخے کی مدد سے لکھا۔ یہ والد صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ کاروان رفتہ کے خاکے تاریخ، چشم دید واقعات و تعلیقات، گفتگو اور ملاقاتوں پر مبنی ہیں اس انتخاب میں انہوں نے اپنی قربت کو نہیں عظمت کو پیش نظر رکھا ہے۔

عام خاکہ نگاروں سے ہٹ کر ان کی توجہ شخصیت کے ان پہلوؤں پر پڑتی ہے جہاں تک ہر ایک کی رسائی باآسانی ممکن نہیں آپ نے ان نقوش کو اپنے منفرد اسلوب سے اس طرح اجاگر کیا کہ یہ خاکے حالات، واقعات اور عظمت کار کے سبب مستقبل کے مورخ اور محققین کے لیے تاریخ کا بیش بہا مواد فراہم کریں گے۔ خاکوں میں تحقیق کا یہ انداز قابل ستائش اور صرف آپ کا خاصہ

ہے۔

والد محترم کی تمام زندگی درس وتدریس اور تحقیق میں گزری۔ جس میں خصوصاً برصغیر کے صوفیاء، علماء، تحریک آزادی میں حصہ لینے والے اکابرین شامل ہیں۔ لہٰذا غیر ارادی طور پر ان کے تاثرات وتحریر میں صوفیاء، علما کا فکری عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان کی پیش کردہ معلومات اکثر دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ اس لیے کہ والد صاحب نے ان افراد سے ان کی زندگی ہی میں ان کے متعلق بنیادی معلومات یکجا کر لی تھیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اپنا مقام پیدا کیا تھا۔

علمی تحقیق وتلاش ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی اور شب وروز اسی عبادت میں مصروف رہتے تھے ان کے سامنے علمی تحقیق کے بہت سے منصوبے تھے جو ان کی ناگہانی موت نے خاک میں ملا دیے ہم ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی میں تو در کنار مرنے کے بعد بھی اعتراف کمال میں بخل کرتے ہیں لوگ ہمیں مردہ پرست کہتے ہیں لیکن ہم نہ زندہ پرست ہیں نہ مردہ پرست صرف جاہ منصب پرست ہیں اور چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔

اگر میں یہ بات کہوں تو بے جا نہ ہوگی کہ والد محترم بہت کم درجہ کی علمی صلاحیت رکھنے والے محض جتھے بندی کی بنا پر عالموں اور ادیبوں کے سردار بنائے گئے لیکن علمی حقیقت ان کی جو ہے وہ لکھی جانے والی تاریخ سے ہی معلوم ہوگی۔ آنے والا محقق والد محترم کی تحریروں سے اندازہ لگائے گا کہ ان کی لیاقت صلاحیت اور محنت کا ہم نے کیا صلہ دیا۔

مختصراً یہ کہ کاروان رفتہ اردو خاکہ نگاری کے ادب میں نہ صرف دلکش اضافہ ہے بلکہ منفرد انداز سے لکھی گئی ہے۔ اس میں ان ادوار (جس دور کی شخصیت ہے) کی تہذیبی زندگی کی مرقع کشی، ادبی محافل، گھریلو صحبتیں وضعداری اور مذہبی رواداری کا عکس نظر آتا ہے۔

تحریر کا جادو، مواد پر قدرت جو ان کے خاکوں میں نظر آتی ہے وہ آسانی سے کسی اور کے حصے میں نظر نہیں آسکتی یہی علامہ شبلی کا علمی ورثہ ہے۔ چنانچہ دبستان شبلی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس کا حق ادا کر دیا۔

کاروانِ رفتہ کے بعض کرداروں سے میری ملاقات بھی رہی بچپن میں جب دروازے پر دستک ہوتی تو میں دروازہ پر جاتا حفیظ اللہ پھلواری، ماہر القادری، مفتی انتظام اللہ شہابی، حبیب اللہ خاں، غضنفر صاحب کو میں نے بھی دیکھا جب بھی تصور میں سوچتا ہوں تو یہ چہرے میری آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ زندگی کی بولتی چالتی تصویروں میں نظروں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور یہی ایک کامیاب خاکہ نگاری کی دلیل ہے۔

بقیہ بابائے اردو ۔۔۔

ص ۱۲ کا بقیہ

ہے بلکہ اپنی شخصیت کے اکثر گوشے بھی پیش کر دیے ہیں انہوں نے جو کچھ بھی دوسروں کی ذات میں دیکھا ہے جو کچھ پسند کیا ہے یا ناپسند کیا ہے وہ ایک طرح سے انسان کی آرزو تمنا یا احتراز ہے جو صرف دوسروں کی گلی کے موڑ پر کھڑے ہو کر دیکھتا نہیں رہتا بلکہ انسانی سرشت کا فریضہ بھی انجام دیتا رہتا ہے"۔

یہ مجموعہ فکری انقلاب کے لیے راہیں ہموار کرے گا۔ عبدالحسیب خان (سینیٹر)
ممتاز مزاحمتی شاعر اور ایڈیٹر ماہ نامہ ادبی دنیا
جناب عارف شفیق کے شعری مجموعے
یقین
کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے
ناشر: ماہنامہ ادبی دنیا SP/1 بلاک ۲ میزنائن فلور اکرم اسکوائر کراچی

جمال نقوی

خاکہ نگاری یا حقیقت نگاری

خاکہ نگاری کسی کردار کی وہ قلمی مصوری (pen sketch) ہے جس میں اس انسان کے خدوخال اور ظاہری شخصیت کے ساتھ ہی اس کے باطنی خصائل کی تصویر کشی بھی اس احتیاط سے کی جاتی ہے کہ اس میں کردار کی تضحیک کا شعوری عنصر شامل نہ ہو۔

ادیب کے لیے خاکہ نگاری بہت ہی نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ کسی بھی کردار کے ساتھ انصاف حقیقت نگاری کے اس ترازو کی طرح ہوتا ہے جس کے دونوں پلڑے balanced ہوں۔ یعنی نہ تو کردار کی طرف بے جا جھکاؤ یعنی اسے ایک مثالی کردار کا نمونہ بنادیا جائے جو باتیں اس کی شخصیت کا حصہ نہ ہوں وہ اس سے منسوب کردی جائیں۔ اس سے خاکہ نگاری کی جانبداری کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح خاکہ نگاری میں 'غالب کے اڑیں گے پرزے' والی بات بھی نہیں ہونی چاہیے۔ یعنی کسی کردار کی صرف خامیوں اور کمزوریوں ہی کو اجاگر کیا جائے یا اسے اس قدر مضحکہ خیز بنادیا جائے کہ وہ صرف ایک مزاحیہ کردار بن کر رہ جائے۔

خاکہ نگاری حقیقتاً ادب کی بہت ہی مستند اور معتبر صنف سخن ہے جس سے کسی کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس کے لیے خاکہ نگار کو اس کردار کی ظاہری اور باطنی شخصیت کا عمیق مطالعہ کرنا ہوتا، اس کے عادات وخصائل سے شناسائی حاصل کرنا ہوتی ہے، جلوت وخلوت میں اس کے عمل کی تصویر کشی کو بڑی ذمہ داری توازن اور حرف وقلم کے تقدس کے ساتھ موضوع گفتگو بنانا ہوتا ہے۔ تمام تر احتیاطوں کے ساتھ تحریر کیے گئے خاکے قاری پر اپنا مثبت اثر چھوڑتے ہیں اور ادب میں یادگار رہتے ہیں۔

ابھی تک جو کچھ کہا گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف حقیقت کا بیان ہی کسی تحریر کو خاکہ کہلانے کا جواز بنتا ہے۔ میں نے یہ بتانا چاہا ہے کہ حقیقت نگاری کسی خاکے کا بنیادی جز ہوتا ہے

لیکن خاکہ نگاری کے لیے قوت مشاہدہ، دلچسپ پیرایۂ بیان توازن اور ذمہ داری کے ساتھ کردار سے انصاف اور سنجیدگی بہت ضروری ہے۔ اگر یہ تمام باتیں کسی تحریر میں ہوں گی تو پھر وہ خاکہ کسی کردار کی حقیقی شخصیت بن کر ابھرتا ہے اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی زندہ کردار سے ملاقات کر رہا ہے۔

خاکہ نگاری کے لیے ضروری نہیں ہے کہ صرف نام ور شخصیات ہی کے خاکے تحریر کیے جائیں۔ ہماری روزانہ زندگی میں ایسی بہت سی کم اہم شخصیات کی عملی زندگی کا کوئی پہلو اتنا اہم ہوتا ہے جسے اجاگر کر کے اگر زمانے کے سامنے پیش کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ شخصیت اجاگر ہوتی ہے بلکہ ہماری سماجی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر بھی اس کے مثبت اثرات پڑتے ہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ ہمیں 'خاکہ نگاری' کے لیے بہت سنجیدگی، دیانتداری اور محنت سے کام کرنا ہوگا تاکہ یہ صنف سخن جدید طرز اظہار کے ساتھ ادب میں اپنی حیثیت برقرار رکھے۔

بقیہ آزاد رشیدی

درمے سخنے ہر طرح سے یہاں ادب کی آبیاری کی۔

"اچھا تو جناب ہیں" آزاد رشیدی مرحوم کا پہلا نثری مجموعہ ہے۔ اس میں سولہ خاکے، پانچ فکاہیے اور ایک ادھورا افسانہ "دھوپ چھاؤں' ہے مرحوم کا یہ نامکمل افسانہ دراصل ان کی اپنی زندگی کی داستان ہے جو انہوں نے مجھے مختلف اوقات میں سنائی تھی۔ لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کو افسانوی انداز میں لکھ رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ شاید وہ اپنی سوانح مکمل طور پر اسی انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وقت نے مہلت ہی نہ دی۔ بہرحال جتنا کچھ لکھا وہ بھی ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ مرحوم چند احباب کے خاکے اور بھی لکھنا چاہتے تھے خاص طور پر اپنے استاد آسی رام نگری، مہر الٰہی شمسی مرحوم، نکہت بریلوی، حافظ رشید، رفیق خاکی، سید خورشید عالم، عزیز وارثی، مگر علالت کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ ۱۰ استمبر ۱۹۹۷ء کو رات دس بجے اس دار فانی سے دار البقا سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی بیوہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

فائزہ عروج (حیدرآباد)

جمیل زبیری کی خاکہ نگاری

جمیل زبیری ایک ہمہ جہت ادیب ہیں انہوں نے اردو نثر کی دیگر اصناف کے ساتھ 'خاکہ' کی صنف کو بھی برتا۔ انہوں نے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے ایسے خاکے تحریر کیے جس سے ہمارے معاشرے کا ایک تہذیبی اور ثقافتی پس منظر سامنے آتا ہے۔

جمیل زبیری کے ۱۲ اشخاص کے خاکوں پر مبنی مجموعہ 'رفتار حیات' کے نام سے مئی ۲۰۰۲ء میں مکتبہ دانیال نے شائع کیا اس مجموعے میں انہوں نے نامور ہستیوں کو نہیں بلکہ عام اشخاص کو موضوع خاکہ بنایا۔ رفتار حیات میں پہلی ہستی خود ان کے نانا صدیق مارہروی کی ہے جن کو احسن مارہروی سے تلمذ حاصل تھا۔ اسی لیے وہ مارہرو اور اس کے باہر اپنا منفرد شاعرانہ مقام رکھتے تھے۔

جمیل زبیری نے خاکے میں اپنے نانا کو بہ حیثیت کل جس طرح دیکھا اور محسوس کیا اسی رنگ میں پیش کیا۔ خاکہ نگار نے جو واقعات پیش کیے ان سے شخصیت کی زندگی کے اہم پہلو سامنے آتے ہیں گویا واقعات کے انتخاب میں خاصی توجہ دی گئی ہے انہوں نے صدیق مارہروی کو شاعر کم اور اپنے نانا کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی ہے چونکہ نانا ہونے کی وجہ سے جمیل زبیری ان کی خلوت و جلوت کے ساتھی تھے اسی لیے خاکہ بھی کردار نگاری کی اچھی مثال ہے۔ ان کی شخصیت کے ساتھ اس عہد کے تہذیبی و ثقافتی رنگ و رہن سہن کو بھی پیش کیا ہے جو اس وقت کے جاگیرداروں، نوابین اور روسا کی طرز زندگی تھی۔ صدیق مارہروی بھی جاگیردار تھے اور انہوں نے بھی اپنی دولت اور جاگیر دوسرے جاگیرداروں کی طرح لٹائی تھی اس سلسلے میں جمیل زبیری رقم طراز ہیں۔

"میرے نانا کا تعلق قصبے کے جاگیرداروں میں سے تھا مگر وہ اور ان کے بڑے بھائی اور جاگیردار تقریباً سب ہی کی جائیدادیں مرغ لڑانے، بٹیر بازی اور پتنگ بازی وغیرہ کی نذر ہو چکی تھیں۔" (۱)

جمیل زبیری نے اپنی عزیز ترین ہستی کو فطری انداز میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جس کے باعث صدیق مارہروی ہنستے بولتے، چلتے پھرتے، اپنے شوق پورے کرتے نظر آتے ہیں۔ خاکہ چوں کہ ایسی شخصیات کا لکھا جاتا ہے جن سے خاص تعلق ہو اسی لیے اکثر خاکہ نگار کردار نگاری کرتے ہوئے مروت میں بشری کمزوریوں سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ لیکن جدید ادبی رویوں کے باعث خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ جمیل زبیری نے ان کی بشری کمزوریوں سے پہلوتہی نہیں کی یہی وجہ ہے کہ خاکہ اپنا بھرپور تاثر قائم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے نانا کا خاکہ اسی محبت اور احترام کے ساتھ لکھا جو ان کو اپنے نانا سے تھی۔ اس لیے انہوں نے چاہا کہ ان کے نانا اپنے جسد خاکی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا نہ ہو جائیں لہٰذا انہیں لفظوں کے آرٹ کے ذریعے امر کر دیا۔

دوسرا خاکہ 'بادشاہ میاں' کا ہے یہ خاکہ نگار کے رشتے میں تایا تھے۔ جمیل زبیری کو بادشاہ میاں سے قربت کے بہت کم مواقع میسر آئے مگر چند لمحوں نے ہی ان کی سیرت کے ایسے پہلو آشکار کیے کہ زبیری صاحب قلم اٹھائے بغیر نہ رہ سکے۔ خاکے کا محرک بادشاہ میاں کی ہیبت ناکی تھی۔ جسے خاکہ نگار نے واقعات کی مدد سے پیش کیا شخصیت کی فطرت اور عادات کو بہت عمدگی سے من وعن پیش کیا ہے ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو بظاہر اپنی وضع داری نبھاتے ہیں مگر اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور نہ ایسے لوگوں کی کمی ہے جو اپنے اندر متکبرانہ سوچ رکھتے ہیں خود کو مکمل انسان سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے انداز فکر کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ خود بھی ذہنی مریض ہوتے ہیں اور معاشرے کو بھی بیمار کرتے ہیں۔

بادشاہ میاں کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ جو اپنی کھوکھلی وضع داری نبھانے کے چکر میں گھر والوں کو ذہنی مریض بنا کر چھوڑتے ہیں گھر والے ان کی موجودگی میں سہمے نظر آتے ہیں اور غیر موجودگی میں ماحول بدل جاتا ہے۔

"ان کے گھر سے غائب ہوتے ہی چند لمحوں تک گھر میں وہی سناٹا رہا میں سہما ہوا آنگن میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گیا ذرا دیر بعد تائی اماں کمرے سے برآمد ہوئیں اور مجھے گلے لگایا اور بچے بھی جمع ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زندگی دوبارہ جنم لے رہی ہو ماحول بدلتا دیکھ

کہ میری جان میں جان آئی تھوڑی دیر میں ہم لوگ اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ جیسے
کچھ ہوا ہی نہیں'' (۲)

بادشاہ میاں کے خاکے میں واقعات نگاری کے ذریعے فطرت اور عادت کو ہو بہو لطف لے کر بیان کیا ہے ہمارے معاشرے میں والد اور استاد کا کردار انتہائی ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے ان دونوں شخصیات کے معاشرے پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان دونوں کی غیر ذمہ داری سے معاشرے میں احساس محرومی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے اور بے اعتمادی اور بے اعتباری کا رجحان تقویت پاتا ہے۔ اس خاکے کا موضوع ایک باپ ہے وہ باپ جس نے معاشرے کو احساس محرومی میں مبتلا اور خوف زدہ نسل دی یہ ایک کامیاب خاکہ ہے فنی اعتبار سے بھی اور اس اعتبار سے بھی کہ بادشاہ میاں کا تعلق ہمارے ہی معاشرے سے ہونے کی وجہ سے یہ ایک ایسا کردار ہے جو ہمیں اپنا احتساب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

تیسرا خاکہ 'ابراہیم میاں' کا ہے جو خاکہ نگار کے آبائی قصبہ مارہرہ کے مجذوب بزرگ تھے اس خاکے میں احترام و عقیدت کا جذبہ شروع سے آخر تک ملتا ہے جمیل زبیری اور ان کے بزرگوں کے دل میں ان کی شخصیت اور کردار کا بڑا اثر تھا اور وہ مارہرہ کی ایک ہر دل عزیز شخصیت تھے ہمارے معاشرے میں ویسے بھی پیر یا 'اللہ والوں' کے لیے ایک عقیدت موجزن رہتی ہے ابراہیم میاں کا بھی اسی بنا پر احترام کیا جاتا تھا ان کے روحانی تصرف سے قصبہ مارہرہ اور اردگرد کے لوگ شب و روز مستفید ہوا کرتے تھے یہ بہت بڑی بات ہے کہ دنیادار جب معاشرے کی خدمت کرتا ہے تو قدم قدم پر حساب کتاب رکھتا ہے اور خدمت کے عوض وہ معاشرے سے اس کا صلہ حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے لیکن اللہ کے ولی دن رات معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں اور بغیر کسی صلے کی تمنا کیے بغیر اللہ کی رضا حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جمیل زبیری نے اپنے بزرگوں سے ان کی خدمات اور شخصیت کے بارے میں جو باتیں سنیں اور انہیں قلم کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کر دیا اور ثابت کیا کہ ابراہیم میاں بھی ایک قابل تقلید شخصیت ہیں۔

مولوی برکت علی کا خاکہ دوسرے خاکوں سے قدرے مختلف ہے مولوی برکت علی خاکہ نگار کے استاد تھے اس خاکے میں مولوی صاحب کی زندگی اور شخصیت کے چند دلچسپ واقعات قلم بند

کیے ہیں۔ مولوی صاحب چونکہ استاد تھے اس لیے خاکہ نگار نے اس بات کی تردید ضروری سمجھی کہ خاکے کا مقصد اپنے استاد کا مذاق اڑانا نہیں ہے۔

زبیری صاحب کی خاکہ نگاری کی خاص بات واقعہ نگاری ہے وہ واقعات کا انتخاب بڑی مہارت سے کرتے ہیں جس سے شخصیت کا بھرپور تاثر جلد قائم ہوتا ہے اپنے استاد کی رنگین مزاجی کو بڑے ہی شگفتہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔

> "مولوی صاحب اس عمر میں بھی خاصے رنگین مزاج تھے انھیں شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا معلوم نہیں کیا بات تھی کہ وہ جب بھی شادی کرتے کچھ عرصے بعد ان کی بیگم اللہ کو پیاری ہو جاتی یا ان سے طلاق لے کر چلی جاتی۔ وہ خود ہی بتاتے تھے کہ پچھلے سال چھٹی شادی کی تھی" (۳)

رنگین مزاجی کے باوجود ان میں ایک شرافت اور رکھ رکھاؤ بھی تھا جس کا اظہار ان مواقع پر ہوتا تھا جب وہ کلاس کے لڑکوں کی فرمائش پر نصاب سے ہٹ کر لیکچر دیتے تھے ان لیکچرز کے دوران وہ تمام لڑکیوں کی چھٹی کر دیتے تھے۔ مولوی صاحب اپنی شگفتہ طبیعت کی وجہ سے شاگردوں میں بہت مقبول تھے۔ شاگرد ان سے بہت محبت کرتے تھے اور بلا جھجک ہر بات کر لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب بھی ان کو سبق آموز باتیں بتاتے تھے جو ان کی آنے والی زندگیوں میں کام آسکتی تھیں یہ خاکہ اس لیے دوسرے خاکوں سے مختلف ہے کہ شوخ بیانی کے ساتھ واقعات بیان کر کے خاکے کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اکرام خان پر لکھا جانے والا خاکہ ایک پٹھان کے مضبوط کردار، دلیرانہ محبت اور دوستوں کی وفاداری کی کہانی ہے اکرام خان نے ایک عیسائی لڑکی ریمپلی سے محبت کی اور اس کو ریمپلی سے رابطہ بنانے میں تمام مراحل اپنی مضبوط ارادی کے باعث بہ خیر و خوبی سے طے کیے اس خاکے کی ایک خصوصیت شخصیت کی عہد کی پاسداری بھی ہے کیوں کہ محبت بھی ایک عہد ہے جو محبوب اور محب کے درمیان طے پاتا ہے اور اسی عہد کو وہی لوگ نبھاتے ہیں جو عہد کی پاسداری کرنا جانتے ہوں اور ایفائے عہد کو اپنا ایمان مانتے ہوں۔ اکرام خان کا تعلق بھی ایک پٹھان گھرانے سے تھا اور پٹھان قوم اپنے عہد کی پاسداری کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

اکرام خان کا دور قیام پاکستان سے پہلے کا ہے جب معاشرتی پابندیاں آج سے زیادہ سخت تھیں۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل تھیں اس وقت ایک عیسائی لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنا اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا یہ ہر قوم اور ہر مذہب سے بالاتر ہوتی ہے نیت صاف اور سچی لگن سے ہر منزل آسان بنائی جا سکتی ہے۔ خاکہ کی دوسری اہم چیز دوستوں کی وفاداری اور حق دوستی ہے۔ اکرام کے دوستوں نے ہر قدم پر ان کا بھرپور ساتھ دیا اور جس طرح حق دوستی نبھایا وہ قابل تقلید ہے۔ آج کل ایسی دوستیاں نایاب ہیں ان کی جگہ مفاد پرستی، حسد، بغض نے لے لی ہے دوست ہی دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے میں لگا ہے۔

نادر شاہ سفیان خاکہ نگار کے نانا کے دوست تھے اور شاعری کے ساتھ پہلوانی کرتے تھے دنیا میں ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے بعض لوگوں کو اپنے بارے میں بڑائیاں مارنے کا خبط ہوتا ہے۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے تفریحاً جھوٹ بولتے ہیں۔ نادر شاہ کا تعلق بھی انہی شخصیات میں ہوتا ہے۔

جس طرح ایک باغ میں پھولوں کے ساتھ کانٹے، خود رو گھاس بھی ہوتی ہے اسی طرح ہمارے معاشرے میں مختلف عادات واطوار مزاج، رنگ وروپ اور نقوش کے حامل کردار ملتے ہیں دنیا ان ہی لوگوں کی موجودگی کے باعث دلچسپ متنوع اور قابل ذکر ہوتی ہے۔ جس طرح باغ میں کانٹے پھولوں کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں اور خود رو گھاس پودے کی غذا چوس کر اسے کمزور کر دیتی ہے یہی سب کچھ انسان کی دنیا میں بھی ہے یہاں محافظ بھی ہیں اور خون چوسنے والے بھی، ہنسنے ہنسانے والے بھی اور نادر شاہ سفیان جیسے خبطی اور مبالغہ آرائی کے ماہر بھی۔

''اماں بی'' کا خاکہ اپنے اندر کئی جہات سمیٹے ہوئے ہے زبیری صاحب ایک منفرد شخصیت نگار ہیں وہ کردار نگاری کے لیے واقعات کے انتخاب میں بہت محنت کرتے ہیں۔

اس خاکے میں ایک طرف اماں بی کی عادات وفطرت کو اجاگر کرتے ہیں دوسری طرف مسلم معاشرے کی جہالت اور ایمان کی کمزوری کو سامنے لائے ہیں۔ اماں بی کا خاکہ قیام پاکستان سے پہلے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتا ہے کیوں کہ مسلمانوں نے تعویذوں اور گنڈوں کی

بدعت ہندوؤں کے رسم ورواج سے ملی ہیں اس وقت لوگ تعلیم کی کمی یا شعور کی کمی کی وجہ سے اپنے جائز کاموں کے لیے بھی تعویذوں کا سہارا لیا کرتے تھے بلکہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل ان تعویذوں اور گنڈوں میں تلاش کرتے تھے لیکن یہ ہمارا المیہ ہے کہ آج اتنے سال گزر جانے کے باوجود ہمارے معاشرے میں بھی بہ کثرت لوگ ایسے موجود ہیں جو سادہ لوح انسانوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور مجبور اور بے کس لوگوں کے جذبات اور ایمان سے کھیلتے ہیں اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو حسد کی آگ میں دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے تعویذ کا سہارا لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تعلیم وشعور رکھنے والے لوگوں کا ان تعویزات اور گنڈوں پر اعتقاد کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا ہے بلکہ آج کل تو اخبارات اور رسائل میں باقاعدہ اشتہارات دیے جانے لگے ہیں۔

اماں بی ان جعلی عاملوں کے گروہ کی نمائندہ ہیں اور ان میں جعلی عاملوں والی تمام خصوصیات لالچ وہوس، خود غرضی، سازشی ذہن کی مالک وغیرہ بدرجہ اتم موجود تھیں یہ کردار ہر طرح سے منفی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔

طاہر شاہ کا خاکہ ایک ایسے انسان کا خاکہ ہے جو خوبیوں وخامیوں کا مجموعہ ہے جو دکھ ملنے پر روتا ہے اور خوشی ملنے پر کھل اٹھتا ہے۔ طاہر شاہ خاکہ نگار کے افسر تھے۔ اور ہر دلعزیز شخصیت تھے اپنی بزلہ سنجی اور مجلسی مزاج کی بدولت بے انتہا مقبول تھے۔ ایک باعمل انسان اور محفل کی شان سمجھے جاتے تھے

> "طاہر شاہ کا ریڈیو اسٹیشن کراچی پر ڈائریکٹر کا تقرر ہونے کے بعد ایسا لگا کہ جیسے بہار آ گئی ہو چاروں طرف پھول ہی پھول کھل گئے ہوں ان سے پہلے شمس الدین بٹ صاحب نہایت سنجیدہ، نمازی پرہیزگار اور ثقہ آدمی تھے برخلاف ان کے، طاہر شاہ بڑے مجلسی، بہت بولنے والے اور لطیفہ گو آدمی تھے" (۴)

ہر انسان اپنی مدح سرائی کا طالب ہوتا ہے اپنے اندر سراہے جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ طاہر شاہ بھی اپنی تعریف سننے کے شوقین تھے۔ اپنے افسر ہونے کا فائدہ بھی اٹھاتے تھے جو ہر افسر کا طریقہ ہے محافل اور دعوتوں کے شائق تھے اس لیے ماتحتوں کا خرچہ کراتے، اپنے ماتحتوں کو اپنے

جیسا انسان سمجھتے تھے اس لیے تمام لوگ ان سے محبت کرتے اور وہ ان سب سے محبت کرتے تھے۔ وہ ایک نرم دل انسان تھے اور پینے پلانے کے بعد ان کی نرم دلی زیادہ عود کر آتی تھی۔ شخصیت کا یہ تضاد ہی انہیں مکمل انسان ظاہر کرتا ہے۔

ناصر جہاں کے خاکے کا محرک ان کی داغ مفارقت تھی وہ خاکہ نگار کے عزیز دوست اور رفیق کار تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے زبیری صاحب کو بہت صدمہ تھا اس کا اندازہ خاکے کے ابتدائی جملوں سے ہوتا ہے ایسا اکثر ہوتا ہے کہ بعض قریبی شخصیات کی اموات سے خاص کر اچانک موت سے زندگی میں خلا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ناصر جہاں کی موت سے خاکہ نگار کو اپنی زندگی میں خلا محسوس ہوا جس کو پُر کرنے کے لیے انہوں نے ناصر جہاں کی قلمی تصویر کشی کی۔

جمیل زبیری خاکے میں شخصیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ شخصیت کے فن کی ثانوی حیثیت ہے۔ اسی وجہ سے ناصر جہاں کو مرثیہ خواں کے بجائے ایک نیک سیرت انسان اور عزیز دوست کے روپ میں پیش کیا۔ وہ نرم دل، نیک انسان تھے، ان میں وہ خوبیاں موجود تھیں جو ایک عام انسان میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

> ''میں نے ان جیسا بے فکر اور بے پروا انسان زندگی میں کوئی دوسرا نہیں دیکھا، وہ کسی چیز، کسی بات کو سنجیدہ نہیں لیتے تھے نہ کسی چیز کا اثر دل پر لیتے، نہ کبھی کسی کی شکایت کرتے، نہ کسی بات کا گلہ کرتے وہ کہتے تھے زبیری میں اپنا دل آئینے کی طرح صاف رکھتا ہوں''(۵)

اس ایک جملے سے ان کی شخصیت مکمل طور پر ہمارے سامنے آتی ہے یہ صفات، درگزر صبرو قناعت ہمارے معاشرے سے عنقا ہوتی جارہی ہے اس کے برعکس آج ہر انسان دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے خوب سے خوب تر کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز کا فرق مٹایا جارہا ہے منافقانہ رویے زیادہ دیکھنے میں آرہے ہیں۔

عبدالقدوس بہاری کا خاکہ ایک سادہ لوح انسان کا خاکہ ہے جو سادہ دل ہونے کے ساتھ بڑی متضاد شخصیت کے مالک تھے اور یہی خاکے کا محرک ہے۔ ہر انسان میں تھوڑی بہت کمزوریاں ہوتی ہیں۔ مگر عبدالقدوس بہاری کی سادہ لوحی ان کی کمزوریوں کو زیادہ نمایاں کرتی

تھیں۔ جن کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو بہت چالاک سمجھتے تھے۔

عزت اور دولت شہرت پانا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ عبدالقدوس بہاری بھی اس سے متراانہ تھے مگر وہ ان تینوں چیزوں کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کا فرق ان کے کردار میں خود پسندی اور دکھاوا زیادہ نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ان میں ایک ایسی خوبی بھی تھی جو ان تمام کمزوریوں پر حاوی تھی وہ بہت بامروت انسان تھے ہر ایک کے برے وقت میں کام آنا ان کی عادت تھی۔ اس لیے لوگ انہیں تنگ بھی کرتے تھے اپنی سادہ لوحی کے باعث انہوں نے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ ایسی متضاد شخصیت کا حامل خاکہ اپنی نوعیت کا منفرد خاکہ ہے۔

حافظ خیرات علی ایک مومن انسان تھے۔ ریڈیو پاکستان پر مذہبی پروگرام کی ریکارڈنگ کرتے تھے ان میں وہ خوبیاں تھیں جو کسی مومن کی پہچان ہوتی ہیں۔ حقوق العباد ان کا ایمان تھا۔ خوش مزاج، محنتی، انسان تھے۔ دوسروں کی تواضع کر کے خوش ہوتے تھے۔ سب سے بڑھ کر وعدے کے پابند تھے۔ یہ وہ وصف ہیں جن کی ہمارے مذہب اسلام میں سختی سے تلقین کی گئی ہے۔ وہ لوگوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ اکثر دفتر والوں کی دعوت کرتے تھے۔ ایک دن دعوت کا اہتمام کیا اس دن شدید بارش ہوگئی مگر انہوں نے شدید بارش میں بھی دعوت کا انتظام کر کے اپنے وعدے کی پاسداری کی۔

اس خاکے کو مد نظر رکھ کر اگر میں یہ کہوں کہ جمیل زبیری کے اندر ایک سچا کھرا اور پاکیزہ انسان موجود ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا انہوں نے ان ہی معیارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعوری طور پر ایسی شخصیات پر قلم اٹھائے جو منفرد تھیں۔

حسینہ بیگم کا خاکہ رفتار حیات کا آخری خاکہ ہے۔ جو ایک کاہل اور پھوہڑ خاتون ہیں ان کی طرز زندگی اور طرز رہائش کسی مشرقی خاتون کے بالکل برعکس تھی۔

اس خاکے میں ایک گھریلو ماحول کم دیکھنے میں آتا ہے۔ جمیل زبیری نے ان کی عادات اور حرکات وسکنات کی من وعن تصاویر پیش کی ہیں۔ قاری کو وہ ایک جاہل، پھوہڑ، کم عقل خاتون کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ حسینہ بیگم جیسی خواتین کی بھی دنیا میں کمی نہیں ایسی ہی خواتین کے لیے مولوی نذیر احمد نے مراۃ العروس جیسا اصلاحی ناول لکھا۔ مگر حسینہ بیگم تو مراۃ العروس کی اکبری سے

بھی زیادہ پھوہڑ نظر آتی ہیں۔ کسی بھی خاتون کا گھر اس کے لیے جنت ہوتا ہے اور عورت کے سلیقہ کا اندازہ اس کے گھر اور خاص طور پر باورچی خانے سے لگاتے ہیں حسینہ بیگم کے گھر کا ماحول کسی بھی نفیس انسان کے لیے الجھن کا باعث ہے۔ سردیوں میں گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ اور وہ مزید کاہلی کا شکار ہو جاتیں۔

"کوئٹہ میں کمروں میں انگیٹھیاں بنی ہوتی ہیں ان میں کوئلہ جلتا تھا حسینہ بیگم کی دنیا اب اس انگیٹھی کے پاس آ گئی تھی وہ اس کے پاس فرش پر بیٹھی رہتی کھانے پکانے کا اور دیگر سامان آس پاس چاروں طرف بکھرا رہتا جس چیز کی ضرورت ہوتی ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیتیں استعمال کر کے وہیں واپس رکھ دیتی وہیں توا رکھ کر روٹی پک جاتی اور وہیں ترکاری، سالن" (۶)

حسینہ بیگم کی طرز رہائش میں قابل اعتراض بات کسی غیر مرد کے ساتھ رہائش اختیار کرنا تھا۔ جس کو ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے اور نہ شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے مگر انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی وہ جس کے ساتھ رہائش اختیار کر لیتی اسے بیٹا بنا لیتی مگر منہ بولے رشتے کبھی سگے رشتوں کا بدل نہیں ہو سکتے ان کی اسی ناعاقبت اندیشی نے ان کے ہنستے بستے گھر کو برباد کر دیا اور جس گھر میں ہر وقت قہقہے گونجتے تھے اس کو خاموشی نے ڈس لیا۔

حسینہ بیگم کے خاکے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہیں کھانے اور سونے کے علاوہ کسی اور بات سے غرض نہ تھی اور اس خاکے سے یہ بھی سبق حاصل ہوتا ہے کہ ایک اچھی سلیقہ مند خاتون ہی گھر کی زینت ہوتی ہے اور شریعت کی حدود کی پاسداری میں ہی انسان کی بھلائی ہے۔ حسینہ بیگم کا خاکہ اتنا منفرد ہے کہ جسے پڑھ کر قارئین مدتوں یاد رکھیں گے۔

الغرض جمیل زبیری کا ہر خاکہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد خاکہ ہے وہ خاکہ نگاری میں مولوی عبدالحق سے متاثر نظر آتے ہیں انہوں نے صدیق مارہروی اور ناصر جہاں کے علاوہ تمام غیر معروف ہستیوں کے خاکے لکھے اور ناصر جہاں اور صدیق مارہروی کے خاکے میں بھی ان کی سیرت کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ ظفر عمر زبیری صاحب کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جمیل زبیری نے مولوی عبدالحق کے انداز میں ان چند عام انسانوں کے خاکے تحریر کیے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی متاثر کن انگ ضرور تھی" (۷)

جمیل زبیری کی خاکہ نگاری کا محرک ان کا تخلیقی جذبہ اور انسان دوستی قرار دیا جاسکتا ہے۔
ان شخصیات میں کوئی نہ کوئی منفرد بات تھی جس نے انہیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم بچپن سے بڑھاپے تک بہت سے لوگوں سے ملتے ہیں اور ان کے بارے میں سنتے ہیں جو عام لوگوں سے کئی لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں ...... میں نے ایسے ہی اشخاص کے خاکے تحریر کیے میرے نزدیک یہ لوگ اس قابل تھے کہ ان کے کرداروں کو تحریر میں مقید کرلیا جائے"(۸)

جمیل زبیری نے خاکوں میں ذاتی وابستگی اور تعلقات کو پیش نظر رکھا ہے ہر شخص کی فطرت، عادت، کردار کو بے کم و کاست پیش کیا ہے جو افراد ان سے جتنے نزدیک تھے اور جس طرح انہیں پرکھا تھا ان کو ان ہی خصوصیات کے ساتھ پیش کردیا۔

زبیری صاحب کے خاکوں کا مزاج واقعاتی ہے واقعات کے ذریعے شخصیت کی سیرت کشی کی ہے انہوں نے تمام موضوعات کو خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ان کے موضوع اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ قاری کو جیتے جاگتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ واقعی سچے واقعہ نگار ہیں۔

جمیل زبیری کے خاکوں کی ایک جدت یہ بھی ہے کہ وہ جس منتخب شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں تو اس سے تعلق رکھنے والی دیگر شخصیات سے بھی تعارف کراتے ہیں۔ اس طرح اگر ہم انفرادی طور پر جمیل زبیری کے ہر خاکے کا جائزہ لیں تو مرکزی شخصیت کے علاوہ متعدد ضمنی شخصیات بھی اپنی خوبیوں، خامیوں، عمل رد عمل کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ جمیل زبیری نہ صرف قوی حافظہ رکھتے ہیں بلکہ کثرت مواد کا شکار بھی نظر آتے ہیں کثرت مواد کا شکار ہونا اس وقت برا نہیں ہوتا جب وہ معلومات کو سلیقے سے پیش کرنا جانتے ہوں چنانچہ جمیل زبیری شخصیات سے متعلق معلومات کو نہ صرف سلیقے سے پیش کرتے ہیں بلکہ اس سے اچھے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔ ناچیز راقم کا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا اسلوب ہے اور ہم بیک وقت کئی شخصیات سے متعارف ہوتے ہیں مثلاً صدیق مارہروی کے خاکے میں مرکزی شخصیت کے علاوہ ان کے دوست ڈاکٹر محبوب کا احوال اور مولوی برکت صاحب کے خاکے میں پروفیسر حامد حسن

قادری قابل ذکر ہیں۔

جمیل زبیری نے ہر خاکے میں شخصیت کے متعلق تاثر کو ایک تنظیم اور ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس کے باعث قاری پر شخصیات کا تاثر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ اور وہ تحریر سے مکمل لطف اٹھا کر اپنے ذوق کی تسکین پاتا ہے خاکے میں منظر نگاری بھی بہت اہمیت رکھتی ہے اگر منظر نگاری میں حقیقی رنگ ہو تو اس خاکے کا تاثر قاری پر مدتوں رہتا ہے۔ جمیل زبیری نے بھی خاکوں میں جہاں منظر نگاری کی بغیر کسی تصنع و بناوٹ کے حقیقی پس منظر پیش کیے مثال کے طور پر صدیق مارہروی کی رہائش اور حسینہ بیگم کے گھر کا نقشہ جس نے خاکے میں ایسا تاثر ابھرا ہے کہ وہ مدتوں قاری کو یاد رہے گا۔

زبیری صاحب نے جتنے بھی اشخاص کو موضوع بنایا وہ سب ہمارے معاشرہ تہذیب وثقافت کے آئینہ دار ہیں بلکہ راقم ناچیز کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں رفتار حیات کا جو پہلو سب سے نمایاں ہو کر آئے گا وہ تہذیب وثقافت کا مطالعہ ہی ہوگا کیوں کہ ان خاکوں کے ذریعے موضوع خاکہ کی اخلاقیات، مذہبی وسماجی اور معاشرتی رویوں کے بارے میں خیالات کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

جمیل زبیری کے اسلوب میں معصومیت پائی جاتی ہے اسلوب بیان، انداز تحریر میں سادگی سلاست، بے تکلفی پائی جاتی ہے زبان و بیان سادہ، دلکش تصنع و بناوٹ سے پاک ہے شخصیا سے متعلق تاثرات کو نہایت سادہ مگر متاثر کن انداز میں قلم بند کرتے ہیں لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خاکے کسی خاص طبقے یا اعلیٰ ذہن رکھنے والوں کے نہیں بلکہ ہر کوئی ان سے اپنے ذوق کی تسکین کر سکتا ہے۔ ظفر عمر 'رفتار حیات' کے دیباچے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "رفتار حیات میں ہستیاں ان کی سادہ مگر پرکار تحریر میں بالکل جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہیں اور یہی اس کتاب کا حاصل ہے"(۹)

مجموعی طور پر رفتار حیات ایک قابل ذکر اور قابل قدر خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے ہیں انداز بیان سادہ مگر پرکار ہے مصنف کی شخصیت سے ذاتی واقفیت، تہذیبی، ثقافتی وسماجی پس منظر کے ساتھ واضح نظر آتی ہے۔ ان خاکوں میں ذاتی تعصبات و

تاثرات شخصیات کی دھوپ چھاؤں پر غالب نہیں آنے پائی اس کتاب کو اردو خاکوں میں بہترین اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ

۱۔ جمیل زبیری 'رفتار حیات'، کراچی مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲، ص ۱۲

۲۔ 'جمیل زبیری' خاکہ 'بادشاہ میاں' مشمولہ 'رفتار حیات' کراچی ص ۲۲

۳۔ جمیل زبیری، خاکہ 'برکت علی' مشمولہ رفتار حیات، ص ۳۸

۴۔ جمیل زبیری، خاکہ طاہر شاہ، رفتار حیات، ص ۶۱

۵۔ جمیل زبیری، خاکہ ناصر جہاں، رفتار حیات، ص ۷۲

۶۔ جمیل زبیری، خاکہ حسینہ بیگم، رفتار حیات، ص ۹۵

۷۔ مظفر عمر 'دیباچہ 'رفتار حیات'

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

(۱) ''کیا خاک آتش عشق نے'' (۲) ''اسباب لٹا راہ میں''

(۳) ''چمن سرور کا جل گیا'' (۴) ''بہت کام رفو کا نکلا''

چار دلچسپ اور پرتاثر ناولٹ کا مجموعہ

''درد کی پازیب''

مصنف: رئیس فاطمہ

رابطہ: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

021-3263315 - 32639581

پروفیسر عزیز جبران انصاری

آزاد رشیدی اور ان کی خاکہ نگاری

برادرم آزاد رشیدی گذشتہ تیس برسوں سے میدان ادب میں نظم و نثر کے گل بوٹے کھلا رہے تھے "اچھا تو جناب ہیں" ان کا پہلا نثری مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سکھر کے ادبا و شعراء کے خاکے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے بعض ایسے واقف کاروں کے خاکے بھی شامل ہیں جن کا شعر و ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان کی ادب اور انسان دوستی سے آزاد رشیدی بہت متاثر ہوئے ہیں اور ان میں علم و عمل کے جو قابل تقلید جوہر دیکھے ہیں انہیں قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کرسکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ارد گرد ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو اپنی انفرادیت کے سبب جانے پہچانے جاتے ہیں شاید ادبا و شعرا کے خاکوں میں شامل یہ لوگ آپ کو ایسے ہی منفرد اور پیارے لگیں اور آپ بے اختیار پکار اٹھیں:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

"اچھا تو جناب ہیں" میں خاکوں کے علاوہ چند نکاہیے بھی شامل ہیں۔ آزاد رشیدی کا نکاہیے لکھنے کا انداز دوسرے نکاہیہ نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔ اسلوب کی یہ انفرادیت اور ندرت دلچسپ بھی ہے اور دلآویز بھی۔ یقیناً مطالعہ کرتے وقت آزاد رشیدی کا یہ انداز نگارش آپ کو محظوظ بھی کرے گا اور متاثر بھی۔

آپ جانتے ہیں کہ خاکے اور نکاہیے نثری ادب میں سب سے مشکل اصناف ہیں اور ان اصناف کو سلیقے برتنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ مصنف سے اگر ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو بس پھر اس کا کام تمام سمجھو، اختصار و ایجاز کی یہ اصناف اس مصنف کو منہ لگاتی نہیں سکتی، جسے زبان و بیان پر

قدرت حاصل نہ ہو۔ اور جس کا مشاہدہ و مطالعہ محدود ہو۔ ان اصناف سے انصاف اس وقت ممکن ہے جب لکھاری کی عمر عزیز ادب کے دشت کی سیاحی کرتے ہوئے گزری ہو۔ اور جس کی فطرت میں طنز و مزاح کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جہاں ادب میں دیگر اصناف پر تحریر کردہ کتابوں کا ڈھیر دیکھتے ہیں وہاں خاکوں اور فکاہیوں کی کتب کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں اور ان میں کامیاب مصنفین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان چند کامیاب کتب میں اب ایک اور کتاب کا خوشگوار اضافہ آزاد رشیدی نے کیا ہے۔ بلاشبہ آزاد رشیدی اس پل صراط سے کامیاب گزرے ہیں۔ انہوں نے جس شخصیت کا خاکہ اڑایا ہے۔ اسے ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ ہم آزاد رشیدی کے ان خاکوں اور فکاہیوں کو بجا طور پر ادب کی زندہ تحریروں میں شمار کر سکتے ہیں۔

فنی اعتبار سے یہ خاکے اور فکاہیے کیسے ہیں میں ان کے بارے میں اظہار خیال کر کے اپنی رائے آپ پر مسلط کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی نقد و نظر میرا مقصد ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ قاری خود ہی سب سے اچھا ناقد ہوتا ہے لہذا خود ساختہ ناقدین کو خوب صورت تحریروں کے بخیے ادھیڑ کر ان کا حلیہ بگاڑنے کی اجازت دینا زیادتی ہے۔ ہر شخص اپنے مزاج اور میلان کے مطابق نظم و نثر کے شہ پاروں سے لطف اندوز ہونے کا حق رکھتا ہے۔ کسی کو ان کا مزہ کرکرا نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا میں بھی نقد و نظر کی بجائے آپ کو اپنے پیارے دوست آزاد رشیدی سے ملواتا ہوں۔ اگر آپ کو سرراہے کرتا پاجامے میں ملبوس کوئی ایسا شخص دکھائی دے جس کے دونوں بازو کندھوں پر جھولتے اور فضا میں آزادانہ جھولتے ہوئے محسوس ہوں یا کسی محفل میں کسی مسئلے پر بے لاگ اظہار خیال کرتے ہوئے کوئی ایسا شخص دکھائی دے جو ہر دو چار جملوں کے بعد یہ جملہ ادا کرے کہ نہیں سمجھے آپ' تو سمجھ جائیے کہ یقیناً' یہ معروف ادیب، شاعر اور کالم نگار آزاد رشیدی ہے۔ آیئے میں آپ کو آزاد رشیدی سے ملواؤں۔

آزاد رشیدی کا اصل نام سید مصطفٰے حسین بخاری ہے یہ ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہندوستان کے ایک ضلع شاہ جہان پور کے قصبے شہباز نگر میں ایک متوسط زمیندار سید شبیر حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ آزاد رشیدی کے بڑے تایا سید ایوب احمد صبر یوپی کے نامور ادیب اور تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے۔ تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا زیادہ تر وقت کانپور میں حسرت موہانی کے ساتھ گزرا۔

لیکن آزاد کے والد کی تمام عمر شہباز نگر میں زمینداری کرتے گزری۔ آزاد رشیدی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی لیکن میٹرک شاہجہانپور کے اسلامیہ ہائی اسکول سے کیا۔ انہی دنوں آزاد کے والد کا انتقال ہو گیا اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور گاؤں واپس آ گئے۔ اس وقت آزاد کی عمر صرف تیرہ سال تھی اس لیے زمینداری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا ان کے پھوپھا نے زمین بٹوائی پر دے دی اور آزاد کو ایک معقول رقم ہر ماہ ملنے لگی اس زمانے میں ان کے مشاغل بھی عام زمینداروں کے بچوں جیسے تھے طبیعت میں حد درجہ خودسری اور تندی و تیزی تھی۔ معمولی معمولی بات پر اپنے ہم عصروں سے لڑنا جھگڑنا ان کا معمول تھا اور ان کی ناز برداری کے لیے والدہ کے علاوہ پھوپھا اور پھوپھی بھی موجود تھیں اس زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ خودسر و مغرور مصطفےٰ حسین ایک دن ممتاز شاعر، ادیب اور کالم نگار آزاد رشیدی بن کر آسمان ادب پر جگمگائے گا۔ حالانکہ اس زمانے میں بھی ان کے اسکول کے ہم جماعت رباب رشیدی اور فصیح اکمل شاہجہانپور میں ممتاز نوجوان شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، اور ان دونوں نے آزاد کو بھی اس جانب راغب کرنے کی کوشش کی لیکن آزاد نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ شاعری کر کے بزدل نہیں بننا چاہتا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انہیں دنوں گاؤں میں وبائی مرض پھیلا جس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ آزاد کے شفیق پھوپھی بھی جنت مکانی ہو گئیں اس سانحہ نے آزاد کو دیوانہ بنا دیا اور کافی عرصہ تک ویرانوں کی خاک چھانتا رہا۔ اسی دوران آزاد کی زندگی ایک اور انقلاب سے دوچار ہوئی۔ اچانک اس آشفتہ سری کے دور میں ایک ہستی آزاد سے ٹکرائی۔ وہ سراپا محبت تھی، اس نے خزاں رسیدہ آزاد کو بہاروں سے ہمکنار کیا۔ اگرچہ اس کی آمد بہار کا ایک جھونکا ثابت ہوئی لیکن اس کی مختصر رفاقت اور پھر جدائی کے درد نے آزاد کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ وہی آزاد جس کا بیشتر وقت لڑائی جھگڑوں میں گزرتا تھا ایسا رقیق القلب ہوا کہ دوسروں کے معمولی درد و غم پر بھی بے اختیار رو پڑتا، آزاد رشیدی کی ویران زندگی کو جس ہستی نے رعنائیاں بخشی تھیں اسے اس نے خود ہی دوستی کی نذر کر دیا۔ آزاد کے ساتھ بالکل فلموں والا واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ آزاد کے ایک بہت ہی عزیز دوست کو اس لڑکی سے دیوانگی کی حد تک محبت ہو گئی۔ جس سے آزاد محبت کرتا تھا اور پھر ستم یہ ہوا کہ اس دوست نے نادانستگی میں آزاد ہی سے اپنی محبت کی تکمیل چاہی اور پھر آزاد نے دوستی کا بھرم

رکھتے ہوئے اپنے حصے کی تمام خوشیاں دوست کی جھولی میں ڈال کر خود ہمیشہ کے لیے غموں کو اپنالیا۔ اس جاں گسل حادثے ہی نے آزاد کو شاعر بنادیا۔ غم جب شدید ہو تو شعر کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوا۔

کہوں کیا کب مجھے تاب بیاں ہے
عجب پُر درد میری داستاں ہے

جب یہ شعر آزاد کے دوستوں رباب رشیدی اور فصیح اکمل نے سنا تو پھڑک اٹھے اور آزاد کو اپنے استاد حضرت رشید رامپوری سے ملوایا۔ رشید رامپوری اس وقت کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ آزاد کو اپنے استاد سے بہت کم فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آزاد رشیدی نے استاد کے انتقال کے بعد شاعری ترک کردی اور پھر افسانہ نگاری کی طرف توجہ دی اور آسی رام نگری کے شاگرد ہوگئے۔ تقسیم پاکستان کے بعد پاکستان آگئے۔

آزاد رشیدی سے ہماری پہلی ملاقات ادب کے حوالے سے ہی ہوئی تھی یہ غالباً ۱۹۶۶ء کا زمانہ تھا۔ میں اپنی بیٹھک میں اپنے عزیز دوست امتیاز راہی کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا میں نے سر جھکائے ہوئے ہی سلام کا جواب دیا اور کھیل میں مصروف رہا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا کہ میں کراچی سے آیا ہوں مجھے حبیب سرحدی نے بھیجا ہے اور میں عزیز جبران صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حبیب سرحدی کا نام سن کر میں چونکا اور سر اٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے ایک خوب صورت نوجوان شکن آلود کرتا پاجامے میں ملبوس کھڑا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حبیب سرحدی کی خیریت دریافت کی۔ حبیب صاحب کے بارے میں بتانے کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں یہ جان کر بہت خوش ہوا کہ یہ شاعر و ادیب آزاد رشیدی ہیں۔ غائبانہ تعارف تو حبیب سرحدی کے نیم ادبی و فلمی رسالے گل رخ کے توسط سے تھا ہی یعنی ہم دونوں گل رخ کے قلم کار تھے۔ لہٰذا اس ملاقات سے دلی مسرت ہوئی۔ آزاد رشیدی نے بتایا کہ یہیں سکھر میں ان کے ماموں رہتے ہیں اور اب وہ مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کریں گے۔

آزاد رشیدی نے باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ ان کا تعلق یوپی کے ضلع شاہجہانپور کے ایک

قصبے شہباز نگر سے ہے چوں کہ میرا تعلق بھی شاہجہانپور کے ایک قصبے (اسلام نگر) سے تھا اس لیے فطری طور پر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ ادبی مشاغل اور دلچسپیوں کی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو اور زیادہ قریب کر دیا اور پھر باقاعدہ بلا ناغہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

آزاد رشیدی نے بتایا کہ استاد رشید رام پوری کے انتقال کے بعد انہوں نے شاعری ترک کر دی ہے لیکن استاد سے عقیدت اور محبت کی شدت کی وجہ سے تخلص کے ساتھ رشیدی نسبتی کر لیا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دوبارہ شاعری کی طرف راغب ہو جائیں اور عین ممکن تھا کہ دوبارہ شعر کہنے لگتے لیکن بدقسمتی سے ان کے ماموں نے ان کی سادگی اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اسپیئر پارٹس کی دکان میں اس بری طرح جھونک دیا کہ سر کھجانے تک کی بھی فرصت نہ مل سکی اور میرا رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ ہفتے دو ہفتے میں ملاقات ہوتی تھی یا کبھی کبھی کوئی مختصر سا افسانہ گل رخ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس طرح چند سال گزر گئے۔ اچانک ایک دن بہت پریشانی کی حالت میں میرے پاس آئے اور کہا کہ اب میں سکھر میں مزید نہیں ٹھہر سکتا اور کراچی جا رہا ہوں۔ مجھے اس خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح یہ یہیں ٹھہر جائیں۔ لیکن اپنے ماموں کی زیادتیوں کی وجہ سے یہ بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ مجبوراً میں نے حبیب سرحدی کے نام ایک خط لکھا کہ آزاد کو کہیں نہ کہیں ملازمت دلا دیں اور انہیں کراچی کے لیے رخصت کیا۔ آزاد کراچی چلے گئے لیکن خط و کتابت باقاعدگی سے جاری رہی۔ یہاں تک کہ دو سال بعد ان کے ماموں انہیں دوبارہ سکھر لے آئے۔ اس مرتبہ قدرے سکون نصیب ہوا تو میں نے انہیں شاعری کی طرف توجہ دینے کے لیے کہا پہلے تو ٹال گئے کہ اب شاعری میرے بس کی بات نہیں ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ میں انہیں کوئی مصرعہ یا غزل دیتا یہ غزل کہتے اور پھر گھنٹوں ہم دونوں اس پر بحث و مباحثہ کرتے۔ اس طرح تھوڑی ہی مدت میں دوبارہ باقاعدہ شاعری کرنے لگے۔

آزاد رشیدی نے نثر و نظم ہی میں گل بوٹے نہیں کھلائے بلکہ سکھر کی ادبی فضاء کو فعال اور خوشگوار بنانے میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔

سکھر میں مشاعروں کا انعقاد ہو یا تنقیدی محافل برپا کرنے کا کام آزاد رشیدی نے واے

بقیہ ص ۴۷ پر

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

مزاح کا ایٹمی سائنسداں

(اسلام آباد میں مقیم ممتاز مزاح گو شاعر انور مسعود کا یہ خاکہ ان کے اعزاز میں کراچی کلب کی جانب سے کچھ عرصے قبل منعقدہ تقریب پذیرائی میں پڑھا گیا۔ تقریب کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب آفتاب احمد خان نے کی تھی)

....

دو ہفتے ہوئے جب حفیظ میمن صاحب نے ہم سے کہا کہ ایک خاکہ لکھنا ہے تو ہم نے ان سے عرض کیا "بھائی جو خود خاکی ہو وہ بھلا دوسرے کا خاکہ کیا لکھے گا؟" تاہم انہوں نے وضاحت کی کہ جس کا خاکہ لکھنا ہے وہ بھی خاکی ہے۔ ہم سمجھے یہ کسی وردی والے کی بات کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کہنے والے تھے کہ اس کام کے لیے ہم قطعاً unworthy ہیں لیکن انہوں نے یقین دلایا کہ اس کا تعلق آپ ہی کی برادری سے ہے۔ پھر جب اس ہستی کا نام سامنے آیا تو ہم نے اس "اقربا پروری" کو ایک سعادت سمجھ کر قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ خاکہ حاضر ہے جو اپنی فطرت میں نہ ہلکا ہے نہ بھاری ہے۔

صاحبو، مزاح لکھنا کوئی مذاق نہیں۔ ایک سنجیدہ گو شاعر نے کہا تھا:

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اندازہ لگائیے کہ جب "مصرعِ تر" اتنی مشکل سے جنم لیتا ہے تو "مصرعِ شر" کس طرح برآمد ہوتا ہوگا؟ اور جو اپنی پوری زندگی اسی 'افزائشِ نسل' میں گزار دے اس کے ڈیل ڈول کا اتنا ہی حصہ بچ رہتا ہے جتنا اب مشتاق احمد یوسفی صاحب کا بچا ہے یا انور مسعود صاحب کا رہ گیا ہے۔ حضرت ضمیر جعفری، ضیاء الحق قاسمی (مرحومین) کو Exceptions میں سمجھیے۔

حاضرین کرام! جو کام کسی زمانے میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی نثر کیا کرتی تھی وہی کام دورِ حاضر میں انور مسعود کی شاعری کر رہی ہے۔ وہ تڑپا کر رلاتے تھے، یہ پھڑکا کر رلاتے ہیں۔ وہاں آہ تھی، یہاں واہ ہے۔ ہم نے اکثر مشاعروں میں انور مسعود صاحب کے سامعین کو ہنستے ہنستے روتے دیکھا ہے خاص طور پر اس وقت جب یہ 'بنیوں' کی کلیرنس سیل لگاتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر جب یہ ہانڈی میں ڈالنے کے لیے سبزی کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو فیصلہ خاتون خانہ اپنا ڈیپ فریزر کھول کر دو سیکنڈ میں کر لیتی ہے پروفیسر انور مسعود اُسے بھارت کے ساتھ جامع مذاکرات' کی طرح طول دیتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک سبزی کے محاسن ومفاسد اتنی باریک بینی کے ساتھ ذہن نشین کراتے ہیں کہ محفل میں بیٹھے ہوئے سخن فہم ان کی 'بکن فہمی' کے قائل ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تو گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان سے پیشے کے انتخاب میں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟ یہی ایک عظیم فنکار کا کمال ہے۔

ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ مزاح کے بعض شعراء کو سُن کر اور پڑھ کر راشد الخیری والے آنسو ہی نکلتے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے مزاح اور تخول کے فرق کو مٹا دیا ہے اور تخول بھی ایسا جو ماحول کو مکدر کر دے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعری کا عام معیار زوال پذیر ہے۔ ایک سینئر شاعر ایک روز اپنی غزل لکھ کر فارغ ہوئے اور پانی پینے کے لیے اپنی اسٹڈی سے باہر نکلے۔ واپس لوٹے تو غزل غائب تھی جو بہت تلاش کے باوجود نہ ملی۔ انہوں نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی سے شکوہ کیا "تم اس کا خیال نہیں رکھتیں۔ یقیناً اس کم بخت نے میری غزل چولھے میں ڈال دی ہے"۔ ان کی بیوی نے کہا "خدا کا خوف کریں۔ اتنا سا بچہ آپ کی غزل پڑھ سکتا ہے؟"۔

انور مسعود جیسے گنے چنے باشعور، تعلیم یافتہ اور صاحب بصیرت اہل سخن نے نہ صرف شاعری کا معیار بلند کیا ہے بلکہ شاعروں کی توقیر میں بھی اضافہ کیا ہے ورنہ اس سلسلے میں بھی صورت حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔

ان کا ایک وصف یہ ہے کہ یہ صنف کی قید سے آزاد ہیں۔ ہماری مراد ان کی اپنی صنف سے نہیں بلکہ صنف ادب سے ہے۔ یہ نظم اور نثر دونوں میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں لیکن بحر

ظلمات سے دور رہتے ہیں۔ انھیں بیک وقت کئی زبانوں پر عبور ہے یعنی اردو، پنجابی، فارسی اور انگریزی۔ شاعری ہو یا عام گفتگو، یہ ایک زبان کو دوسری میں، دوسری کو تیسری میں اور تیسری کو چوتھی میں اتنی صفائی کے ساتھ داخل کر دیتے ہیں کہ ایک پانچویں زبان وجود میں آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ قطعہ دیکھئے۔ اس میں ایک پورا مصرع انگریزی کا ٹانک دیا ہے:

"سن کر بات معالج کی
کیوں میں اس پہ کروں رٹ
مجھلی پہ یہ رائے دی
You will have to live with it

اس طرح کہنا چاہیے کہ انھیں پانچ زبانوں پر دسترس ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہو گئی اور اُردو قومی، فارسی میں یہ تدریس کرتے ہیں۔ پنجابی مادری زبان ہے اور پانچویں ان کی اپنی زبان ہے۔ انھیں بولتے اور شعر پڑھتے سن کر ماننا پڑتا ہے کہ انسان واقعی حیوانِ ناطق ہے۔

انور مسعود صاحب کا کلام اس لیے زیادہ پسند کیا جاتا ہے کہ اس میں مزاح کے ساتھ ساتھ message بھی ہے۔ دورِ حاضر کے مصائب و مسائل پر ان کی گہری نظر ہے اور عوامی رجحانات و میلانات کا یہ مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ہم اپنے خاکے کو پروفیسر صاحب کے بہت زیادہ اشعار سے بوجھل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہم نقاد نہیں محض نثار ہیں لیکن message والی بات نوکِ قلم پر آ ہی گئی ہے تو ایک قطعہ پیشِ خدمت ہے کہتے ہیں:

اجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپہ ہے جس کا نام
اس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

انور مسعود کی ایک خوبی ان کی طرزِ ادا ہے۔ آپ ان کا کلام پوری محویت کے ساتھ انھیں دیکھتے ہوئے سنیں تو قائل ہو جائیں گے کہ شاعری ایک performing art بھی ہے۔ یوسفی

صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ گانے والی کی صورت اچھی ہو تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ انور مسعود صاحب کا شعر بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ صورت بھی ایسی ہے کہ .....کھنڈر یہ کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی لیکن جب ان کے شعر میں ان کی آنکھوں کی چمک شامل ہو جاتی ہے تو وہ دو دھاری تلوار بن جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے اسٹیج پر ان کے پیچھے بیٹھ کر ان کا کلام سنا اور پنجابی کا کوئی مشکل لفظ پلے نہیں پڑا۔ لیکن جب وہ شعر کسی دوسری نشست میں ان کی آنکھوں کی زبانی سنا تو وہی لفظ پکار اٹھا 'باؤ جی، ہنڑ دسو!'۔

انور مسعود صاحب مشاعروں میں اپنا پرانا کلام تو سناتے ہی ہیں، نہ سنائیں تو سامعین انہیں اسٹیج سے نہ اترنے دیں، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ ہر بار کچھ نہ کچھ نیا مال بھی لاتے ہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "مزاح کی نمو تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں"۔ بدقسمتی سے بیشتر شعراء نے برسوں سے کچھ نہیں لکھا اور وہ اپنی antiques کی رائلٹی کھا رہے ہیں۔ بے چارے نثر نگار کو ہر بار ایک نئی تحریر کی مشقت جھیلنی پڑتی ہے جب کہ شاعر بلا تکلف اپنا ٹیپ rewind کر دیتا ہے اور یہ روایت بہت قدیم ہے چنانچہ علی گڑھ کالج کے ایک مشاعرے میں جب اسی سالہ رعشہ زدہ نوح ناروی نے اپنی پچاس سال پرانی غزل کا مطلع پڑھا:

نکلنے کو تو حسرت وصل کی اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنا چاہیے ویسی نہیں نکلی

تو آگے بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا "حضور، بخدا اس میں نازنین کا کوئی قصور نہ تھا"۔ یہ سن کر ظریف جبلپوری تیزی سے مائک پر آئے اور یہ شعر پڑھا:

سحر تک ان سے جھگڑا ہی رہا حسرت نکلنے کا
وہ کہتے تھے کہ ہاں نکلی؟ میں کہتا تھا نہیں نکلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج انور مسعود مزاحیہ شاعری کی آبرو ہیں۔ انہیں مزاح کا عبدالقدیر خان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ اسی اسٹیج سے ادبی دھماکے کر رہے ہوں گے جس کے لیے تمام حالات سازگار ہیں۔ حتیٰ کہ میریٹ اور شیرٹن ہوٹل بھی قریب ہیں۔ ان کے کچھ دیگر ساتھی بھی میزائل بردار بیٹھے ہیں۔ اب یہاں دما دم مست قلندر ہوگا۔ ہم کراچی کلب کی لائبریری و ادبی کمیٹی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں جس نے ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر کے اعزاز میں یہ تقریب منعقد کر کے ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کی تحسین کے لیے اس کا مرحوم و مغفور ہونا ضروری نہیں۔

محیط اسماعیل

حسرت حسین حسرت

ان کے اندر اور باہر خیر ہی خیر ہے

ساری عمر پی آر گزاری

(تحیطیہ املا)

حسرت حسین حسرت نعت، غزل اور قومی نظموں کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ بچپن سے ہی بزرگ چلے آرہے ہیں۔ ان کے چلنے کی رفتار بتاتی ہے کہ بہ بہار سے بچپن ہی میں پاکستان کی طرف چل پڑے تھے......

پاکستان کے ایک ہی احسان پر آج تک خوش ہیں کہ یہاں ان کو احسان دانش ایسا استاد مل گیا۔ اللہ اور رسول ﷺ کے بعد ان کی زبان پر جس محترم ہستی کا نام آتا ہے وہ احسان دانش ہے......

بزرگ اور پختہ گو ہونے کے ناتے جب کوئی کلام سنانے کی فرمائش کر دے تو اپنے استاد کا شعر سنائیں گے تاکہ جب تک حسرت صاحب حیات ہیں احسان دانش کی روح کو ثواب پہنچتا رہے......

منحنی بل کر نھی منی جامنی رنگ کی صحت، جام کے مقابلے میں جامن ایسا ہی قد، قومی لباس پر مظلوی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیشہ موتی جیسے دانتوں کی طرح سفید قمیص اور کھلا پاجامہ جواب بالوں کی رنگت سے بھی ہم آہنگ ہے زیب تن کرتے ہیں......

دور کے مشاعرے میں بھی جانا ہو تو سادہ کھلے چپل استعمال کرتے ہیں جیسے گھر کے آنگن تک کا سفر ہو۔ کسی کے اچھے شعر پر بچوں کی طرح خوش ہو کر داد پر داد دیتے ہیں۔ بالخصوص نوجوان شعراء کی حوصلہ افزائی میں اس قدر زور لگا کر داد سے نوازتے ہیں کہ آنکھیں نم اور زلفیں

برہم ہو جاتی ہیں، زلفوں سے زیادہ اُن کے ادبی ہم زلف برہم ہو جاتے ہیں۔

مشاعرے میں اکثر دوست انھیں گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں، مقررہ دنوں میں جو پہلے لینے آ جائے اس کے ساتھ اپنی کائنات یعنی بیاض بغل میں دابے چل پڑتے ہیں......

سامعین میں بیٹھے سکون محسوس کرتے ہیں جب کہ حادثاتی طور پر کوئی صدارت سونپ دے تو پہلے انکار و تکلف کریں گے پھر اختتام تک کرسی صدارت پر ایک بیمار افریقی دلھن کی طرح شرمائے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں......

انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تعلیمی خدمات میں گزارا ہے۔ گھوم پھر کر ٹیوشن پڑھاتے ہیں، بائیسکل ان کے لیے جیون ساتھی نمبر دو ہے جس نے ان کی صحت کو اپنی صحت سے قطعاً بڑھنے نہیں دیا۔

موسم اچھا ہو یا خراب بائیسکل پر جناب بردم مست قلندر کی طرح بل کر ایک مصرع طرح وضع کر لینے کے بعد سفر کا آغاز کرتے ہیں اور منزل پر پہنچتے پہنچتے کچھ شعر کر لیتے ہیں، اسی لیے دوران سفر ادھر ادھر نہیں دیکھتے، کوئی پہچان کر آواز پر آواز دے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تا آنکہ پکارنے والا تھک ہار کر اپنی راہ لیتا ہے......

ملنے والا سامنے آ جائے تو حسرت صاحب فوراً بائیسکل سے گرتے پڑتے آن واحد میں اتر پڑتے ہیں اور سلام علیک کے بعد ایک ہات سے بائیسکل دوسرے سے ملاقاتی کا ہات تھام لیتے ہیں اور اس درجہ عجز و انکسار سے پیش آتے ہیں کہ ملاقاتی پانی پانی ہو جاتا ہے بہ شرطیکہ اس کے خون میں چلو بھر پانی موجود ہو......

حسرت صاحب نے آج تک غصہ بھی اس لیے نہیں کیا کہ ان کے جسم میں خون بھی اتنا ہی ہے جتنا دوسروں کے خون میں پانی۔

بہت حساس ہیں محکمہ ریلوے میں ملازمت کم اور شرمساری زیادہ محسوس کرتے رہے، کسی کی غیبت کرتے ہیں نہ سننے کی تاب رکھتے ہیں تاہم استاد کی تعریف کے لیے موقع بے موقع بے تاب رہتے ہیں۔ سانس کی شکایت ہے جو سانس استاد کے ذکر سے خالی آئے اس سے شکایت رہتی ہے۔

ہر وقت شدت سے مسکرانے پر سختی سے عمل پیرا رہتے ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے ساری عمر مسکرانے ہی کی مشقت کھینچی ہے......

ان کی ایک سانس کے جلو میں درجن و مسکراہٹ کی شعاعیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ اس خدشے کے تحت کہ کہیں نہ واقع ہو رہی ہو، چہرے کے تاثرات کو خوب نچوڑ نچوڑ کر مکمل اطمینان کے ساتھ مسکان، کی 'کشیدہ کاری' جاری رکھتے ہیں اور یہی انداز وہ اپنی شخصیات پر بھاری رکھتے ہیں......

رہائش تیسری منزل پر رکھی ہے اسی لیے احسان صاحب خود بلانے کبھی ان کے ہاں نہیں پہنچے ورنہ استاد کی ایک آواز پر یہ اوپر ہی سے چھلانگ بھی لگا دیتے......

یہ اپنے دشمن آپ ہیں، اتنے بھولے کہ آغاز ہی میں استاد نے ان کو دو ٹوک (دو حروف) میں بتا دیا تھا کہ ادب میں نام پیدا کرنا ہو تو 'پی آر' کو پکڑے رکھو، حسرت صاحب نے ساری عمر پاکستان ریلوے کی خدمت میں گزار دی یعنی پاکستان ریلوے ہی کو پی آر سمجھتے رہے۔ نتیجہ ظاہر ہے ریلوے نے ایک چھوٹی سی سبز جھنڈی دکھائی تو ادب نے سرخ جھنڈی دکھا دی۔

حسرت صاحب کا سر و سامان (جس میں ان کا سرا اور بیاض شامل ہے) آج تک (ایک بے رونق) احسان دانش سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑا ہوا ہے اب یہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ خود حسرت صاحب اپنے استاد کا پہلا اور آخری اسٹیشن بنے (حسرت ہی حسرت لیے) کھڑے ہیں......

یہاں سے ریل یا مال گاڑی رکے بغیر گزرتی ہے تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اوپر سے گزر گئی ہے۔ اپنی خطرناک بے نیازی کو خیر باد نہیں کہتے باقی ان کی شخصیت میں اندر اور باہر سب خیر ہی خیر ہے۔

علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ

نوادر

مدیرہ بیگم شاہین زیدی

266-E-1،ST/No-8 پوسٹ آفس ٹاؤن شپ واپڈا ٹاؤن لاہور

سہیل اختر

علامہ زماں محشر ترمذی

جب ہمارے وسیلے سے ہمارے احباب بھی علامہ زماں کی چٹ پٹی اور مسالے دار صحبتوں سے محظوظ ہو چکے تو ایک روز انہوں نے ہمیں تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''یا حضرت! آپ کا بھی جواب نہیں۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا اور اس صدی کی سب سے بڑی دریافت کا سہرا آپ کے سر ہے''۔

''کون سی دریافت؟'' ہم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''علامہ زماں'' انہوں نے بے ساختہ جواب دیا۔

اور پھر ہم نے سوچا کہ جب اتنی بڑی دریافت کا سہرا ہمارے سر بندھ ہی چکا ہے تو کیوں نہ اس عظیم دریافت پر مزید اور شدید ریسرچ کی جائے اور ابنائے وطن نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ اس دلچسپ اور عجوبہ روزگار شخصیت سے متعارف ہونے کا مزانہ چکھیں۔ تو صاحبو! ہماری افلاطونی قسم کی ریسرچ کا ماحصل اس حشر خیز کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

ہم ان شگفتہ مزاج رائے دہندگان کے بھی ممنون ہیں (الیکشنوں کے رائے دہندگان نہیں کیونکہ وہ کبھی بھی شگفتہ مزاج نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ہمیشہ مرنے مارنے پر تلے رہتے ہیں) جن کی دلچسپ رایوں کی پھلجھڑیوں سے یہ کتاب جگمگ کر رہی ہے اور ان ستم طراز احباب کے بھی جنہوں نے خندہ زیر لب کے ساتھ اپنے مشوروں کے پناخوں سے اس تصنیف لطیف کو محشرستان بنادیا ہے۔ ہم علامہ زماں کے تو ممنون احساں ہیں ہی جنہوں نے از راہ تلطف ہمیں اپنی ذات وصفات کے گہرے اور چھپے ہوئے گوشوں میں جھانکنے اور اپنے ذہن کے گلشن سے قہقہوں اور مسکراہٹوں کو گلہائے رنگارنگ حاصل کرنے اور اس روتی اور منہ بسورتی دنیا کے دامن میں بھرنے کے سنہری اور نایاب مواقع بخشے۔

اس کتاب جانفزا کی تکمیل میں ہمیں کیسے کیسے جانگداز مرحلوں سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ وہ مزاح نگار ہرگز نہیں کر سکتے جنہوں نے اپنی کتابوں کے جعلی اور خیالی کردار گھڑے یا یوں کہیے کہ تخلیق کیے ہیں۔ انہیں تو بڑی آسانی اور سہولت حاصل تھی۔ وہ اپنے ان کرداروں کی خیالی بوالعجبیوں کے بارے میں کسی رکاوٹ اور مشکل کے بغیر لکھتے چلے گئے۔ وہ بے چارے کردار نہ تو احتجاج ہی کر سکتے تھے اور نہ اپنے خالقوں کو گھور ہی سکتے تھے، انہیں ڈانٹنا تو دور کی بات ٹھہری۔ یہ بجا کہ محترم محمد خالد اختر نے ہماری ہی طرح اپنے شہر کی ایک چلتی پھرتی زندہ شخصیت کو تاکا اور پھر اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے اس کے مزاحیہ کارناموں کا تانا بانا بنا اور اسے چچا عبدالباقی بنا ڈالا۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ چچا عبدالباقی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ انہوں نے چچا موصوف سے اس قسم کا کوئی مشورہ نہیں لیا ہوگا کہ:

میں جذبہ دل کے بارے میں اک مشورہ تم سے لیتا ہوں
اس وقت مجھے کیا لازم ہے جب تم پر مرا دل آ جائے

بلکہ اس بے چارے کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ اس پر کسی قسم کی مشق ناز کی جا رہی ہے۔ لہذا بہت سے خیالی واقعات خود ہی گھڑ لیے اور ان پر مبالغے کا نمک مرچ لگا کر بلا کسی مشکل کے لکھتے چلے گئے، صرف حسِ مزاح کی ضرورت تھی اور بس۔

لیکن اصل مشکل تو ہمیں درپیش تھی اور جس صورت حال کا ہمیں سامنا کرنا پڑا دوسرے مزاح نگار اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب ہم کنجِ احتقاں کے کسی گوشے میں بیٹھ کر اس کتاب کے سلسلے میں علامہ زماں پر طبع آزمائی کر رہے ہوتے تھے تو وہ دور سے اپنی نشست سے اچھلتے، میزوں کو پھلانگتے، کرسیوں سے الجھتے، گرتے، اٹھتے اور پھر گرتے پھر اٹھتے ہمارے سر پر یوں سوار ہو جاتے جیسے کوئی استاد "پیار نہیں مار، پیار نہیں مار" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈنڈا لے کر کچی جماعت کے کسی طالب علم کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ (علامہ زماں) ہمارے سامنے یوں براجمان ہو جاتے جیسے زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی ضرب المثل صرف انہی کے لیے وجود میں آئی ہو۔ قلم کو سرپٹ دوڑانے کے دوران میں جونہی ہمارے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ سی ابھرتی، موصوف ہمیں گھورنے لگ جاتے۔ پھر وہ ہمیں ڈانٹتے، پھنکارتے، اور غضب ناک ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے

ہوئے ہماری تحریر کو سنسر کرنا شروع کر دیتے۔ بعض اوقات تو ہم دل ہی دل میں کتاب کی تصنیف سے توبہ تائب ہونے کا سوچنے لگتے کیونکہ بقول میر:

گیا جبکہ اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اب آپ ہی بتائیے کہ خیالی کرداروں کے خالق کسی بھی مزاح نگار کو بھی ایسے جبر سے دوچار ہونا پڑا ہے؟ اور پھر اسی پر بس نہیں۔ علامہ محشر ترمذی نے ہمارا خط شکستہ میں لکھا ہوا مسودہ اخلاقاً یا احتیاطاً بلکہ مصلحتاً اپنے دست مبارک سے صاف اور خوشخط کر کے لکھا۔ لیکن مسودہ صاف کرتے بعض اوقات تو ہمارے خیالات اور اظہار وابلاغ پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے۔ اور جہاں قہقہے اچھلنے چاہیے تھے وہاں صرف ہلکی سی اور بے ضرر قسم کی مسکان ہی کی گنجائش نکل سکتی۔ بلکہ بعض اوقات تو علامہ زماں اس مسکان کو بھی کھسیانی ہنسی میں تبدیل کر کے چھوڑتے۔ ایسے عالم میں ہمارے لیے بس ایک ہی گنجائش باقی رہ جاتی تھی کہ ہم اپنا سر پیٹ لیں۔

قارئین با تمکین! اب آپ ہی غور فرمائیں کہ کیا کسی فوجی، کسی میر صاحب، کسی مرزا جی اور کسی چچا چھکن نے اپنے مصنف کا مسودہ اپنے ہاتھ سے صاف کر کے لکھا ہوگا؟ عنقا تو پھر بھی کہیں نہ کہیں ہوتا ہوگا لیکن ان کا تو سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مزاحیہ کردار تخلیق کرنا بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن ہے بڑا محفوظ کارنامہ۔ خیالی کردار کی جانب سے نہ تنقید کا خوف اور نہ خفگی کا اندیشہ۔ جدھر کو دل چاہا ہیڈ منٹن کی چڑیا کی طرح اسے اچھالتے پھرے، بھیگی بلی کی طرح اسے نچوڑنا شروع کر دیا۔ بغیر کسی دغدغے کے اور کامل اطمینان کے ساتھ۔

اب لگے ہاتھوں اس کتاب دلپذیر کی وجہ تسمیہ بھی جان لیجئے کیونکہ کتاب کا نام منتخب کرنے کا مرحلہ بھی بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اگر کوئی سہولت ہے تو بس ہمارے شاعروں کو ہے۔ کیونکہ ان کے شعری مجموعوں کا کوئی بھی تعلق نہ ان کی ذات سے ہوتا ہے، نہ کتاب کی صفات سے۔ بس کوئی اچھوتی سی ترکیب ذہن میں آئی اور وہ کتاب کا نام بن گئی۔ یا کوئی مصرع ذہن میں کچھ زیادہ ہی کلبلانے لگا تو اسے جکڑ باندھ کر کتاب کے سرورق پر بٹھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کتابوں پر 'پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل' یا 'آنکھ کا اندھا نام نین سکھ' جیسی کہاوتیں صادق آتی ہیں۔ اور تنہائی

میں کیبرا کی بجائے کتاب خریدنے والے روتے نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات تو کتابوں کے نام باقاعدہ سیریز کی شکل میں چاند ماری کرتے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ اس طرح بہتی گنگا میں ہاتھ بلکہ منہ دھونا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ ہماری شاعری میں درد ورد کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا تھا اس لیے ہم نے اپنی کتاب کا نام رکھ دیا 'صلیب درد'۔ اس کے فوراً ہی بعد کسی اور شاعر کا مجموعہ 'صلیب غم' مارکیٹ میں آ گیا۔ اور پھر چل سو چل۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے دوسرے شعراء کرام کے مجموعے 'ہر شاخ گل صلیب'، 'صلیب مژگاں'، چہرہ آنکھ صلیبیں، شہر صلیب وگل اور صلیبیں میرے دریچے کی، وغیرہ وغیرہ مطلع ادب پر سوا نیزے کی طرح چمکنے دمکنے لگے۔ اور یوں 'صلیبی' شاعروں کی ایک پوری بٹالین قریہ قریہ شہر شہر لفٹ رائٹ کرتی نظر آنے لگی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی زیر تصنیف کتاب کا نام رکھنے کی۔ خیال تھا کہ کوئی اچھا سا نام ذہن میں آ جائے...... ہمارے اور علامہ صاحب کے حسب حال...... ورنہ قارئین کہیں اس کتاب اور مصنف پر ہی نام نہ دھرنے لگ جائیں۔ علامہ زماں کے گوناگوں اوصاف عجیبہ وغریبہ کو مد نظر رکھتے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا اور بہت سر کھپایا، ذہن میں جلتے بجھتے جگنو چمکیں سی کرتے رہے لیکن کوئی ضیا پاش آفتاب نہیں ابھرا۔ آخر مجبوراً ہمیں احباب کی کیبنٹ یا علامہ زمانی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کرنا پڑا۔ اور پھر علامہ زماں محشر ترمذی سمیت تمام اراکین نے حسب توفیق اور حسب استطاعت اپنا اپنا حصہ ڈالا اور دھڑا دھڑ نام تجویز کرنے شروع کر دیے۔ اجلاس کیا تھا جاہل جمہور کے جمعہ بازار کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ چند ناموں کا آپ بھی نظارا کر لیجیے:

عجوبہ روزگار...... افلاطون وقت کے علمی کرشمے...... دنیا کے استاد...... ان کا دعویٰ ہمارا کباڑا...... جام جم کا جواب...... ادب کا عجائب خانہ...... سونے پر سہاگہ...... دنیائے ادب کا تہلکہ...... محشرستان ادب...... ہر فن مولا سے آگے...... ہزار آتشہ......

لیکن ویٹو پاور کا جو مظاہرہ اس کونسل میں دیکھنے میں آیا اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں بھی کسی نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ وہاں تو صرف سپر پاورز ہی کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔ چھوٹی طاقتیں تو صرف خون کے گھونٹ پی پی کر ہی گزارا کرتی ہیں۔ ویٹو کا استعمال میں ازلی اور غیر شائستہ

جمہوریت کے نظارے اسی علامہ زمانی کونسل میں ہمیں نظر آئے۔ جونہی کوئی معزز رکن کوئی نام تجویز کرتا اسے ویٹو کرنے کے لیے درجنوں ہاتھ یوں بلند ہو جاتے جیسے کسی بلوے میں لاٹھیاں کھمبیوں کی طرح اٹھ جاتی ہیں۔ صدر کونسل یعنی استاد دوراں کی تجاویز کو اراکین اور اراکین کی تجاویز کو استاد دوراں ویٹو کر رہے تھے۔ اس پر غل غپاڑہ اور علامہ زماں کے جلالی اور صدارتی تیور مستزاد۔ اتنے میں کسی شریر لیکن معزز رکن (اگر کوئی شریر رکن بھی معزز ہو سکتا ہے) کی آواز ابھری:

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

یہ سننا تھا کہ علامہ زماں اچانک اچھل کر کمرے سے باہر نکلے اور ننگے پاؤں سڑک پر بگٹٹ بھاگنے لگے۔ اراکین نے کوئی دو فرلانگ تک ان کا تعاقب کرنے کے بعد انہیں پکڑا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے: 'مل گیا! مل گیا'

'کیا مل گیا علامہ صاحب؟'

'نام کتاب کا نام...... ہاہا مل گیا'

'کیا نام، کون سا نام؟'

'طرفہ تماشا، ہاہا طرفہ تماشا، واہ واہ طرفہ تماشا'

مشہور سائنس دان ارشمیدس بھی اتنا تیز نہیں بھاگا ہوگا اور پھر ننگے پاؤں اور ننگے بدن بھاگنے میں جو لطیف یا کثیف سا فرق ہے اس کے تو کیا ہی کہنے۔

موصولہ کتب

سہیل غازی پوری سے ملیے مرتبین جمال ضیاء، احمد کمال خاں، شعری وادبی و رفاہی سوسائٹی، کراچی
آج کا بھارت مصنف قاضی محمد اختر جونا گڑھی، نو بہار پبلی کیشنز، کراچی
شہری کہانیاں مترجم ابو الفرح ہمایوں، بزم مزاح کراچی
محبتوں کے سائے شاعر راشد رحیمی، بزم سراج الادب، کراچی
خواجہ رضی حیدر، مرتب ذکی احمد ذکی انشراح فاؤنڈیشن، کراچی
غبار انجم، شاعر عشرت انجم انشراح فاؤنڈیشن، کراچی
آج بھی انتظار ہے، تیرا شاعر عزیز جبران انصاری، قلم کار کلب، پاکستان
لہو لہو اجالا۔ شاعر عزیز جبران انصاری، جبران اشاعت گھر، کراچی
پوپ کہانیاں، مقصود الٰہی شیخ، ملنے کا پتا ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی
(اناؤ۔یوپی)

حسرت موہانی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

حسرت موہانی کا شمار ایسے ہی انسانوں میں ہوتا ہے جو ایوان انسانیت کو ایسی لافانی درخشندگی عطا کر جاتے ہیں کہ صدیوں تک اس کی تابناکیاں خضر راہ بن کر حیات و کائنات کی رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔

حسرت کا پورا نام سید فضل الحسن تھا جو قصبہ موہان، ضلع اناؤ کے ایک باعزت سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلہ نسب ۳۲ واسطوں سے گزر کر حضرت امام علی، موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ سید محمود نیشاپوری بعہد سلطان شمس الدین التمش ہندوستان تشریف لا کر قصبہ موہان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ نیشاپور سے اپنے تعلق کا ذکر حسرت نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:

کیوں نہ ہوں اردو میں ہم حسرتؔ نظیری کی نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاک نیشاپور سے

حسرت کے دادا سید مہر الحسن کی شادی موہان میں اپنے ہی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کی دو اولادیں تھیں ایک لڑکا سید ازہر حسن اور ایک لڑکی منصور النساء۔ حسرت کے والد سید ازہر حسن کی اہلیہ بھی موہان ہی کی تھیں۔ انہوں نے اپنے میکے میں ہی رہنا پسند کیا تھا مگر حسرت کے والد جنہیں

دادی کی طرف سے فتح پور میں تین گاؤں ملے تھے ان کی دیکھ بھال کے لیے زیادہ تر موضع کھونٹا ضلع فتح پور ہی میں رہتے تھے۔ جائیداد سے معقول آمدنی تھی۔ اس لیے خوشحال اور بے فکر زندگی بسر کرتے تھے۔

حسرت کے سنہ پیدائش کے تعین میں کافی اختلاف آراء ہے۔ ان میں سب سے زیادہ لائق اعتنا روایت سید اکرام الحسن موہانی کی ہے جن کے مطابق ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء حسرت کا سن پیدائش ہے۔ حسرت موہان میں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں ان کا بچپن گزرا۔ ان کی ابتدائی تربیت میں ان کی نانی اور والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جو اردو فارسی کی اچھی استعداد رکھتی تھیں۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ سب ہی افراد خانہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے جس کی حسرت کی زندگی پر گہری چھاپ تھی۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم موہان میں سید اختر موہانی کے دادا سید غلام علی کے مکتب میں ہوئی تھی۔ مکتبی تعلیم کے بعد حسرت موہان کے سرکاری مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور یہاں سے انہوں نے اردو مڈل کا امتحان اس اعزاز سے پاس کیا کہ پورے صوبے میں اول رہے۔ چونکہ اس زمانے میں آئندہ تعلیم کے لیے کوئی اسکول نہیں تھا حسرت اپنے والد کے پاس فتح پور چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے انٹرنس کا امتحان بھی درجہ اول میں پاس کیا۔ ان کی یہ ہونہاری دیکھ کر ڈاکٹر ضیاء الدین نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بلالیا۔ جہاں سے انہوں نے بی اے کا امتحان ریاضی اور عربی سے اختیاری مضامین لے کر پاس کیا۔ حسرت وکالت بھی پڑھنا چاہتے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔

حسرت کی شخصیت کی تشکیل میں علی گڑھ کالج کے دور کا نمایاں حصہ ہے۔ جہاں جلد ہی ان کا شمار ممتاز طلباء میں ہونے لگا تھا۔ بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری 'کالج کے جتنے اعزاز تھے وہ سب حسرت کو حاصل تھے، جہاں انہوں نے ہر موقع پر اپنی دیانت اور بے لاگ فرض شناسی کا ہمیشہ ثبوت دیا۔ جس کے بھی معترف و مداح تھے'۔

علی گڑھ کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی میں حسرت کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بنیاد پڑی۔ یہیں ان کی حق گوئی و بے باکی اور حریت پسندی کو برسر عام ظاہر ہونے کا موقع ملا۔

حسرت فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔ انہیں شعر گوئی ورثہ میں تو نہیں ملی تھی لیکن ان کے

گھرانے کی ادبی فضاؤں اور انکے استاد پنڈت نرائن کی رہنمائی نے ان کے فطری ذوق وشعور کو ابھارنے کے مواقع فراہم کیے۔ حسرت کے دیوان اول ضمیمہ الف کی پہلی غزل حسرت کی پہلی غزل ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ قیام موہان کے دوران حسرت نے اپنا کلام شروع میں سید فخر الحسن فطرت موہانی کو دکھایا تھا (بحوالہ اردوئے معلی اگست ۱۹۰۳ء) مگر ان کے مرتبے کے شاعر کے لیے ایک اعلیٰ پایہ استاد کی ضرورت تھی۔ حسرت شروع ہی سے نسیم دہلوی کی شاعرانہ عظمتوں سے متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے نسیم کے شاگرد امیر اللہ تسلیم سے اصلاح لینے کا فیصلہ کیا اور ان کے سلسلہ تلمذ میں شامل ہوئے۔ یہ واقعہ کس سن کا ہے اس کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ حسرت کے کلیات اول میں جس غزل میں تسلیم کا ذکر ہے وہ ۱۹۰۱ء میں رام پور میں کہی ہوئی غزل ہے۔

پیرو تسلیم ہوں شیدائے انداز نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعار حسرت خیز کا

حسرت اپنی سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں تین بار جیل گئے۔ پہلی بار ۱۹۰۸ء میں دوسری مرتبہ ۱۹۱۶ء میں اور تیسری بار ۱۹۲۲ء میں اور کل ملا کر تقریباً چھ سال قید فرنگ کی سختیاں برداشت کیں۔ تیسری بار ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء کو رہائی پانے کے بعد پھر کبھی وہ گرفتار نہیں ہوئے۔

حسرت کا نصف سے زیادہ کلام ان کے زمانہ جیل کا ہے۔ جیل کی بے کیف زندگی کو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ گوارا بنانے کی کوشش کی۔ جس کا اندازہ ان کے شعر سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ جمال رخ جاناں کے تصور سے زنداں کو بھی گلستاں بنا لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

روح کو محو جمال رخ جاناں کرلیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں

اگر بہ نظر غائر دیکھیں تو حسرت کی شاعری کا بنیادی محور یہ یادیں ہی ہیں۔ ان کی شاعری تحت الشعوری باز آفرینی کا نتیجہ ہے۔ راقم کے تجزیہ کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے جب ان کا جیل جانا بند ہوا اسی وقت سے ان کی شاعری مائل بہ انحطاط ہو گئی۔ اس سے قبل کی شاعری ایسی ہے کہ جس کی بدولت حسرت کا نام زندہ ہے اور اس کی بعد کی شاعری حسرت کی وجہ

سے زندہ ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

تجھ سے ملا وہ شوق سے اور تو نے نہ جانا
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانہ

حسرت کو جب رخ جاناں کی یاد ستاتی ہے تو ان کو گیسوئے یار کی خوشبو اور پیرہن محبوب کی رنگینیاں یاد آجاتی ہیں مثلاً:

شوق مخمور ہوس ہونے لگا
نکہت گیسوئے یار آنے لگی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی

حسرت کے لہجے کی انفرادیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ان کی غزل کے دو چار اشعار سننے کے بعد صاحب ذوق ونظر کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں رہ جاتا کہ یہ حسرت کی آواز ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی صداقت پر مبنی ہے۔ ان کی آواز میں شیرینی، نرمی لچک، شگفتگی اور بے ساختگی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد "سب سے ممتاز ومنفرد صفت ان کے لہجے کی یہ ہے کہ وہ کبھی بلند و پست نہیں ہوتا" (بحوالہ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد ص ۲۰۷) حسرت نے ایک مقطع

میں اپنی زبان کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے وہ محض شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ اس میں جزوی صداقت بھی ہے۔ حسرت لکھنو کے روز مرہ اور محاورے کی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن شاعری کی زبان، اسلوب، فضا اور لہجے کی بھی پابندی ہوتی ہے۔ یہ تمام عکس حسرت کی شاعری میں موجود ہے۔ حسرت کا اسلوب دہلوی شعراء بالخصوص میر، مصحفی، مومن اور نسیم کے اسلوب سے متاثر ہے۔ حسرت کا شعر ہے:

ہے زبان لکھنو سے رنگ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

حسرت کی شاعری کا مخصوص موضوع سیاست ہے حالانکہ یہ بے معنی سی بات ہے۔ ہر شاعر اپنے جذبات اور احساسات، مشاہدات، اور تجربات کی عکاسی کسی نہ کسی روپ میں اپنے کلام میں کرتا ہے اور یہ مفروضہ اس وقت بھی کالعدم ٹھہرتا ہے جب شعر کی تہہ داریوں میں اتر کر ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، جیسے یہ اشعار:

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسم حسرت کی قید ہے بیکار

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

بقول یوسف حسین خاں 'غزل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی درون بینی پائی جاتی ہے غزل گو جو کچھ کہتا ہے اس میں ڈوب کر کہتا ہے'

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھیے جب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر یہ زیر نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
ازرہِ بغض و عتاب دیکھیے کب تک رہے

حسرت کے اس جذبے کی ترسیل راہ تفہیم میں ہر رکاوٹ سے پرے صاف، سادہ اور آسان میں ہے۔ اسی روشنی میں دو ایک اشعار اور ملاحظہ کیجئے اور ان کے حوصلے کی داد دیجئے۔

کیا سمجھتا ہے اسیرانِ قفس کو صیاد
دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

وہ بار بار سزا جرم عشق کی دیتے
مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

رہتی ہے روز ایک ستم تازہ کی تلاش
بے چین ہے وہ فتنۂ دوراں مرے لیے

پہلی جنگ عظیم تک کا زمانہ حسرت کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ان کے بیان کی شگفتگی، خیال کی شادابی پر اب رجائیت کا گہرا اثر ہے جو کسی عقیدے پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ حسرت کے یہاں یہ وطن دوستی اور سیاسی آزادی سے عبارت ہے۔ وہ تحریک آزادی میں آخری منزل تک ہمارے ساتھ رہے۔ شاعری کو وقتی اور عارض مسائل سے دور رکھا۔ لیکن ان کے

بقیہ ص ۱۶ پر

ڈاکٹر اشرف احمد

جوش ملیح آبادی

لکھنو میں عشرت لکھنوی کی ملاقات دلّی کے ایک پرانے باشندے سے ہوئی۔ دلی کا ذکر آنے پر اس شخص نے ایک سرد آہ بھری اور یہ واقعہ سنایا کہ لڑکپن میں وہ اکثر اس کوچے میں اپنی ایک عزیزہ کے ہاں جایا کرتا تھا، جہاں مومن خاں مومنؔ رہتے تھے۔ اور اس نے گلی میں مومن کو فکرِ سخن کرتے، عالم استغراق میں چہل قدمی کرتے ہوئے بارہا دیکھا تھا۔

عشرت لکھنوی نے یہ واقعہ "صلائے عام" کے مدیر میر ناصر علی کو لکھ بھیجا۔ اس کی اشاعت کے بعد میر صاحب نے مضمون نگار کو پانچ روپے بھیجے۔ مصنف کو یہ رقم قبول کرنے میں تامل ہوا۔ لیکن میر ناصر علی نے جواب دیا کہ یہ مضمون کا معاوضہ نہیں، تحقیق کی داد ہے کہ تم نے تاریخ میں ایک واقعہ محفوظ کر دیا۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے بارے میں آئندہ سطور میں چند اقتباسات صرف صرف ان کا شاہد اور ناصر ہونے کی بنا پر رقم کر رہا ہوں۔ مدیر افکار، صہبا لکھنوی صاحب جوش ملیح آبادی پر ان کی زندگی میں ہی ایک خصوصی شمارہ شائع کر کے زندہ شناسی کی ایک روایت کا آغاز کر چکے تھے۔ جوش نمبر کی اشاعت کو کئی برس گزر چکے تھے۔ صہبا صاحب افکار سے متعلق کسی ادبی تقریب میں جوش صاحب کو مدعو کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جوش صاحب کے ہاں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی اور میں نے جوش صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے شوق کے اظہار میں صہبا صاحب کے ہمراہ جانے کی درخواست کی۔

اس زمانے میں ہفتہ وار تعطیل اتوار کو ہوا کرتی تھی۔ جوش صاحب کا ترقی اردو بورڈ سے علیحدہ کیے جانے کا قصہ تازہ تازہ تھا۔ اس کا پس منظر یہ الزام تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے سفر میں پاکستان اور اس وقت کے حکمران کے بارے میں متنازعہ باتیں کہی تھیں۔ مشہور تھا کہ انہوں

نے اس زمانے کے حکمران کی آمریت کے حوالے سے ملک کو 'مقبرہ' کہا تھا۔ آمریت برحق اور اس کا نزول وقفے وقفے سے ہمارے ملک میں ہوتا رہتا ہے۔ مگر جوش صاحب کو اپنا یہ شکوہ کسی اجنبی ملک خصوصاً بھارت میں تو جا کر بالکل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مقررہ دن جوش صاحب کے ہاں جانے کے لیے پہلے میں صہبا لکھنوی صاحب کے فلیٹ پر پہنچا جو رابسن روڈ پر واقع ان کے رسالے کے دفتر کے قریب ہی تھا۔ جوش صاحب کا مکان، بلکہ کوٹھی، کریم آباد کا پل اترنے کے بعد بائیں جانب واقع تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے سر اٹھا کر بالائی منزل کے اس جھروکے کی طرف دیکھا جہاں سے ایک روایت کے مطابق جوش صاحب روزانہ صبح سویرے طلوع آفتاب کا منظر دیکھا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کا ایک شعر یاد آنا بھی ناگزیر تھا سو یاد آیا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

زینہ طے کر کے ہم اوپر کی منزل پر واقع جوش صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں چوپٹ کھلی تھیں اور تیز ہوا جوش صاحب کے شفاف ململ کے کرتے کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ان کے سامنے پھیلی ہوئی وسیع و عریض میز پر رکھے ہوئے کاغذات اور فائلوں پر پیپر ویٹ کے طور پر پتھر رکھے ہوئے تھے۔ تیز ہوا میں کاغذ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان پتھروں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ انہیں حاصل کرنے میں شاعر انقلاب کو کوئی تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ اپنی طرف آئے ہوئے ان پتھروں کو واپس پھینکنے کے بجائے انہوں نے ان کا ایک بہتر مصرف نکال لیا تھا۔ ایک بڑے آدمی کی عالی ظرفی۔ میں نے سوچا تھا۔

میز کے کنارے ایک کرسی پر جوش صاحب رونق افروز تھے۔ مگر انداز فرشی نشست کا تھا۔ یعنی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اگال دان اٹھا کر پان کی پیک تھوکتے اور پھر ایک نیا پان کھا لیتے۔ کچھ دیر کے لیے موضوع گفتگو ترقی اردو بورڈ سے جوش صاحب کی علیحدگی رہا۔ اس دوران ان کے صاحبزادے سجاد حسن خروش بھی گفتگو میں شریک ہوئے۔ شائستہ لہجہ میں حقی صاحب کا بھی انہوں نے تذکرہ کیا۔ ایک بار مرحوم عیش ٹونکی کا بھی نام جوش صاحب نے لیا۔

اس کے بعد جوش صاحب نے اپنے صاحب زادے کو اس معاملے پر خاموشی اختیار کرنے اور معاف کر دینے کو کہا۔

جوش صاحب کے یہاں اس دن ہم لوگوں کے پہنچنے سے پہلے پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم اور ایک ضعیف العمر شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش صاحب نے یوپی کے روایتی بزرگوں کے مانند مجھ سے یہ پوچھا کہ 'میاں کیا کرتے ہو؟' میں نے انہیں بتایا کہ اردو میں ایم اے کر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا۔ جس کا جواب میں نہ دے سکا تھا۔

جوش صاحب کی محفل میں موجود ان ضعیف العمر شخص نے جو میزبان کے استفسار پر کہ کیسے آنا ہوا، بتایا تھا کہ وہ مولانا اسماعیل میرٹھی کے پڑپوتے ہیں؟ ان کے پڑوس میں رہتے اور بہت دنوں سے آنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

ان کی باتوں پر جوش صاحب مسکرا مسکرا کر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر ان صاحب نے جوش صاحب کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے فرمایا 'بسم اللہ' بعد ازاں ان صاحب نے بتایا تھا کہ جوش صاحب آخری عمر میں صوم وصلوٰۃ کے پابند اور حد درجے کے مذہبی ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی پیشن گوئی کی تھی کہ آخری عمر میں جوش صاحب حج بیت اللہ بھی کریں گے۔

ان باتوں پر جوش صاحب مسکرا کر حیرت واستعجاب کے اظہار کرتے رہے۔ گویا ان سب باتوں کو ناممکنات میں سے سمجھتے ہوں۔ لیکن یہی ہوا آخر عمر میں وہ مذہبی ہو گئے تھے سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ ان کی اس ذہنی تبدیلی کا غماز تھا۔

جس زمانے میں وہ ہندوستان سے واپسی کے بعد وطن عزیز میں اپنی 'باتوں' کی بنا پر مطعون کیے جا رہے تھے تو معروف عالم دین، ممتاز سیاست دان اور ادیب مولانا کوثر نیازی نے اپنے ہفت روزہ 'شہاب' میں انہیں 'ملیح آباد کا چوہا' تحریر فرمایا تھا۔ یہ ہفت روزہ شہاب کے دور اول کا آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد تو ایک طویل عرصے تک 'شہاب' کا ایک نیا عوامی روپ قارئین کے سامنے آیا۔

لیکن مولانا کوثر نیازی صاحب نے جوش صاحب سے اپنے اس 'سلوک' کی تلافی بھی کر دی

تھی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں جب ایک مخصوص مذہبی فکر رکھنے والے حلقے کی جانب سے جوش صاحب کے خلاف کردار کشی کی مہم چلائی گئی تو اس وقت مولانا کوثر نیازی صاحب نے ہی جوش صاحب کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اور یہ بھی سننے میں آیا کہ انہی کوششوں سے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسلام آباد میں جوش صاحب کو پیشرو حکومت کی جانب سے دی جانے والی سہولتوں اور مراعات کو برقرار رکھا۔

فیض صاحب نے جنرل یحییٰ خان کے دور میں جب 'عوامی ادبی انجمن' قائم کی تو بعض اہل قلم کی جانب سے اسے انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا روپ قرار دیا گیا۔ اس انجمن کا منشور اردو کے علاوہ پاکستان کی چاروں قومیتی زبانوں میں شائع ہوا تھا۔

محسن بھوپالی کے بقول اس انجمن کا آئین ابتداً صرف اردو زبان میں تحریر کیا گیا تھا۔ لیکن سندھی زبان کے ممتاز شاعر شیخ ایاز نے صرف اردو میں تحریر شدہ آئین سے انکار کرتے ہوئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ بعد ازاں اس میں اردو کو رابطے کی زبان لکھا گیا تھا۔

عوامی ادبی انجمن کے کچھ کتابچے جن میں رکن سازی کے فارم بھی موجود تھے میں نے بھی بعض ادیبوں میں تقسیم کیے تھے۔ اس انجمن کے قیام کی اطلاع پر انتظار حسین نے روزنامہ مشرق لاہور میں 'ترقی پسندی کا مردہ زندہ ہو گیا' کے عنوان سے ایک دلچسپ کالم لکھا تھا۔ اس کالم کے ایک طرف فیض صاحب کی قد آدم تصویر بھی دی گئی تھی۔

سینئر ادیبوں سے رابطہ قائم کرنے میں عبداللہ ہارون کالج کے وائس پرنسپل اور اس زمانے میں فیض صاحب کے خاص معتمد اور سیاسی ورکر ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان پیش پیش تھے۔ وہ عوامی ادبی انجمن کا منشور لے کر دفتر افکار میں آیا کرتے تھے۔ ایک روز دفتر افکار میں اردو کے 'رابطے کی زبان' اور 'سامراجی زبان' کے طعنے کے حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین اور ڈاکٹر حسان کے درمیان خاصی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ پروفیسر ممتاز حسین نے اس منشور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیض صاحب کی خواہش تھی کہ جوش ملیح آبادی بھی عوامی ادبی انجمن کے منشور پر دستخط کر دیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حسان نے صہبا لکھنوی سے بات کی۔ صہبا صاحب ان کے ساتھ نہیں گئے لیکن بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر حسان جوش صاحب کی خدمت میں پہنچے

تھے۔

ڈاکٹر حسنان مرحوم جوش صاحب سے مل کر بامراد واپس آئے ان کا کہنا تھا کہ اغراض و مقاصد زبانی سن کر بھی جوش صاحب نے منشور پر دستخط کردیئے تھے۔ دفتر افکار میں موجود اہل قلم یہ سن کر دیر تک جوش صاحب کے فضائل ومناقب بیان کرتے رہے۔

جوش صاحب کا کسی ادبی تنظیم کے منشور پر دستخط کرنا ایک غیر معمولی ادبی واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ خبر اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔ لیکن اس خبر کی اشاعت کے ایک آدھ روز کے بعد ہی روزنامہ جنگ کراچی کے آخری صفحے پر جوش صاحب کا ایک تردیدی بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے عوامی ادبی انجمن اور اسکے منشور سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ چند افراد ان کے پاس انجمن کا منشور لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس کے اغراض ومقاصد زبانی سن کر دستخط کر دیئے تھے۔ لیکن انجمن کا طبع شدہ منشور پڑھنے کے بعد وہ اس سے متفق نہیں رہے۔

دراصل جوش صاحب کے بارے میں اس زمانے میں پاکستان کا مطلع ابر آلود تھا۔ اور ویسے بھی میرے خیال میں جو شخص فرزند زمین نہ ہو اس کی کئی نسلوں کو کسی قسم کے سیاسی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

جوش صاحب کے یوں رنگ بدل جانے پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں دو بھائیوں کے نام لیے جاتے رہے جن کا تعلق ایک بڑے اخبار سے تھا۔ بہرحال جوش صاحب کے مداحوں نے اسے جوش صاحب کی سادہ لوحی پر محمول کیا۔

جوش صاحب اپنی شاعری اور نظریات کی بنا پر ہمیشہ محترم رہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ ایک باضابطہ سیاسی دانشور نہ تھے۔ کوئی بھی سیاسی دانشور چاہے ادب کے حوالے سے بات کرے لیکن ایک ڈسپلن کا پابند ہونے کی بنا پر بہت سی پابندیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یوں اس کی حق گوئی مشروط سی ہو جاتی ہے۔ البتہ ایسے دانشوروں کے پس پشت کسی نظریاتی اور سیاسی جماعت کی حمایت ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ اپنے سیاسی عمل اور سیاسی نظریے میں ثابت قدم رہتا ہے۔ جوش صاحب شاید ساری زندگی اس ڈسپلن کے عادی نہ رہے تھے لہٰذا وہ اپنی حق گوئی میں تنہا تھے۔ اور کئی وجوہ سے اس موقع پر ان کا گھبرا جانا فطری نظر آتا ہے۔

شاید وہ بہت سی باتیں بربنائے تفنن بھی کہا کرتے تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی کا ایک جلسہ یاد آ رہا ہے۔ عام طور سے ادیبوں شاعروں کے ساتھ شام منائی جاتی ہے لیکن جوش صاحب کے لیے ایسی ہی ایک تقریب ملاقات کا اہتمام سندھی مسلم سوسائٹی میں واقع گلڈ کے دفتر میں تعطیل کے دن قبل از دوپہر کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے دوران بہت سے نامور افراد نے ان سے مختلف سوال پوچھے تھے۔

ایک سوال پر پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم نے بھی پوچھا تھا کہ 'جوش صاحب آپ خدا کو نہیں مانتے، مذہب کو نہیں جانتے مگر امام حسین کا مرثیہ لکھتے ہیں'۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا 'بڑے بڑے سیٹھوں کے ٹریڈ سیکریٹ ہوتے ہیں۔ یہ میرا بھی ٹریڈ سیکریٹ ہے'۔ اس پر فضا میں قہقہے بلند ہوئے تھے۔ ایسی پہلودار بات جوش صاحب ہی کہہ سکتے تھے۔ اور ایسا بے تکلف سوال مجتبیٰ صاحب ہی جنہیں ان سے قربت بھی تھی کر سکتے تھے۔

بھارت کا وہ سفر جس کے ساتھ جوش صاحب طرح طرح کی بدنامیاں اور دشنام لے کر لوٹے، اس میں ان کے ایک مصاحب عیش ٹونکی مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہندوستان میں تو وہ ان کے ساتھ رہے لیکن وطن واپس پہنچتے ہی انہوں نے جوش کے سینے میں تیر ترازو کرنے کے لیے علیحدگی اختیار کر لی اور جوش دشمناں سے جا ملے۔

جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے جس دن کا تذکرہ ابتدائی صفحات میں کر آیا ہوں اس دن جوش صاحب کی زبان سے یہ متاسفانہ گلہ بھی سننے میں آیا تھا کہ 'عیش (ٹونکی) بھی نہیں آتا'۔ بھلا عیش صاحب کیوں آتے؟ تو وہ سارا منفی مواد یک جا کرنے میں مصروف تھے جو یادوں کی برات کی اشاعت کے بعد ایک ردعمل کی صورت میں پاک و ہند کے ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ عیش ٹونکی صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ 'مواد تو سب یک جا کر لیا ہے مگر آنکھیں خراب ہیں۔ خود نہیں پڑھ سکتا۔ انہیں اس مواد کو یکجا کرنے کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی۔ ان کا فقرہ سن کر میں نے سوچا کیا واقعی جوش صاحب کے سلسلے میں ان کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔

لالو کھیت ڈاک خانے سے ذرا آگے تھانے کے بالکل سامنے کے ایم سی کے ایک بس

اسٹینڈ سے ملحق عیش ٹونکی صاحب کی کولڈ ڈرنک کی دوکان 'پیو جیو' کے نام سے تھی۔ دکان پر انہی کا ایک شعر تحریر تھا۔

پیو جیو کے مشروبات
دل کی ٹھنڈک من کی بات

اسی دوکان کے برابر ایک پولٹری فارم اور اس سے ملحق حبیب بینک ہے۔ جوش صاحب ایک دن اس بینک میں آئے۔ عیش ٹونکی صاحب کو بھی خبر ہوگئی۔ پرانے مراسم یاد آگئے۔ ان سے ضبط نہ ہوسکا، بھاگے بھاگے بینک میں جوش صاحب کے پاس پہنچے۔ جوش صاحب اسی خندہ پیشانی سے ملے۔ پوچھا 'کہاں ہو؟' کہاں غائب ہوگئے؟ پھر ان کی دوکان تک آئے، کچھ دیر بیٹھے۔ یہ باتیں سنانے کے بعد عیش صاحب کہنے لگے 'کچھ کہو جوش ہے بڑا آدمی'۔

بقیہ حسرت موہانی

یقین کی چنگاریاں آتش گل کی طرح دہکتی رہیں۔ حسرت موہانی تحریک آزادی کی تاریخ میں اپنے خلوص، ہمت و حوصلہ کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ تحریک خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد و اشتراک باہمی کی وجہ سے جدوجہد آزادی میں شدت اور وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ حسرت اس زمانے میں اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

قوموں کی ترقی کے ہیں کچھ اور ہی اسباب
جو ڈاک پہ موقوف ہیں نہ تار پہ موقوف
قوت کی جو پوچھو تو یہ ہوتی ہے ہمیشہ
اقوام میں افراد کے ایثار پہ موقوف

حسرت نے ترک موالات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگریس اجلاس میں حسرت نے کامل آزادی کا نصب العین واضح کیا تو سب سے پہلے گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی۔ اسی مخالفت سے بدظن ہو کر حسرت کانگریس سے الگ ہوگئے۔ لیکن تادم آخر حریت کی وہ چنگاری جوان کی روح کو گرما اور قلب کو تڑپا رہی تھی برابر سلگتی رہی۔

تشنہ بریلوی

محفل فیض، منزل فیض

چشم تصور وا کیجیے اور پہنچ جائیے تقریباً ۱۲۰ سال پہلے کے لاہور میں۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے۔ مسافروں کے ہجوم میں آپ کو ایک نوعمر قلی نظر آئے گا جو بڑی پھرتی سے وزن اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ رات یہ نوجوان ایک مسجد کے مسکین خانے میں گزارے گا اور محلے والوں کا بھیجا ہوا کھانا بھی کھائے گا۔ لاہور آنے سے پہلے یہ چھوکرا اپنے گاؤں میں اس سے بھی زیادہ سخت وقت گزارتا تھا لہذا یہاں وہ خاصا خوش ہے۔

اب ذرا دوسری اڑان بھریے۔ ایک بہت ممتاز اور دولت مند شخصیت سے ملیے جو سفارت اور وزارت کے عہدوں پر فائز رہ چکا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کی ایک رشتہ دار خاتون اس کو پسند کرتی ہے جو سر اقبال، سر عبدالقادر اور سر شفیع جیسے اکابرین کا ذاتی دوست ہے اور جس کے محل نما مکان میں پچاس ساٹھ ملازم ہیں۔ موٹر کاروں اور گھوڑا گاڑیوں کی پوری فلیٹ ہے اور جس کے وسیع دسترخوان سے روزانہ درجنوں لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔

جی ہاں یہ دونوں تصویریں ایک ہی انسان کے دو روپ ہیں۔

یہ ہیں سلطان بخش جو بعد میں سلطان محمد خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ ایک نو مسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ چھ پیڑی پہلے ایک راجپوت راجہ سین پال مسلمان ہوا تھا۔

واضح رہے کہ سلطان صاحب نے اپنی قلی گیری پر ہمیشہ فخر کیا فیض صاحب نے بھی اسی وجہ سے محنت کشوں کو اپنا سمجھا اور مزدور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سلطان خاں صاحب خاصے دل پھینک آدمی تھے۔ انہوں نے پانچ شادیاں کیں فیض اور ان کے بھائی بہن سلطان صاحب کی پانچویں بیوی کی اولاد تھے۔

فیض صاحب کی شاعری کا آغاز بھی نہایت دلچسپ طریقے سے ہوا۔ وہ بچپن ہی سے بے

حد ذہین تھے اور کتابیں پڑھنے کے رسیا۔ فیض صاحب کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں صاحب کا ہم جماعت ایک لڑکا جھجو رام بہت شریر تھا سب کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ بڑے بھائی نے فیضؔ سے کہا تمہیں اردو وردو بہت آتی ہے لہذا اس بدمعاش لڑکے کے خلاف ایک نظم لکھ دو فیض صاحب نے فوراً چند اشعار کی ایک ہجو یہ نظم لکھ دی جو سارے اسکول میں مشہور ہوگئی اور جھجو رام سیدھے راستہ پر آ گیا۔ ہم اس شریر لڑکے کا شکریہ ادا کریں گے کہ اس کی وجہ سے فیض شاعری کے گلستان میں داخل ہوئے۔ ۳۰ سال بعد اس جھجو رام سے دلی میں فیض صاحب کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔

اسکول کے زمانے میں فیض صاحب کا مطالعہ زور وشور کے ساتھ جاری رہا۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں انہوں نے زبردست مہارت حاصل کی۔ مشاعروں کا ماحول بھی موجود تھا۔ مرے کالج میں ان کے ایک استاد پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے ہمت افزائی کی۔ جلد ہی فیض صاحب کو صوفی تبسم پطرس بخاری امتیاز علی تاج حفیظ جالندھری اور چراغ حسن حسرت کا قرب بھی حاصل ہوا۔ مگر سب سے زیادہ اثر انہوں نے بے مثل رومانی شاعر اختر شیرانی نے قبول کیا۔ اپنے دوست مجید ملک کے ذریعہ وہ اختر شیرانی کے قریب آئے۔ اور پھر ساری زندگی رومانی شاعر رہے۔ انہوں نے تغزل کا دامن کبھی نہیں چھوڑا حتیٰ کہ جب کومن فارم Cominform کی ہدایات کے تحت ترقی پسند شاعروں کو پابند کیا گیا کہ وہ صرف پارٹی لائن کے مطابق اشعار کہیں تو فیض صاحب نے اس حکم کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے انداز کی شاعری کرتے رہے۔ البتہ تغزل کے ساتھ انسان دوستی بھی ان کے خمیر میں شامل تھی۔ ان کے یہ دونوں عشق ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ انہوں نے کہا۔

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل

یہاں ڈاکٹر رشید جہاں کا ذکر بھی ضروری ہے یہ نامور ترقی پسند خاتون جو 'انگارے' کی اشاعت میں سجاد ظہیر کے ساتھ رہیں۔ علی گڑھ کے پاپا عبداللہ (بانی ویمنز کالج) اور اعلی بی کی دختر تھیں ہندوستان کی ایکٹریس رینو کا دیوی یعنی پاکستانی ٹی وی کی بیگم خورشید مرزا ان کی بہن تھیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر صاحبزادہ محمود الظفر (صاحبزادہ یعقوب علی خاں کے قریبی عزیز) امرتسر کے ایم اے او کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بھی

تھیں اور فیض صاحب ازل کے حسن پرست۔ لہٰذا وہ ترقی پسند اور کمیونسٹ بن گئے اور آخر وقت تک رہے۔ اس کے بعد لاہور میں انجمن نیاز مندان لاہور نے ڈاکٹر تاثیر اور پروفیسر پطرس وغیرہ کی رہنمائی میں فیض صاحب کو اور آگے بڑھایا حتیٰ کہ آپ تیس سال کی عمر میں ایک مستند شاعر بن گئے۔

دوسری جنگ عظیم سے چند سال پہلے انگلستان کے بہت سے کمیونسٹ ہندوستان آئے۔ یہ انگریزوں کی ہوش مندی تھی کہ انہوں نے کمیونزم سے شدید اختلافات کے باوجود ان کے اخبار 'ڈیلی ورکرز' کو کامیاب ہونے دیا اور انگریز کمیونسٹوں کو ہندوستان کا دورہ کرنے پر اکسایا تاکہ ہندوستانی انقلابی بھی انگریزوں ہی کے زیر اثر رہیں۔ معروف اردو اسکالر رالف رسل بھی اس صف میں شامل تھے۔ ڈاکٹر تاثیر کی انگریز بیوی کی چھوٹی بہن ایلیز جارج بھی ایک کمیونسٹ کنواری (Red Virgin) کی حیثیت سے ہندوستان آئیں۔ اور ۱۹۴۱ء میں نوجوان فیض احمد فیض کی بیوی بن گئیں۔ انہوں نے دو بیٹیوں کو جنم دیا۔ ایلیز فیض ایک بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں وہ فرنچ زبان بھی جانتی تھیں اور شاعرہ بھی تھیں۔ انگریز ہونے کے باوجود وہ آزادی ہند کی طرف دار تھیں اور انہوں نے لندن میں پنڈت نہرو کے دست راست کرشنا مینن کے سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے تھے لیکن شادی کے بعد انہوں نے خود کو گھر تک محدود کر لیا۔ بہر حال ایک بڑا امتحان روزا لگزمبرگ (جرمنی کی SPARTACIST تحریک کے بانی) کا حوصلہ رکھنے والی اس خاتون کا منتظر تھا۔

یہاں 'راول پنڈی سازش' کا ذکر ضروری ہے۔ حماقتوں سے لبریز یہ واقعہ پاکستانی جمہوریت اور روشن خیالی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا گیا جس کے نتائج ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ فوجیوں اور سیاست دانوں دونوں نے بے حد غلط کردار ادا کیا۔ میجر جنرل اکبر خان جو اس 'سازش' کے ہیرو تھے اپنی بحث بحثی سے قائد اعظم کو بھی ناراض کر چکے تھے اور کشمیر میں بھی اپنی 'کارستانی' دکھا چکے تھے۔ انہوں نے حکومت کا 'تختہ الٹنے' کے لیے ایک میٹنگ کی جس میں سجاد ظہیر اور فیض دونوں موجود تھے۔ مگر فیصلہ ہوا کہ حکومت کا تختہ نہیں الٹا جائے گا۔ فیض صاحب کو اس میٹنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا اور وہ یقیناً بالکل بے قصور تھے۔ جنرل اکبر کے دشمن جنرل

ایوب کو مخبری کر دی گئی۔ یہی آغاز تھا 'راول پنڈی سازش' کا جس کا سب سے پہلے شکار خود لیاقت علی خاں ہوئے اور آگے چل کر ملک میں فوجی حکومتوں کی راہ ہموار ہوئی۔

فیض صاحب گرفتار ہوئے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر ایلیز فیض اور اپنی بچیوں ۹ سالہ سلیمہ اور ۵ سالہ منیزہ کی تھی۔

ایلیز خود بھی بہت پریشان تھیں۔ مگر اس باہمت اور باوفا خاتون نے اپنے شوہر کا ہاتھ تھام کر جس طرح ان کی ہمت بندھائی اسے میں نے ایک قطعہ کی شکل میں یوں پیش کیا ہے:

ایلیز فیض اپنے شوہر سے کہتی ہیں:

ارباب جفا مشق ستم کرتے رہیں گے
اک حشر بپا اہل حشم کرتے رہیں گے
تم پرورش لوح و قلم کرتے رہو فیض
اور پرورش دختراں ہم کرتے رہیں گے

اور واقعی اس انگریز خاتون نے جس محبت اور جاں فشانی کے ساتھ اپنی بیٹیوں کی پرورش کی وہ ناقابل فراموش ہے۔

فیض نے ساڑھے چار سال پہلی بار اور پھر سال بھر ایوب دور میں جیل میں بسر کیے۔ سختیاں اور ذلت برداشت کی۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں بھی از حد پریشان رہیں۔ پاکستانی قوم کا یہ زخم اسی وقت مندمل ہوگا جب ہماری حکومت اور اسٹیبلشمنٹ اپنا یہ جرم تسلیم کرے۔ فیض احمد فیض (اور دوسرے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں) سے معافی مانگے اور یقین دلائے کہ آئندہ اس قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ برطانیہ نے چیکوسلواکیہ سے معافی مانگی تھی اپنے وزیر اعظم چیمبرلین کے رویہ پر، ہندوستان سے معافی مانگی سانحہ امرتسر کے سلسلے میں، اور امریکی حکومت نے روزا پارکس سے معافی مانگی۔ اس سیاہ فام خاتون نے الاباما کی ایک بس میں اپنی سیٹ ایک سفید فام مرد کے لیے خالی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور امریکہ نے ہی ماریَن اینڈرسن، سیاہ فام سنگر سے معافی مانگی اور اعزازات سے نوازا جسے خود بھی نسلی امتیاز کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پاکستان کے تمام ادیب شاعر، اور دانشور اب پارلیمنٹ اور صدر سے مطالبہ کریں کہ جس طرح فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر

کاشمیری، فارغ بخاری، شیخ ایاز، حبیب جالب، وغیرہ کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا وہ باعث شرم ہے۔ اس اندوہناک روّیہ پر ساری قوم اور مرحومین کی روحوں سے معافی مانگی جائے۔ تاکہ قوم کی ریل گاڑی جمہوریت کی پٹری پر استوار ہو کر اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے فیض احمد فیض کو گرفتار کر کے موت کے قریب کر دیا اور ہندوستان کے چار وزراء اعظم پنڈت نہرو، اندرا گاندھی، نرسمہا راؤ اور اندر کمال گجرال ان کے شیدائی رہے۔

جہاں تک منزل فیض کا تعلق ہے تو فیض صاحب نے آغاز ہی میں کہہ دیا تھا

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض صاحب سے پہلے علامہ اقبال بھی ایک منزل کا تعین کر چکے تھے لیکن ان کی یہ منزل بعد میں مذہبی شدت پسندوں اور طالبان کی ملکیت بن گئی۔ اور برصغیر کے سارے مسلمان اہل پنجاب کے رحم وکرم پر آ گئے۔

فیض صاحب ترقی پسند اور کمیونسٹ تھے۔ بگاڑ اس وقت پیدا ہوا جب قیام پاکستان کو ہندوستانی کمیونسٹوں نے 'عوامی مطالبہ' کے طور پر تسلیم کیا اور سجاد ظہیر کو پاکستان میں اشتراکی انقلاب لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ لمبی کہانی ہے۔

داستان عبرت و حسرت تو ہے بے حد طویل
میں نے لکھ ڈالی ہے کر کے مختصر دیوار پر
(تشنہ)

سجاد ظہیر پاکستانی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے کومن فارم کی ہدایت پر یہاں فرانسیسی انقلاب لانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اکھاڑے میں دو پہلوان اترے تھے۔ بنّے بھائی (سجاد ظہیر) اور دوسرے منّے میاں (ابوالاعلیٰ مودودی) جن کو امریکہ اور پاکستان کے تمام رجعت پسندوں کی حمایت حاصل تھی۔ سجاد ظہیر ہار گئے اور مودودی صاحب اور ان کی جماعت کامیابیوں کے جھنڈے لیے ہوئے آگے ہی بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ ۲۰۱۱ء آ گیا جس کے شروع ہوتے ہی فیض صاحب کے بھانجے سلمان تاثیر کو نشانہ بنایا گیا۔ یعنی دائرہ پورا ہو گیا۔

فیض صاحب ایک عالمی شخصیت تھے۔ جب ۱۹۷۸ء میں وہ بمبئی گئے تو ان سے ملنے کے

بقیہ ص ۹۵ پر

پروفیسر یونس حسن (قصور)

ڈاکٹر وحید قریشی......ایک دیو پیکر شخصیت

ڈاکٹر وحید قریشی یقیناً ایک دیو پیکر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی وفات سے اُردو ادب ایک بالغ نظر محقق، نقاد، انشا پرداز، دانشور، استاد، شاعر، مترجم اور کالم نگار سے محروم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار اُن معدودے چند محققین اور ناقدین میں ہوتا تھا جن کے دم سے تحقیق اور تنقید کا ایک معیار قائم ہے۔ ایسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ ان جیسے کتنے لوگ باقی بچے ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال تحقیق اور تنقید کو دے دیئے۔ اس ضمن میں اپنا سب کچھ تیاگ دیا۔ شبانہ روز نئی نئی چیزوں کی تلاش اور کھوج میں صرف کر دیے اور جنون کی حد تک کام کیا۔ اپنے کام سے لگن اور عشق کی وجہ سے کامیابی اور کامرانی کے کئی ایک ہفت خواں طے کیے۔ ہر قسم کے حالات میں ثابت قدمی دکھائی اور ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیا۔ ہر مشکل کام کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور اُس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ خصوصاً نایاب مخطوطوں، تذکروں، دواوین اور داستانوں کی تلاش میں انہوں نے دن رات ایک کر دیا اور ان تک رسائی حاصل کی۔ بڑی محنت اور عرق ریزی سے اُن کا مطالعہ کیا۔ محنت اور عرق ریزی کے اس عمل میں اُن کو بعض اوقات بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صدیوں پرانی تحریریں تھیں۔ جن کے کاغذ بہت بوسیدہ اور خستہ ہو چکے تھے اور ان کو دیمک چاٹنے جاری تھی اور بعض کو دیمک واقعتاً چاٹ چکی تھی اور ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے مخطوطوں کو دیمکوں کی نذر ہونے سے بچا لیا۔ اور ان کو ڈھونڈا، اور پھر ان کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بنا دیا۔ ایسی قدیم اور پرانی چیزوں سے محبت کرنے والے کتنے باقی بچے ہیں۔ شاید بہت تھوڑے۔ جن کو ایسی نایاب چیزوں سے عشق ہے۔ اور وہ ایسی چیزوں کی تلاش میں اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تو صورت یہ ہے کہ آج کے دور میں ان

مخطوطوں پر کام کرنا تو در کنار اُن کی کھوج کرنے والے لوگ بھی خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ایسے سر پھرے لوگ ہر دور اور عہد میں پائے گئے ہیں جنہوں نے کمال محنت اور محبت سے کلاسیکی اور قدیم دور کی چیزوں کو سنبھالا ہے۔ اس عظیم ورثے کی اس طرح حفاظت کی جیسے اس کا حق بنتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار بھی ایسی بے نظیر اور یگانہ روزگار ہستیوں میں ہوتا تھا۔ لگتا ہے کہ شاید قدرت نے ڈاکٹر صاحب کو تحقیق کے لیے چن لیا تھا اور اس ضمن میں ان کو بہت فہم و فراست عطا کی تھی اور آگہی اور شعور کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ یہ دولت جو کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ فطرت کی جانب سے ودیعت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے باب میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جستجو، تلاش اور کھوج کا جذبہ اور جنون اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر ان کے اندر رکھ دیا تھا۔ یہ جستجو، تلاش اور کھوج جس کا سفر انسان کو نئی نئی منزلوں کی جانب پیش قدمی پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ اس سفر میں کبھی تو انسان کو کامیابیاں ہوتی ہیں اور کبھی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی مایوسی حد سے بڑھ جاتی ہے اور کبھی امید اور آگے بڑھنے کی خواہش اُس کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ کبھی حالات کی ڈگر اس کی سوچ اور فکر سے بالکل الٹ چلی جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس کو شکست پیچھی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ ان چیلنجوں کو قبول کر لیتا ہے اور اپنی جدوجہد کا سفر جاری رکھتا ہے اور ہر سطح پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے تو پھر وہ ساری چیزیں جن کا حصول ناممکن نظر آ رہا ہوتا ہے وہ اس کے لیے ممکن ہو جاتی ہیں۔ اور ان تک رسائی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ چیزیں جو اسرار کے پردوں میں چھپی ہوتی ہیں اس پر اپنے بھید کھول دیتی ہیں۔ ان کے سربستہ راز انسان کے لیے کوئی معمّا نہیں رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی و تنقیدی کام کو جب ہم مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف تحقیق کے فن سے ہر سطح پر انصاف کیا بلکہ نئی اور نادر چیزوں کی تلاش کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ روایت سے چمٹنے کی بجائے اپنا ایک الگ راستہ نکالا۔ تقلید سے انحراف کرتے ہوئے جدید اور نئی فکر کو اپنایا اور اس کو بروئے کار لاتے ہوئے تحقیق میں نئی نئی دریافتیں کیں۔ ڈاکٹر صاحب کی جدت طرازی اور جدت پسندی نے جہاں ان کے تحقیقی کام کو انفرادیت بخشی وہاں اس سے ایک روایت کا آغاز ہوا جس میں چیزوں کو ایک محدود زاویہ نگاہ سے ہٹ کر ایک وسیع کینوس اور تناظر میں دیکھنے کی طرح ڈالی گئی۔ اس ضمن میں

پسند ناپسند اور ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے ہٹ کر ایک بے لاگ انداز اپنایا گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ کھرے اور کھوٹے کا فیصلہ کرنا آسان ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق میں جس بے لاگ انداز کو اپنایا اور اس کو پرموٹ کیا اس سے ڈاکٹر صاحب کی وسیع النظری، ذہن کی کشادگی، فکر اور سوچ کی گہرائی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ انداز بہت سوں کو پسند نہ آیا۔

کھوٹے اور کھرے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے کبھی پس و پیش نہ کی۔ اس ضمن میں وہ بڑی حد تک بے رحم ثابت ہوئے تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنا بہت سا نقصان بھی کیا۔ لیکن اس جادے کو نہ چھوڑا۔ وہ ایک ایسے سچے محقق تھے جن کی نظر ہزار تہوں میں بھی حقیقت اور سچ تک پہنچ جاتی تھی۔ سچائی کو چاہے جتنے بھی پردوں میں چھپایا گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب اُس کا سراغ لگا کر چھوڑتے اور جب تک ایسا نہ کر لیتے انہیں چین اور آرام نہ آتا تھا۔ انہوں نے جتنے بھی تحقیقی منصوبوں کو شروع کیا اور ان کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اس میں اسی سچ کی کھوج تھی۔ اور آخر کار اس کو قاری کے سامنے لا کر چھوڑا۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے کسی منصوبے کو شروع کیا ہو اور اس کو میرٹ پر مکمل نہ کیا ہو۔ یہ الگ بات کہ بعض منصوبے ادھورے اور نامکمل رہے ان کی الگ وجوہات رہی ہوں گی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی جانب سے کسی بھی سطح پر کوتاہی کم ہی دیکھنے میں آئی۔ ایسی ہی صورت اوروں کو تحقیقی کام الاٹ کرنے کے حوالے سے بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بے حد کڑے اور حساس واقع ہوئے تھے۔ محققین کی ایک کثیر تعداد ہمیشہ ان کے زیر نگرانی اپنے مقالات کی تکمیل کرتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاج اور عادت سے ہر محقق بخوبی آگاہ تھا کہ وہ اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ کام جب تک اُن کے معیار کے مطابق نہ ہوگا وہ ہرگز مطمئن نہ ہوں گے۔ اور مقالے کا کام وہیں ٹھپ ہو جائے گا۔ محقق کو یا تو اپنا نگران تبدیل کروانا ہوگا یا پھر ڈاکٹر صاحب کے وضع کردہ معیار کا کام کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی شفقت اور مہربانی ان کے لیے تھی جن کو اپنے کام سے عشق تھا۔ فارغ رہنے والے اور صرف باتیں کرنے والوں سے ڈاکٹر صاحب کا کبھی نباہ نہ ہو سکا۔ اس ضمن میں بہت سوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تعلقات منقطع ہوئے۔ لیکن ان میں سے جنہوں نے اپنے آپ کو کام کا عادی بنا لیا تھا تو پھر ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف ان کے کام کی ستائش کی بلکہ ہر سطح پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور

جہاں جہاں سے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں مواد مل سکتا تھا۔ اس کی واضح نشاندہی کی۔ اس حوالے سے محققین کو کبھی مایوس نہ کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو محقق ان کی نگرانی میں کام کر رہا ہوتا تھا اس کو کبھی اس پہلو کی فکر نہ ہوتی تھی کہ مقالے کے لیے مواد کی فراہمی کیسے ممکن ہوگی۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی مشکل سے مشکل عقدے وا کرتی چلی جاتی۔ بعض اوقات تو دو چار ملاقاتیں یا لیکچرز ہی کافی ہوتے اور محقق جب اُن کے پاس سے اٹھتا تو اس کی تمام پریشانیاں زائل ہو چکی ہوتیں جو وہ اپنے ساتھ لے کر آتا تھا۔ اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی۔ اور چہرے پر مایوسی اور بددلی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ ایسا کیوں تھا؟ یا ایسا کیوں کر ہوتا تھا؟ اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کی پُر خار وادی میں ایک طویل عرصہ بتایا تھا۔ ہزاروں کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ کتب ان کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ نادر مخطوطوں، تذکروں اور داستانوں کو پڑھا تھا۔ اس کے ساتھ عہد جدید میں چھپنے والی مختلف اصناف ادب کی کتابیں ان کی نظر میں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل topic اور موضوع پر پہروں بول سکتے تھے۔ شاید اس بنا پر انہوں نے اپنی نگرانی میں کام کرنے والے طلبا کو ہر موضوع پر کام کروایا۔ ان کی نگرانی میں مکمل ہونے والے سینکڑوں مقالات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا زیادہ وقت طلبا و طالبات کی رہنمائی کے لیے صرف کیا۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے زمانے میں ان کے گھر میں ہمیشہ طلبا کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا دن کے ساتھ رات کا بیشتر حصہ ڈاکٹر صاحب مصروفیت میں گزارتے۔ دن رات کام کرتے مگر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر تھکن کے آثار کم ہی نظر آتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے دنیاداری کے دھندوں کو ترک کر کے کام کو ہی اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ شاید یہی ان کی زندگی کا حاصل تھا۔ اور اسی وجہ سے ایک تر و تازگی اور شگفتگی کے آثار ہمیشہ ان کے چہرے پر دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں مختلف النوع موضوعات پر خود کام کرنا اور اوروں کو کروانا یقیناً ایک غیر معمولی بات تھی۔ ایسا کام غیر معمولی آدمی ہی کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب بھی ایک غیر معمولی آدمی تھے۔ محنت اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ محنت ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ اس محنت کا ہی ثمر ہے کہ انہوں نے تحقیق کے میدان میں جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کبھی مال

وزر سے پیار نہیں رہا۔ اور نہ ہی ان کا مطمح نظر ہی رہا۔ جو مل گیا اس کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب کے چھوڑے ہوئے سرمائے میں اگر کچھ ہے تو وہ ان کی کتب ہیں جو ان کی کئی دہائیوں کی مسلسل محنت اور کھوج کا ثمر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب دستاویزی تحقیق کے ماہر تھے۔ اور اس حوالے سے ان کا نام ایک حوالے کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ لسانیاتی تحقیق، متن، روایت متن، تالیف متن، تصحیح متن، صحت متن نیز تحقیقی عمل کے مراحل کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر، ان کے نظریات وافکار اور ان کی ذاتی تحقیق ایک بہترین ماخذ کا کام دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے ساتھ تنقید کے میدان میں بھی اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان بنائی۔ ان کے سینکڑوں تنقیدی مقالات جو وقتاً فوقتاً ہندو پاک کے بہترین علمی جرائد میں شائع ہوئے، انھیں ایک بہترین نقاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بطور ایک نقاد ڈاکٹر صاحب نے روایت سے ہٹ کر اور تنقید برائے تنقید کی روش کو چھوڑ کر فن پاروں کو دیکھنے اور پرکھنے کے ایک صحت مند رجحان کو پروان چڑھایا۔ تخلیق کاروں کی تخلیقات کو جانبداری اور تعصب کی عینک سے دیکھنے کی بجائے بے لاگ انداز سے جانچنے اور پرکھنے کا آغاز کیا۔ محاسن اور نقائص کو الگ الگ کیا۔ لکھنے والوں کے سامنے جو معیار رکھا وہ سب کے لیے ایک جیسا تھا۔ اس میں کسی سے کوئی امتیازی سلوک روا نہ رکھا۔ شخصی تعارف کو یکسر فراموش اور بھلا کر چیزوں کو دیکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب بڑی حد تک بے رحم واقع ہوئے تھے۔ اگر تخلیق کے اندر جان ہوتی اور تعریف اور تحسین اس کا حق ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کبھی بخل سے کام نہ لیتے۔ بلکہ دل کھول کر فن پارے کی تعریف کرتے کہ تخلیق کار کے اندر لکھنے کی مزید تحریک پیدا ہوتی۔ اس کا حوصلہ بڑھتا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کی اکثر تخلیق کاروں سے تعریف سنی گئی۔ البتہ وہ تخلیق کار جن کی تخلیقات غیر معیاری اور سطحی نوعیت کی ہوتی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کی کتابوں کے اوپر دیباچہ یا چند سطریں ہی لکھ دیں۔ ان کی ایسی خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی معیار پر سمجھوتہ نہ کیا۔ اس حوالے سے بیگانوں کے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی ناراض کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی تنقید نہایت سلجھی ہوئی اور شائستہ ہوتی تھی۔ تنقید کرتے ہوئے وہ فن پاروں کے بخیے نہیں ادھیڑتے تھے۔ بلکہ وہ تو ان کے اندر پوشیدہ اور اچھی چیزوں کے متلاشی ہوتے تھے۔ بطور ایک نقاد کے انہوں نے اس فریضے کو بخوبی سرانجام دیا۔ بہت سے تخلیق کاروں کی تخلیقات، ان کا فن، ان کی متنوع جہات ان کے توسط اور وسیلے سے سامنے آئیں۔ ان میں سے ایسے تخلیق کار بھی تھے جن کو ڈاکٹر صاحب ذاتی طور پر جانتے بھی نہ تھے اور ان سے کبھی ملے بھی نہیں لیکن ان کے تنقیدی تبصرے پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان تخلیق کاروں کو قریب سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کی عرق ریزی، ان کا انہماک، ان کی باریک بینی، ان کی موشگافیاں، ان کا اپنے فن سے انصاف زبانِ حال سے پکار پکار کر صاف کہہ رہا ہے کہ تنقید میں ڈاکٹر صاحب جیسا کھرا اور سچا کم ہی دیکھنے میں آیا۔

تحقیق اور تنقید کے دونوں شعبوں میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت لگن اور محنت سے کام کیا۔ اور پھر یہی تحقیق اور تنقید کا شعبہ ان کی بنیادی پہچان بن گیا اور اس حوالے سے ان کا نام سند کا درجہ اختیار کر گیا۔

جن قدیم مخطوطوں، تذکروں، دواوین، داستانوں اور مسودوں پر انہوں نے کام کیا وہ نہایت اعلیٰ پائے کا ہے۔ ایسی ہی صورت ان کی ایڈٹ کی ہوئی چیزوں کی ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک خاصے کی چیز ہیں۔ میرے خیال میں جس نے تحقیق اور تنقید کے فن سے آگہی حاصل کرنی ہو وہ ڈاکٹر صاحب کی کتب کا مطالعہ کرے۔ تحقیق اور تنقید کی مشکل اور پیچیدہ گرہیں ان کے لیے کھلتی چلی جائیں گی۔ سوچ اور فکر کے زاویوں میں وسعت آئے گی اور روایت سے ہٹ کر نئے حوالوں سے چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی عادت پڑے گی۔ تحقیق اور تنقید کے شعبے میں ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل کتب حوالے کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔

۱۔ اردو کا بہترین انشائی ادب	۲۔ میر حسن اور ان کا زمانہ
۳۔ شبلی کی حیات معاشقہ	۴۔ مطالعہ حالی
۵۔ اقبال اور پاکستانی قومیت	۶۔ اساسیات اقبال
۷۔ باغ و بہار۔ ایک تجزیہ	۸۔ مقالات تحقیق

۹۔ مطالعہ ادبیات فارسی ۱۰۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ

۱۱۔ افسانوی ادب ۱۹۹۳ء ۱۲۔ اردو نثر کے میلانات، تنقیدی مطالعہ

۱۳۔ مثنویات میر حسن ۱۴۔ دیوان جہاں دار شاہ (ترتیب وتدوین)

۱۵۔ انتخاب دیوان سودا ۱۶۔ تذکرہ ہمیشہ بہار (از کشن چند اخلاص)

۱۷۔ نامہ عشق، از اندر جیت منشی (ترتیب وتدوین)

۱۸۔ عمل صالح، از صالح محمد کمبوہ (ترتیب وتدوین)

۱۹۔ دربار ملی ۲۰۔ جدیدیت کی تلاش میں

۲۱۔ قائداعظم اور تحریک پاکستان

ڈاکٹر صاحب تہذیب اور شائستگی کے پیکر تھے۔ ان میں نفاست تھی۔ یہ نفاست ان کی نشست و برخاست، گفتگو، لباس، تراش خراش اور وضع قطع سے پوری طرح عیاں ہوتی تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی نفاست دیکھنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ ان کا جسم اگرچہ فربہ تھا لیکن عام طور پر پینٹ کوٹ ہی زیب تن کرتے تھے۔ اورینٹل کالج میں ٹیچنگ کے دوران انہیں شلوار قمیض میں کم ہی دیکھا گیا۔ وہ ایک دور میں شیروانی بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت پر خوب کھلتی تھی۔ لیکن جسم کے فربہ ہونے کی وجہ سے شیروانی کو وہ زیادہ دیر تک نہ چلا سکے۔ جو بھی شخص ان سے ملتا ان کے لباس کی نفاست اسے ضرور متاثر کرتی، اس کے ساتھ ان کی علمیت اور قابلیت دوسروں پر اپنا اثر چھوڑتی۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور طبع میں مزاح اور ظرافت کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ وہ عملی زندگی میں جتنے سنجیدہ اور متین واقع ہوئے تھے حقیقت میں بالکل ایسے نہ تھے۔ وہ تو ایک بذلہ سنج اور مزاح نگار تھے۔ وہ مزاح نگار جو اپنے مزاح اور ظرافت سے لوگوں کو ہنساتا چلا جاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب عام طور پر لطیفوں کے ذریعے مزاح پیدا کرتے تھے۔ ان کے پاس لطیفوں کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسروں کے اوپر پھبتیاں کسنے کا بھی انہیں خوب ملکہ حاصل تھا۔ لیکن یہ پھبتیاں تہذیب اور شائستگی کے معیار سے کبھی نہ گرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد تو ہنسنا اور ہنسانا ہوتا تھا نہ کہ کسی کی دل آزاری۔ ان کے ہم عصران

کی اس عادت سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے وہ بھی پوری طرح تیار ہو کر آتے تھے اور وہ جواباً ڈاکٹر صاحب کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ لیکن عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا کہ ڈاکٹر صاحب کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن جب کسی کی پھبتی ڈاکٹر صاحب کو زچ کر دیتی اور اس کا جواب نہ بن پڑتا تو ڈاکٹر صاحب اس کی کھل کر داد دیتے۔ اس حوالے سے وہ بڑا وسیع ظرف رکھتے تھے۔ دوسروں کے مزاحیہ اور ظرافت سے لبریز جملوں کو سراہنا اور ان پر دل کھول کر داد دینے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔

چاہے جملے کتنے ہی کاٹ دار اور اپنے اندر نشتریت لیے ہوئے کیوں نہ ہوتے ڈاکٹر صاحب ان کو سنتے اور حظ اٹھاتے۔ ایسا محض وہی شخص کر سکتا ہے جس کی سوچ اور فکر کے زاویے محدود نہ ہوں۔ جس کو ہنسنے اور ہنسانے کا آرٹ آتا ہو۔ جو زاہد خشک نہ ہو بلکہ ہر پچوئشن اور موقع محل کے تناظر میں زندگی کو ہنس کر گزارنے کے فن سے آشنا ہو۔ جو غم کو قہقہوں میں اڑا دینے کا عادی ہو۔ جو کسی بھی لمحے زندگی کو اپنے لیے وبال اور معصیت نہ سمجھتا ہو۔ بلکہ جسے غم والم میں زندگی گزارنے میں مزہ آتا ہو۔ مزاح اور طنز و ظرافت کا یہ ماحول اور فضا کلاس روم میں بھی جہاں وہ نہایت سنجیدہ اور دقیق موضوعات پر لیکچر دیا کرتے تھے..... جاری رہتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز کبھی طلباء و طالبات کی طبع پر گراں نہیں گزرتے تھے۔ سنجیدہ گفتگو کے دوران ہی ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی مزاحیہ اور طنزیہ بات کہتے یا کوئی لطیفہ سناتے کہ طلبا کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی آ جاتی۔ اور بعض اوقات یہ ہنسی قہقہوں کا روپ دھار لیتی اور ماحول کا تناؤ یکسر ختم ہو جاتا۔ طبیعتیں ہلکی پھلکی ہو جاتی ہیں۔ مزاح اور ظرافت کی یہ صورت حال جاری و ساری رہتی۔ اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے زندگی گزارنے کے اصل فن سے آگاہی حاصل کر لی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے مشکل سے مشکل موضوعات پر کام کیا اور نہایت اعلیٰ درجے کا کام کیا۔ ان کی طبع کے اس میلان اور انداز نے انہیں کبھی زندگی سے مایوس اور بددل نہ ہونے دیا۔ اور نہ ہی انہیں افسردہ اور رنجیدہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر صاحب طبعاً ایک محبت کرنے والے انسان تھے۔ محبت کا یہ انداز سب کے ساتھ ایک جیسا تھا۔ محبت کے اس انداز میں کبھی کمی نہ دیکھی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے ہم عصروں اور ہم

چشموں کے ساتھ تعلقات نہایت خوشگوار رہے کم ہی دیکھنے میں آیا کہ ان تعلقات میں کشیدگی ہوئی ہو یا ڈاکٹر صاحب نے کسی سے اپنا ناتا اور تعلق توڑ لیا ہو۔ تاوقتیکہ کسی نے خود ہی تعلق منقطع کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب تو تعلقات کو نباہنے والے تھے۔ چاہے حالات کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو جاتے ڈاکٹر صاحب تعلقات کی پاسداری کرتے۔ خود بڑے سے بڑا نقصان اٹھا لیتے لیکن یہ کبھی گوارہ نہ کرتے کہ کوئی ان کی وجہ سے رنجیدہ اور ملول ہو یا کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس کسی کے ساتھ دوستی کی اس کو پھر ہمیشہ اپنا دوست سمجھا۔ اپنے اس رویے اور رجحان کو تبدیل نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض دوستوں نے ان کے ساتھ دوستی کی بجائے حریفانہ روش کو اپنایا اور ڈاکٹر صاحب کو پچھاڑنے کی کوشش کی۔ اور اس سلسلے میں کوئی وار اور حربہ خالی نہیں جانے دیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی سوچ اور فکر اس کے خلاف رہی۔ انہوں نے مخالفوں کے مخالفانہ اور مخاصمانہ رویوں اور رجحانات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور کبھی اوروں جیسا انداز اور رویہ نہیں اپنایا۔ البتہ جو لوگ حد سے گزر گئے اور انہوں نے دوستی کی قدروں کو پامال کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو اجیرن بنانے کی کوشش کی یا پھر اُن کا گھیراؤ کرنے کی جسارت کی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے ایسے کم ظرف لوگوں سے راہ فرار اختیار نہیں کی بلکہ اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایسے لوگ اُن کے سامنے نہ ٹک سکے اور اُن کے ہاتھ میں سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ نہ آیا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اُن کے مزاج، میلان، رویوں، رجحانات اور ان کی فطرت کی کجیوں سے کون واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی باری آئی تو اُن کے لیے چھپنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ سامنا کرنا تو در کنار۔ لیکن یہ بات بھی ریکارڈ میں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا غصہ جو فطری ہوتا تھا وہ مستقل اور زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہتا تھا اور جلد ہی زائل ہو جاتا تھا۔ وہ نفرت، کینہ، حسد، اور عداوت کو اپنے دل میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کا جب بھی کسی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں آنا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں بالکل ایسے ڈیل کیا جیسے وہ دوستوں کو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے مشاغل، رجحانات اور سرگرمیوں پر نظر کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اگرچہ لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت بتاتے تھے لیکن اس کے ساتھ دوستوں کے ساتھ بھی گھنٹوں بیٹھتے اور

گپ شپ لگاتے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ دوستوں اور ہم جلیسوں کا ایک بڑا حلقہ جس میں ادیب وشعراء، محققین و ناقدین، اور دیگر مکتب فکر کے لوگ شامل تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ہر محفل اور مجلس میں پائے جاتے جب بھی دوستوں کا بلاوا آتا، کوئی مشاعرہ ہو رہا ہوتا یا کوئی علمی وادبی نشست ہوتی یا پھر کسی کتاب کی رونمائی ہوتی ڈاکٹر صاحب احباب کی دعوت پر ضرور شرکت کرتے۔ اور تخلیق کاروں کی اچھی تخلیقات پر دل کھول کر داد دیتے۔ یہ علمی وادبی نشستیں اور مجالس رات گئے تک جاری رہتیں ڈاکٹر صاحب برابر ان میں موجود رہتے۔ اور دوستوں کی خواہش کو ہمیشہ مقدم رکھتے۔ کم ہی ایسا دیکھنے میں آیا کہ ڈاکٹر صاحب کو دعوت ملی ہو اور انہوں نے آنے میں پس وپیش کیا ہو اور ٹال مٹول سے کام لیا ہو ماسوائے اس کے کہ کوئی ناگزیر صورت حال پیدا نہ ہو جاتی اور ڈاکٹر صاحب کا آنا ممکن نہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب سے انکار نہ ہوتا تھا۔ ان مجالس میں جہاں بہت سنجیدہ گفتگو ہوتی اور مقالات پڑھے جاتے اور شائع شدہ کتاب پر تبصرہ کیا جاتا وہاں ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ بیانی اور مزاحیہ گفتگو مجالس کے معمول کو یکسانیت کا شکار نہ ہونے دیتی۔ بات سے بات نکلتی چلی جاتی اور ڈاکٹر صاحب اپنی ظریفانہ طبع اور میلان کی وجہ سے دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ اُن کی زندہ دلی اور طبع کی شگفتگی اُن کے باطن کی خوبصورتی کو دوسروں پر عیاں کر دیتی۔ اپنی نجی زندگی میں بھی ڈاکٹر صاحب بڑے کھلے ڈھلے تھے ان میں تکلف بالکل نہ تھا۔ گھر پر جانے والے اور اُن سے ملنے والوں سے انہوں نے کبھی تکلف نہیں برتا۔ ڈاکٹر صاحب طبعاً تکلفات کے خلاف تھے۔ دوستوں اور ہم عصروں کے حوالے سے تو ان میں تکلف کا شائبہ تک نہ تھا۔ گھر کا ماحول ٹھیٹھ پنجابی اور کھانے پینے کا انداز بھی پنجابیوں کا تھا۔ کھانے پینے کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خوراک واقع ہوئے تھے۔ شاید گوجرانوالہ کے خطے کے اثرات تھے کہ دیسی کھانوں کی جانب اُن کی فطری رغبت تھی۔ یہ کھانے گھر میں تواتر سے پکتے تھے اور گھر سے باہر بھی کھائے جاتے اور دوستوں اور احباب کو بھی پیش کیے جاتے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کی اس خوش خوراکی نے ان کو فربہ بنا دیا تھا۔

بطور منتظم، پرنسپل اور مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر صاحب نے خدمات سرانجام دیں اور اس سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ جس ادارے میں گئے اور

وہاں کے انتظامی امور کو نہایت احسن طریقے سے چلایا۔ اور اس سلسلے میں شب و روز محنت اور جدو جہد کی۔ خود بھی ہمہ وقت کام میں مصروف رہے اور دوسروں کو بھی مصروف رکھا۔ اور جمود اور ٹھہراؤ کو نہیں آنے دیا۔ ہر کام کے پہلے سے بہتر اور نئے انداز سے کرنے کی طرح ڈالی۔ انہیں لوگوں سے کام لینے کا آرٹ اور سلیقہ آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے کام جو ان کی آمد سے قبل ان اداروں میں التوا کا شکار چلے آ رہے تھے یا پھر سست روی کا شکار تھے ڈاکٹر صاحب کے آنے سے تیزی سے تکمیل کی جانب بڑھنے لگے اور جلد ہی مکمل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی شفقت اور محبت نے ان کے ماتحت کام کرنے والے ملازمین کو بھی ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا جائز کام کبھی نہیں روکتے تھے۔ اس ضمن میں کبھی پس و پیش اور تامل متولق سے کام نہیں لیا۔ روز کے کام روز نپٹاتے۔ ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی کام کرنے میں تاخیر کی ہو۔ ان کی زندگی کا منشور اوروں کی خدمت تھا۔ اس منشور پر انہوں نے عمل کر کے دکھایا۔ اور جب تک وہ انتظامی عہدوں پر فائز رہے انہوں نے اس حد تک کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ ایک اور خوبی جو کہ بطور منتظم اُن کو انفرادیت بخشتی ہے وہ اپنے عملے کے ساتھ ربط تھا۔ وہ جہاں بھی رہے انہوں نے اس ربط کو زیادہ سے زیادہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کو کسی بھی سطح پر کمزور نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آفس کے تمام ملازمین بغیر کسی تامل اور ہچکچاہٹ کے جب چاہتے ان سے مل سکتے تھے۔ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اور ایسی ہی صورت تمام لوگوں کی تھی جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ ان کے کام کرنے میں ڈاکٹر صاحب کو جو خوشی اور اطمینان ہوتا وہ شاید کسی اور چیز سے بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔ ایسی ہی صورت ان کے ہم عصر ادیبوں اور شعراء کے ساتھ بھی تھی۔ ان کے کام کو وہ پہلی فرصت میں کرتے۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔

ڈاکٹر صاحب بطور مدیر بھی بے حد فعال اور متحرک رہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے نامور علمی و ادبی پرچوں کی ادارت کی جس میں سہ ماہی 'صحیفہ'، 'مخزن'، 'اخبار اردو'، 'مجلہ تحقیق'، 'رسالہ اقبال'، 'اقبال ریویو' قابل ذکر ہیں مضامین اور مقالات کے انتخاب میں وہ بے حد کڑے واقع ہوئے تھے۔ اس ضمن میں اپنے اور پرائے میں کوئی تخصیص اور امتیاز نہ تھا جس نے بھی محنت اور

عرق ریزی سے کوئی چیز تحریر کی اس کی قدر کی اور اس کو شائع کیا۔ اور جہاں انہیں یہ چیز نظر نہیں آئی اس کو پرچے میں جگہ نہ دی۔ تحقیقی مقالات ہوں یا مضامین وہ ایک ایک لفظ کو پڑھتے اور مقالے اور مضمون کا تمام حوالوں سے جائزہ لیتے۔ خصوصاً تحقیقی مضامین کے ماخذات پر اُن کی گہری نظر ہوتی تھی۔ جہاں کہیں کسی نے غلط حوالہ دیا نہیں ڈاکٹر صاحب نے اس پر گرفت کی نہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی غلط حوالہ جات اور غیر حقیقی ماخذات کی بنیاد پر کوئی تحریر لکھتا اور ڈاکٹر صاحب اس کو پرچے کے لیے منتخب کر لیتے۔ ایسی تحریروں کو ڈاکٹر صاحب پہلی فرصت میں رد کر دیتے۔ اس ضمن میں چاہے ان پر کتنا ہی بوجھ ہی کیوں نہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بے لاگ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر کسی بھی تحریر کے معیاری ہونے کی سند دیتے اور ڈاکٹر صاحب سے سند پانے والی تحریر، مقالے اور مضمون کو چہار جانب سے پذیرائی ملتی۔

بطور مدیر ڈاکٹر صاحب نے بہت سے لکھنے والوں کو لکھنے کا ڈھنگ اور سلیقہ سکھایا۔ ان لوگوں کو کامیاب محقق بنانے میں ڈاکٹر صاحب کی عملی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سوں نے بہت کچھ سیکھ کر بھی ڈاکٹر صاحب کو تسلیم نہ کیا اور ان کی عزت اور توقیر نہ کی۔ بلکہ الٹا ان پر تنقید کی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے لوگوں کے رویوں اور باتوں سے ذہنی طور پر بعض اوقات بہت مجروح ہوئے۔ لیکن انہوں نے ان کو جتایا نہیں یہ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ جو آپ کی انگلی پکڑ کر آپ کو لکھنا سکھائے آپ اس کو ہی معاف نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جن لوگوں کو کوئی جانتا نہ تھا اور وہ گمنامی کے پردے میں کہیں پڑے تھے ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی جریدوں میں ان کو اور ان کے کام کو متعارف کروایا۔ اور ان کو ایک منفرد شناخت اور پہچان عطا کی۔ ان میں کئی ایک آنے والے دور میں ان کے حریف ٹھہرے۔ اور ڈاکٹر صاحب پر تنقید کو اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔

ایک طنزیہ کالم نگار کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی الگ شناخت اور پہچان بنائی۔ انہوں نے 'میر جملہ لاہوری' کے قلمی نام سے کالم نگاری کی جو تمتاز عد ہی۔ اپنے کالموں میں انہوں نے جو اسلوب اور انداز اپنایا وہ بے حد کاٹ دار اور اپنے اندر نشتریت لیے ہوئے تھا۔ اس انداز اور اسلوب نے بہت سے اپنوں اور بیگانوں کو نہ صرف ان سے دور کر دیا بلکہ ناراض بھی کر دیا۔ ان

کالموں میں شخصیات کی جو جراحی کی گئی اور بخیے ادھیڑے گئے اس میں ڈاکٹر صاحب کہیں کہیں اعتدال برقرار نہ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم نگاری کے خلاف علمی وادبی حلقوں میں ایک ردعمل کی صورت نے جنم لیا اور ڈاکٹر صاحب کو کالم نگاری سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اپنے کالموں میں ڈاکٹر صاحب نے جو باتیں کیں وہ کوئی اتنی غلط نہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بغیر تحقیق کے نہیں لکھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب نے جن موضوعات کو ہائی لائٹ کیا اور جن افراد اور شخصیات کی مرقع نگاری کی ہے ان کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات اور علم ناکافی نہ تھا اور نہ ہی ان کا مقصد کسی کی تضحیک کرنا تھا بلکہ مقصد تو یہ تھا کہ ہم عصر دوستوں اور دیگر علمی وادبی شخصیات کو روایت سے ہٹ کر ایک نئے زاویے سے دیکھا اور پیش کیا جائے۔ لیکن ان کا یہ زاویہ نگاہ اور انداز پسند نہ کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب ماہر غالبیات اور ماہر اقبالیات تھے۔ غالب پر ان کے چھپنے والے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین اور مقالات اس امر کی گواہی دے رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے غالب کو نہایت گہرائی میں جا کر پڑھا تھا وہ چونکہ فارسی زبان پر دسترس رکھتے تھے اس لیے انہوں نے غالب کی فارسی کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ غالب کے فارسی کلام پر بات کرنا ان کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ انہوں نے غالب کے فارسی کلام پر متعدد مضامین لکھے۔ یہ مضامین اپنے تحقیقی وتنقیدی معیار کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت غالب کے خطوط پر لکھے ہوئے مضامین کی بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس غالب پر لکھی ہوئی کتب، مقالات اور مضامین کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ جس کو انہوں نے سالوں کی محنت سے اکٹھا کیا تھا۔ یہ ذخیرہ بڑے کام کی چیز ہے۔ غالب پر کام کرنے والوں کو اس میں اپنے لیے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا ذاتی مطالعہ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا اوروں کے کام آتا تھا۔ محققین غالب کو وہ چیزیں جو ان کتابوں سے نہ مل پائی تھیں وہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات اور ان سے گفتگو سے مل جاتی تھیں۔ اور مشکل سے مشکل عقدے حل ہو جاتے تھے۔ چیزیں اسرار کے پردوں سے نکل کر اپنی اصلیت کے ساتھ سامنے آجاتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب کے ساتھ علامہ اقبال پر جو تحقیقی وتنقیدی کتب، مقالات اور

مضامین یادگار چھوڑے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو بطور ایک اقبال شناس کے زندہ رکھیں گے۔ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہونے کے بعد انہوں نے نہ صرف خود شب و روز اقبال پر کام کیا بلکہ اوروں سے بھی اس سلسلے میں خوب کام کروایا۔ اور نہایت محدود عرصے میں اقبال پر بیسیوں کتب شائع کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کام خود کو منوا رہا ہے۔ خود کوئی تجسس یا تعریف کرے نہ کرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ڈاکٹر صاحب کی ذاتی لائبریری اپنی مثال آپ ہے۔ اس لائبریری میں ہزاروں کتب ہیں۔ یہ کتب ڈاکٹر صاحب کی پچھلی نصف صدی کی کمائی ہیں۔ اس میں بہت سے نایاب مخطوطے، تذکرے، کلاسیکی شعراء کے دواوین، رسائل و جرائد، اخبارات، تحقیقی و تنقیدی کتب غرض کیا کچھ نہیں ہے۔ جو اس لائبریری میں موجود نہیں۔ یہ لائبریری تحقیق کرنے والے محققین کے لیے ایک نایاب اور نادر چیز ہے۔ یہاں پر محققین کو جو کچھ مل سکتا ہے وہ شاید دوسری بہت سی لائبریریوں سے نہ مل سکے۔ خصوصاً وہ مواد جس کے لیے محققین کو در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ اور پھر کہیں جا کر وہ مواد مہیا ہوتا ہے، وہ اس لائبریری سے مل سکتا ہے۔ وہ کتب جو نایاب ہیں اور اب نہیں چھاپی جا رہی ہیں وہ بھی موجود ہیں متعدد کلاسیکی داستانیں، تذکرے، دواوین، مخطوطے، اصل متن کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک ایک چیز کو نہایت قرینے اور سلیقے سے رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی چیز ڈھونڈنے میں چنداں مشکل پیش نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب کا اکٹھا کیا ہوا سرمایہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں بھی محققین کے کام آ رہا تھا اور اب بھی آ رہا ہے۔ اس لائبریری کے دروازے ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ محققین کے لیے کھولے رکھے اور اس سلسلے میں کبھی بخیلی سے کام نہیں لیا جس کسی نے اس سلسلے میں ان سے جو طلب کیا وہ انہیں فوراً مہیا کر دیا تا کہ کام کرنے والوں کو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ اپنے کام کو وقت پر مکمل کر سکیں۔ ایسے بے شمار لوگ ریکارڈ پر موجود ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی لائبریری کی مدد سے اپنے مقالات کو مکمل کیا۔ اب ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ کہاں سے آئیں گے؟ ان کے جانے سے ہم ایک سچے اور کھرے محقق اور نقاد کے ساتھ اپنی ذات میں ایک انجمن شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

قمر علی عباسی (نیویارک)

سلطان کے پاپا

غمِ روزگار کیا ہوتا ہے...... غمِ زمانہ کس کو کہتے ہیں، یہ ان دنوں کی بات ہے جب غم کے پیچھے بھی نہیں آتے تھے۔ ہر وقت ہنسی مذاق ایک ہنگامہ...... شور شرابا۔ زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں کی ایک انجمن تھی۔ بزم نو آموز مصنفین...... کھیل کھیل میں ہم ادیب بھی بن گئے، اس انجمن کے کرتا دھرتا بھی ہو گئے۔

سر ظفر اللہ کے بھائی چوہدری عبداللہ حیدر آباد (سندھ) میں ایڈیشنل کلیم کمشنر تھے۔ ان کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ ہم نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ کراچی سے کئی شعراء بلوائے۔ ریلوے اسٹیشن پر چوہدری عبداللہ کی بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں شوکت تھانوی کو لے کر ہم ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا چوہدری صاحب تو ملک سے باہر گئے ہیں۔ لیکن ان کا حکم تھا کہ شوکت تھانوی ان کے گھر ٹھہریں۔ اور ملازمین اس پر عمل کر رہے تھے۔ چوہدری عبداللہ کراچی ہوٹل کے اوپر اپنے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ ایک دن ہم نے وہاں بھیڑ دیکھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا ملازمت کے لیے انٹرویو ہو رہے ہیں۔ ہم نے کبھی ملازمت نہ کی تھی۔ اس دن سوچا چلو یہ بھی کر کے دیکھتے ہیں۔ لیکن انٹرویو دینے والوں نے درخواست بہت پہلے دی تھی۔ انہیں کو بلایا تھا۔ ہم نے جھٹ ایک عرضی لکھی اور کلرک سے کہا...... "چوہدری صاحب نے ہمیں بلایا ہے"۔ اس نے دو چار امیدواروں کے بعد ہمیں اندر بھیج دیا۔ چوہدری عبداللہ اونچی جگہ میز کرسی پر چشمہ لگائے بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا اس لیے سلام کر کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نام پوچھا، تعلیم کے بارے میں سوال کیا۔ اور کہا پڑھنے کے علاوہ کیا کرتے ہو۔ ہم نے کہا "ادیب ہیں لکھنا پڑھنا ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے"۔ ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ مسکرا کر فرمایا "میاں کسی ادبی حلقے میں جاتے ہو......" "ایک حلقہ...... ہم تو شہر کے ہر حلقے میں شامل ہیں۔ بزم ادب کے جوائنٹ

سیکریٹری ہیں۔ بزم نو آموز مصنفین کے صدر ہیں.....'' یہ سن کر وہ اتنے خوش ہوئے کہ ہم نوکر ہو گئے..... چند دن بعد شہر کے سارے ادیب..... شاعر، ادب نواز کلیمز ڈپارٹمنٹ میں آ گئے۔

ہماری پوسٹنگ کلیمز کورٹ نمبر پانچ میں ہوئی۔ ایک دن اچانک ہمارے دفتر میں سلطان جمیل نسیم آ گئے ہم نے پوچھا۔ ''خیریت.....؟'' کہنے لگے ''میرا تقرر اسی دفتر میں ہوا ہے.....'' ہم خوش ہو گئے سلطان جمیل نسیم ہمارے دوست تھے۔ ہمارے منصوبوں میں شامل ہوتے تھے۔ ادیبوں اور ادب میں گھسیٹ کر لے جاتے۔ ان کی وجہ سے ہم بزم ادب کے جوائنٹ سیکریٹری بنے تھے۔ جس نے نوکری دلائی..... اس دن ہم سب کو چائے پلائی اور دفتر بھی ادب کی آماجگاہ بن گیا۔

اُن دنوں ہم سندھ یونیورسٹی میں بی اے آنرز کی شام کی کلاس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور نامی گرامی ہوٹر ہوا کرتے تھے، کالجوں میں مشاعروں اور مذاکروں میں ہوٹنگ ہمارے دم سے قائم تھی۔ اس کے لیے ہم نے بہت سی ترکیبیں استعمال کی تھیں۔ بعض اوقات تو تقریبات کرانے والی پارٹیوں کے مخالفین ہماری خدمات حاصل کرتے۔ جن کا معاوضہ پیٹ بھر کر گرم گلاب جامن اور چائے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے کوئی مشاعرہ ہوٹ نہ کیا ہو۔ بلکہ ایسا لگتا تھا، ہم شاعروں کے ازلی دشمن ہیں۔ شہر کے بیشتر لوگ ہماری اس حرکت سے خفا تھے۔ ہم نے بعض ایسے مشاعروں میں بھی شاعروں پر جملے کس دیے جو نجی طور پر مخصوص حضرات کے گھر منعقد ہوئے تھے۔

رفیع عالم صدیقی، انسپکٹر اسکولز سندھ تھے ان کا دفتر اور گھر ہوم اسٹیڈ ہال پرائمری اسکول میں تھا ان کے گھر پر جو اوپر کی منزل میں تھا ہر مہینے کے پہلے ہفتے کی رات مشاعرہ ہوتا تھا اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اس وجہ سے مشاعرہ دیر تک چلتا رہتا۔ بچارے وہ سارے شاعر جو مختلف مدرسوں میں ملازم تھے۔ اس مشاعرے میں شرکت کرتے تھے ایک بار ہم نے اس کمرے کے دروازے کے باہر سے تالا لگا دیا جس میں مشاعرہ ہو رہا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غریب شاعر کھڑکی کے راستے کود کر نکلے۔ دوسری بار ان سب کے باہر اتارے ہوئے جوتے تھیلے میں ڈال کر لے آئے۔ اس کے بعد منتظم مشاعرہ نے باہر ایک چوکیدار بمعہ ڈنڈا اٹھا دیا۔

مشاعرے کی بو ہم دور سے سونگھ لیا کرتے تھے۔ اور ہماری چنڈال چوکڑی ادھر کا رخ کر لیتی

تھی ہم نے حیدرآباد شہر کے کتنے شاعروں کو مشاعروں سے تائب کیا۔ بعض تو ہمیں سامعین میں دیکھ کر جوتے اٹھا کر اپنی نشست کے پیچھے رکھ لیتے۔ کچھ آتے دو چار شعر سنا کر معذرت کر لیتے۔ کچھ شرفا شیروانی کے بٹن بند کرتے اور غائب ہو جاتے۔ ویسے یہ بات کوئی دل سے نہیں مانتا کہ جہاں ہم نہیں ہوتے تھے اس محفل میں سامعین کو لطف نہیں آتا تھا۔

شہر کے شاعر ہمارے خلاف کوئی محاذ نہ بنا سکے۔ اس لیے کہ باصلاحیت افراد کبھی یکجا نہیں ہو سکتے چناں چہ ہم بچے رہے۔

ایک دن ڈائریکٹر انفارمیشن سندھ سید اشتیاق اظہر کے گھر مشاعرہ تھا۔ ہمیں اطلاع مل گئی مشاعرے سے زیادہ ہمارے لیے ایک اور بات میں کشش تھی کہ شعری نشست سے پہلے حلیم کی دعوت ہے۔ حلیم، نہاری، پائے، چاٹ، دہی بڑے اور اس قسم کی سب چٹ پٹی چیزیں ہماری کمزوری رہی ہیں اس لیے جانے کا پروگرام پکا تھا لیکن یہ ایک نجی محفل تھی اس لیے ہماری پارٹی شامل نہ ہو سکی تھی سلطان جمیل نسیم نے اس مشاعرے کی اطلاع دی تھی۔ انہی کے ساتھ جانا ٹھہرا حلیم اور شاعروں پر حملہ کرنا بڑا کیف آگیں خیال تھا۔ جملے کسنے اور ہوٹ کرنے کے لیے ہمیں کبھی کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اکیلے ہی فوج تھے۔ اس لیے وقت مقررہ پر سلطان جمیل نسیم کے ساتھ سید اشتیاق اظہر کے گھر پہنچے۔ انہوں نے استقبال کیا۔ چشمے کے پیچھے سے عجب نظروں سے دیکھا۔ اکیلا سمجھ کر اور سلطان جمیل نسیم کے ساتھ دیکھ کر قدرے اطمینان کا سانس لیا کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا ہم ایک کونے میں سر جھکا کر جا بیٹھے۔

رات آٹھ بجے حلیم پر حملہ ہوا۔ مرچیں بہت تھیں، کھاتے جاتے، پانی پیتے جاتے، اور آنسو پونچھتے جاتے لیکن دل بھرتا نہ پیٹ...... آخر یہ مرحلہ ختم ہوا۔ مشاعرے کے لیے بڑے کمرے میں فرشی انتظام تھا۔ اس میں جانے لگے تو سلطان جمیل نسیم نے کان میں کہا ''یار میرے پاپا بھی مشاعرے میں پڑھیں گے...... ہم رک گئے...... پہلے بتایا ہوتا......'' ''ذرا تمیز سے بیٹھنا ورنہ میرے پاپا کہیں گے اس کے کیسے دوست ہیں......'' سلطان جمیل نسیم کی بات ہم تو پانی کے گھونٹ کی طرح پی گئے......

ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ سلطان جمیل نسیم جان بوجھ کر ہمارے ساتھ نہیں بیٹھے تاکہ

شاعر انہیں ہمارا ساتھی نہ سمجھیں۔ اور شاید اس خیال سے بھی کہ تنہائی ہمیں دبوچے رکھے گی۔ ہمارا منہ بند رکھے گی۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ پہلے شاعر کے دوسرے شعر پر ہم نے داد دیتے ہوئے کہا "واہ واہ کیا شعر ہے' حضور دوبارہ پڑھیے گا......" تیسرے شاعر کے شعر میں قتل کا ذکر تھا۔ ہم نے جملہ کس دیا "آپ دفعہ ۳۰۲ میں گئے......' ایک اور شاعر پر داد دی "قبلہ اچھے شعر کہا کریں" سات آٹھ شاعر پڑھ چکے تھے۔ ہم کبھی دبی زبان سے کبھی بہانگ دہل...... شاعروں کو داد دیتے رہے جیسے شاعر بھی اور میزبان اشتیاق اظہر بھی ہوٹنگ سمجھ کر ہمیں گھورتے رہے۔ اب وقت آنے والا تھا کہ ہمیں ہاتھ پکڑ کر مشاعرے سے اٹھا دیا جائے کہ سلطان جمیل نسیم کے پاپا پڑھنے آئے۔ ہم جملہ کسنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ سامنے مسند پر بیٹھے پہلے شیروانی کا بٹن بند کیا۔ ایک ہاتھ سے بالوں کی لٹ سلجھائی۔ پھر سامعین کو دیکھا ہماری طرف ایک نظر ڈالی۔ ہم نے سر جھکا لیا۔ سلطان جمیل نسیم کے پاپا تھے۔ انہوں نے پہلا شعر پڑھا مکرر...... مکرر پڑھوایا گیا سامعین جی کھول کر داد دے رہے تھے۔ اس کے بعد دوسرا شعر ہم نے اچھا سا جملہ سوچا...... سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ تیسرا شعر پڑھنے لگے۔ ہر بار سامعین نے واہ واہ سے کمرے کی چھت اڑا دی۔ سلطان جمیل نسیم کے پاپا تین شعر پڑھ چکے تھے اور ہم نے ابھی تک کوئی جملہ نہیں کسا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے......؟ کیا ہم بک گئے......؟ کیا ہوٹنگ سے تائب ہو گئے......؟ کیا سلطان کے پاپا کے رعب میں آ گئے......؟ چوتھے شعر پر ہم پریشان ہو گئے۔ ذرا سا شور کم ہو...... سکون ہو تو ہم ہوٹنگ کریں پانچواں شعر پڑھا گیا:

یوں کر رہے ہیں میری محبت پہ تبصرہ
جیسے وہ کر چکے ہیں محبت کسی کے ساتھ

ہم نے جملہ کسا...... اور ہمارے کانوں نے ایک بیگانہ سی آواز سنی 'واہ...... کیا خوب کہا ہے"

سلطان کے پاپا اس مشاعرے کے آخری شاعر تھے۔ جب ہم اشتیاق اظہر کے گھر سے رات بارہ بجے نکل رہے تھے تو سلطان جمیل نسیم نے شکریہ ادا کیا۔ "یار آج تم نے ہوٹنگ نہ کر کے مجھ سے گلاب جامن جیت لیے......" اور ہم سوچ رہے تھے یہ کیا کیا؟ ایسا کیوں ہوا......؟ پاپا جادوگر تو نہیں......؟ ان دنوں ہم طلسم ہوشربا پڑھا کرتے تھے منیر نیازی سے متاثر تھے۔ اے حمید ہمارا پسندیدہ مصنف تھا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دن کسی مشاعرے میں پوری قوت سے سلطان

کے پاپا پر ہوٹنگ کریں گے۔

زندگی میں ہم نے نشہ کرنے کے سوا سب ہی کچھ کیا ہے، مصوری، موسیقی، افسانہ نگاری، اور پہلوانی...... ہمارا خیال تھا کہ ایک صحت مند جسم میں ایک صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ اس لیے پہلوانی کرنی چاہیے صبح سویرے اٹھ کر دس میل دوڑنا چاہیے۔ ڈنڈ بیٹھک لگانے چاہئیں۔ وزن اٹھانا چاہیے۔ اس لیے صبح چار بجے گھر سے نکلتے۔ ہم نے اس کا تذکرہ سلطان جمیل نسیم سے کیا۔ وہ کہنے لگے جب آپ گھر سے دوڑتے آئیں تو مجھے بھی لے لیں۔ میں بھی پہلوان بننا چاہتا ہوں۔ کتنی ایسی پریشانیاں ہیں جنہیں پچھاڑنا چاہتا ہوں۔ ایک دن سورج نکلنے سے پہلے ان کے گھر پہنچ گئے۔ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں بعد کسی کے زینے اترنے کی آواز آئی۔ ہم خوش ہو گئے سلطان اس درجہ ذمہ دار ہیں کہ ادھر زنجیر بجائی یہ نکل آئے...... دروازہ کھلا تو سامنے سلطان جمیل نسیم کے پاپا ہاتھ میں برتن لیے کھڑے ہیں...... ہمیں دیکھا تو حیران ہوئے...... ہم بھی شرمندہ ہوئے۔

"میں سمجھا دودھ والا آیا ہے" وہ ہنس کر بولے۔

"معاف کیجئے گا آپ کو زحمت ہوئی سلطان جمیل نسیم کو بھیج دیجئے"۔ ہم نے کہا۔

"وہ تو سو رہا ہے...... اٹھاتا ہوں...... تم اندر آ جاؤ......" وہ بولے۔

"جی نہیں...... بس آپ اٹھا دیجئے......" ہم نے تکلف سے کہا۔

"یہاں خنکی ہو رہی ہے...... اندر آ جاؤ......" ہم اندر چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں روشنی کر کے انہوں نے کہا "چائے پیو گے"۔

"جی وہ آپ کے گھر میں" ہم اب حواسوں میں آ چکے تھے۔

چلو پہلے چائے پیتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ہم میز پر رکھا رسالہ دیکھنے لگے۔ ذرا دیر بعد وہ آئے...... ان کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔

"میاں میں نے ایک چمچہ چینی ڈال دی ہے اور ضرورت ہو تو یہ رکھی ہے"۔ وہ بولے۔

"جی نہیں شکریہ......" ہم نے چائے کی چسکی لی ہمیں اچھی لگی۔

"چائے مزیدار ہے......" ہم نے کہا۔

"تیس سال کا تجربہ ہے......" انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

''کیا مطلب...... آپ نے بنائی ہے......''

''ہاں...... اتنی صبح کون اٹھتا ہے...... پہلا کپ میں اپنے ہاتھ سے بنا کر پیتا ہوں...... تم بسکٹ لو......''

''جی نہیں...... شکریہ...... میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی''

''شکریہ...... زحمت کے لفظ استعمال نہ کرو تو اچھا ہے...... تم سلطان کے دوست ہو...... ہمارے بیٹوں کی طرح ہو......''

ہمیں یہ لفظ اچھے لگے۔ فوراً دو بسکٹ لے لیے۔ اتنے میں سلطان جمیل نسیم آنکھیں ملتے آ گئے۔ ہم نے پوچھا 'کیا پروگرام ہے؟' کہنے لگے 'منہ دھو لیں تو چلتے ہیں'۔ ان کے منہ دھونے کپڑے بدلنے اور ایک کپ چائے پینے میں اتنا وقت ہو گیا کہ آگے جانے کے بجائے واپس گھر آنا پڑا۔ اس کے بعد روز کا معمول ہو گیا۔ ہم روز جاتے۔ پاپا کے ساتھ چائے پیتے اور لوٹ آتے۔ ہفتہ بھر تک ہم سلطان کے پاپا کے ساتھ چائے پیتے رہے۔ وہ باتوں باتوں میں ہمیں ایسے گر بتا دیتے جو زندگی اور زمانے سے لڑنے کے لیے اب کام آ رہے ہیں۔ ایک دن چائے پیتے ہوئے انہوں نے ہم سے پوچھا۔

''پڑھنے کے علاوہ اور کیا کرتے ہو......؟''

''ہوٹنگ''

''عادت بنالو......'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی......!'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہوٹنگ کرنا عادت بنالو...... '' زندگی میں کبھی ایسے حالات سے واسطہ پڑے جو بعض اشعار کی طرح اچھے نہ لگیں تب یہ عادت کام آئے گی''۔

پھر عجیب اتفاق ہوا جس مشاعرے میں سلطان کے پاپا شرکت کرتے۔ ہم کسی وجہ سے نہ جا سکتے۔ شہر سے باہر ہوتے اطلاع نہ ملتی۔ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی۔ ہم بیمار ہوتے یا کوئی عزیز۔ ایک دن خبر ملی کہ سلطان کے پاپا نے اردو سندھی مشاعرہ منعقد کیا ہے۔ ہم نے شرکت کا منصوبہ بنایا لیکن وہ نواب شاہ میں تھا۔ ہم مباحثے میں شرکت کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے لاہور

جا رہے تھے۔ پھر مشاعرہ میر پور خاص میں ہوا۔ حیدر آباد میں اردو سندھی کے مشترکہ شاعروں میں ڈاکٹر ابراہیم خلیل، منظور نقوی، جوش حیدر آبادی، سرور حیدر آبادی یہ سب سندھی زبان کے شاعر تھے مگر اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ''بزم خلیل'' کے صدر سلطان کے پاپا تھے۔ زبان کے ساتھ ساتھ نزدیکیاں اور محبتیں بڑھ رہی تھیں۔ اردو شعراء سندھی میں اور سندھی شاعر اردو میں شعر کہنے لگے تھے۔ سلطان اپنے پاپا کے عاشق تھے۔ ان کی شاعری پر فریفتہ تھے۔ ایک شعر:

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

انہوں نے اردو کے تمام شاعروں، ناقدوں، ادیبوں کو رائے کے لیے بھیجا۔ پھر وہ خوش ہو کر بتانے لگے۔ جوش ملیح آبادی کی رائے آئی ہے پڑھو...... فراق گورکھپوری نے خط لکھا...... جگر مراد آبادی کا خط سنانے لگے۔ ان کے ساتھ ہم خوش ہوتے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ نقادوں، ادیبوں نے اس شعر پر جو نکتے نکالے پڑھ کر شاید سلطان کے پاپا بھی حیران ہوئے ہوں گے۔

وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ موسم بدلتے ہیں۔ بارشیں برسا کر بادل جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ پھول شاخوں سے جدا ہو کر ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں......؟ پھر اچانک یونیورسٹی کے در و دیوار اجنبی ہو جاتے ہیں۔ یہی ہوا ایک صبح موسم بدل گیا تھا...... دوست احباب، جملہ باز سب جدا ہو گئے۔ بچھڑ گئے، غم زدوں کے حوالے کر کے چلے گئے۔ ہم ملازمت کرنے کراچی آ گئے سلطان بھی ہجرت کر گئے۔ ان کے پاپا بھی اس شہر میں آ گئے۔ پھر انہوں نے دنیا کا سب سے مشکل کام کیا۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے۔ یہ ایک وقت طلب کام تھا۔ ہمیں حیرانی ہوئی وہ اس میں کامیاب رہے اس زمانے میں ایک روز ان سے ملاقات ہوئی۔ ''اخاہ قمر میاں ہیں'' کہہ کر انہوں نے جس محبت سے گلے لگایا اور جس طرح مسکرا کر باتیں کرتے رہے ہمیں معلوم ہو گیا کہ ان کے لیے کوئی کام وقت طلب نہیں ہے۔ ہر مشکل کو مسکرا کر اپنے خلوص کا اظہار کر کے آسانی میں بدل دیتے ہیں۔

کچھ وقت کا پہیہ چل پڑا۔ ہم لاہور چلے گئے۔ راولپنڈی گئے۔ ایک دن والد نے بچے سے بڑا کر دیا۔ پھر والدہ نے دنیا کے حوالے کر دیا۔ جب وہ دونوں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئے تو ہم نے

سفر کی ٹھانی۔ کوئٹہ تبادلہ ہوا۔ کراچی بھیجا گیا۔ راولپنڈی بلایا۔ حیدرآباد کے احکامات دیے گئے۔ ہم نے بنجاروں کی زندگی اپنائی۔ بستیاں نزدیک آتیں۔ دور چلی جاتیں۔ آخر کراچی آئے۔ بچھڑے ہوئے ملے۔ ایک دوست کو دیکھا بالوں میں سفیدی لیے، آنکھوں پر چشمہ سجائے یہ کون ہے۔ یہ سلطان جمیل نسیم ہیں۔ اچھا۔ ہاں۔ اور اب سلطان جمیل نسیم بڑے افسانہ نگار بن گئے تھے۔ ۱۹۷۳ء کا موسم ہے۔ ہم نے گھر بسالیا۔ تھک گئے تھے۔ آرام چاہیے تھا۔ سلطان جمیل نسیم نے تجدید ملاقات کے لیے اپنے گھر بلایا۔ پھولوں سے سجے سے، پودوں سے بھرا گھر، ڈرائنگ روم میں موہن جودوڑو کی طرز کا صوف...... اور وہاں سفید بالوں والا ایک شفیق چہرہ...... سلطان کے پاپا...... کتنے برسوں کے بعد دیکھا...... اپنے لڑکپن اور ان کی جوانی کے دن...... اب وہ بوڑھے ہو گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے۔ ان کی خوشی پہلے کی طرح جوان تھی۔ وہی گرمجوشی تھی۔ وہی اپنائیت وہی محبت...... ایسا لگا جیسے ہمیں کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی۔ لہجے میں توانائی تھی صرف جسم بوڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب 'اوراق گل' عنایت کی۔ ہمارے لیے یہ بڑا تحفہ تھا۔

وہ شاعر جس پر ہم نے کبھی ہوٹنگ کرنے کے بارے میں سوچا تھا اور اپنا سامنہ لے کر چلے گئے، وہ شاعر ہمارے سامنے تھا۔ اپنے چہرے اور اپنے لہجے میں سچی محبتوں کی روشنی اور چاشنی لیے۔ ہم سوچ رہے تھے۔ سچے جذبے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ محبت پر ماہ وسال کا اثر نہیں ہوتا۔ چاہتیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ اور شاعر...... اصل...... سچا شاعر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا...... ''اوراق گل' میں ان کی فکر کا شباب دیکھ کر یہی احساس ہوا۔ ان کے خیالات کی تروتازگی نے ہمیں بھی ایک توانائی کا احساس بخشا۔

ہم اب تک ان کو سلطان کے پاپا سمجھتے اور کہتے رہے تھے۔ اب جو ملاقات ہوئی بلکہ ملاقاتیں ہوئیں تو وہ ہمارے بھی پاپا بن گئے۔ پوری ایک نسل کے بلکہ نسلوں کے پاپا۔ ان کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ لفظوں کے مکانوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم ان کے سامنے بچے تھے لفظ ان کی انگلی پکڑ کر چلتے تھے۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات...... لفظوں میں محبت اور لفظوں سے محبت...... زندگی بھر انہوں نے محبت کے ہنر سکھائے۔ اس لیے کہ محبت کو ہنر بنالیا تھا۔

جب کبھی وہ ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آتے تو ضرور ملاقات ہوتی۔ مختصر ملاقات میں اتنی ڈھیر ساری محبت وہ نچھاور کر جاتے کہ اسے سمیٹنے میں دن لگتے...... ٹیلی ویژن کے مشاعرے میں ہم ان کو دیکھ لیتے۔ جسم کی ناتوانی کو آواز کی توانائی اس طرح چھپا لیتی جیسے گھٹا چاند کو...... ان کا نام ہی بڑا نہیں کام بھی بڑا تھا۔ ان کی ستر سال کی ادبی زندگی کا بیان تو شاید ہزاروں صفحوں میں سمٹ جائے مگر وہ جوان کا اخلاص تھا...... محبت تھی...... بے نیازی تھی۔ درویشی تھی وہ ستر ہزار صفحوں میں بھی سمیٹی نہیں جا سکتی۔

ایک حیرت انگیز بات اور...... لفظوں کی انگلی پکڑ کر چلنے والا۔ لفظوں کے کھلونوں سے کھیلنے والا۔ کھیلوں کا بھی رسیا تھا۔ کوئی میچ ہوٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے تو نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ریڈیو پر کمنٹری نشر ہو رہی ہے تو کان لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر ایسا کوئی کھیل نہیں ہے تو شطرنج کی بساط بچھائے کسی شاطر کے ساتھ بازی جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ بھی نہیں تو اکیلے لیٹے تاش کھیل رہے ہیں۔

میری تنہائی فراق میں ہے
صرف میری ہی سانس کی آواز
اور یہ سانس کی آواز......؟

اٹھائیس اکتوبر ۱۹۹۱ء کی شام کو معمول کے مطابق سلطان جمیل نسیم کو ٹیلی فون کیا۔ اطلاع ملی کہ اسلام آباد گئے ہیں۔ پاپا کی طبیعت خراب ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ بیمار ہوئے تھے۔ آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ دو چار دن اسپتال میں گزارے۔ مسیحا سے تندرستی کی نوید سن گھر آ گئے...... ہمیں امید تھی وہ اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ ہم ان کے خلوص کی حدت میں گرم ہونے والے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ ان کی توانائی سے بھرپور محبت میں ڈوبی آواز سنیں گے۔ اور ان کی نئی کتاب 'نبات' ان کے دستخطوں سے لیں گے۔ یہی ایک ایسی کتاب ہے جو میں نے سلطان جمیل نسیم کو واپس کر دی تھی...... کسی دن آئیں گے تو پاپا کے دستخطوں کے ساتھ لیں گے"۔

تیس اکتوبر...... صبح سات بجے فون کی گھنٹی بجی۔ ہم چونک گئے۔ اتنی صبح فون کی گھنٹی ہمیشہ خطرہ کا اعلان ہوتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا۔ سلطان جمیل نسیم کے صاحبزادے تھے۔ انہوں

نے رک رک کر بتایا۔ "ابو آج بارہ بجے کی پرواز سے واپس آ رہے ہیں......"

"پپا کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ نہیں رہے"

پھر ہم نے کیا پوچھا۔ کیا جواب ملا کچھ خبر نہیں۔

اردو ادب کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا۔

اکتیس اکتوبر ۱۹۹۱ء کی صبح، جمعرات کا دن، دس بجے کا وقت، سخی حسن کے قبرستان میں سلطان جمیل نسیم کے پاپا کو ابدی آرام گاہ مل گئی۔ وہ شخص جو شعر کہتا تھا جسے زمانہ صبا اکبر آبادی کے نام سے جانتا تھا، اس نے فانی جسم چھوڑ کر وقت کا حصار توڑ دیا۔ ہم گواہ ہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں صبا صاحب اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی اردو سن سکتا ہے۔ پڑھ سکتا ہے، بول سکتا ہے، اور یہ اعزاز کسی کو صدیوں میں حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ صدی ہمارے اور سلطان جمیل نسیم کے پاپا کی صدی ہے۔ صبا اکبر آبادی کی صدی ہے۔

بقیہ منزلِ فیض

لیے دلیپ کمار، راجکپور، دیو آنند، امیتابھ بچن، (ہندی کوی ہری ونش رائے بچن کے صاحبزادے) وغیرہ سب ہی آئے۔ پابلو نرودا اور ناظم حکمت ان کے ذاتی دوست تھے۔ یاسر عرفات (جو انہیں فائز احمد فائز کہتے تھے) بھی ان کے قریب تھے۔ ایوب دور میں الطاف گوہر کی وجہ سے فیض صاحب کے ساتھ نرمی برتی گئی۔ انہیں لینن انعام لینے دیا گیا۔ مگر اندر اندر وہ مایوس ہو چکے تھے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے موقع پر بھی وہ کوئی بھرپور چیز پیش نہیں کر سکے۔ وہ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ بھٹو دور میں انہوں نے کچھ کام کیا اور بھٹو صاحب کو اشارتاً خبردار بھی کیا کہ تمہارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے ہوش کے ناخن لو لیکن وہ 'سوشلسٹ وڈیرہ' کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ منزل فیض ابھی تک ایک خواب ہے۔ یہاں میں اپنا ایک شعر پیش کروں گا۔

راہ میں لوٹے گئے یا لٹ گئے منزل پہ ہم
الاماں کیسی مروت رہزن و رہبر میں ہے!
(تشنہ)

شاید پاکستانی قوم کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ راستے میں بھی لٹے اور منزل پر بھی لٹے۔

فضہ پروین

ڈاکٹر وزیر آغا

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

عالمی شہرت کے حامل مایہ ناز پاکستانی ادیب، دانشور، نقاد، محقق اور انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا نے دائمی ترک رفاقت کی۔ اور زینۂ ہستی سے اتر کر عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب رخت سفر باندھ لیا۔ ان کی وفات پر ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار ہے۔ وہ سراپا خلوص و مروت اور انسانی ہمدردی کا پیکر تھے۔ انسانیت کے وقار اور سربلندی کو وہ دل و جان سے عزیز رکھتے اور بنیادی انسانی حقوق کے وہ بہت بڑے محافظ خیال کیے جاتے تھے۔ وہ سلطانیٔ جمہور کے زبردست حامی اور حریت فکر و عمل کے مجاہد تھے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے انھوں نے جو فعال اور تاریخی کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تاریخ ہر دور میں ان کے نام کی تعظیم کرے گی۔ وطن اور اہل وطن سے والہانہ محبت کرنے والے اس ابد آشنا فاضل کی وفات پر دنیا بھر میں صف ماتم بچھ گئی۔

برس گیا بہ خرابات آرزو تیرا غم   قدح قدح تیری یادیں سبو سبو تیرا غم

18 مئی 1922 کو پنجاب پاکستان کے ایک ضلع سرگودھا کی گاؤں وزیر کوٹ سے طلوع ہونے والا آفتاب جس نے اکناف عالم کا گوشہ گوشہ منور کیا۔ ستمبر 2010 کی شام کو غروب ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی المناک وفات نے اردو تنقید کو مفلس اور قلاش کر دیا ہے۔ وہ ایک کثیر الجہتی شخصیت تھے۔ ان کے متنوع اسلوب کا ایک عالم معترف تھا۔ انھوں نے اردو نثر، اردو شاعری، اردو انشائیہ، سوانح نگاری، تحقیق، تنقید اور تاریخ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ دنیا بھر میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک باکمال ادیب لازوال تخلیق کار، بے مثال

اردو انشائیہ، سوانح نگاری، تحقیق، تنقید اور تاریخ میں وہ کار ہائے نمایاں انجام دیے کہ دنیا بھر میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک باکمال ادیب لازوال تخلیق کار، بے مثال دانش ور، نابغہ روزگار نقاد، حریت فکر کے مجاہد اور عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی ثروت میں جو بے پناہ اضافہ کیا۔ وہ تاریخ ادب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے تمام وسایل اور عمر عزیز وقف کر رکھی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ پرورش لوح و قلم کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

آلام روزگار کے مہیب بگولوں میں بھی انھوں نے حریت ضمیر سے جینے کے لیے اسوۂ شبیر کو اپناتے ہوئے حریت فکر و عمل کا علم بلند رکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق فارسی بولنے والے ایرانی النسل قزلباش خاندان سے تھا۔ ان کے والد کا آبائی پیشہ تجارت تھا اور وہ گھوڑوں کی تجارت سے روزی کماتے تھے جب پورا برصغیر برطانیہ کی نو آبادی تھی تو اس دوران میں ڈاکٹر وزیر آغا کے والد کو برصغیر کے برطانوی حکمرانوں کی طرف سے 1750 ایکڑ (3.0 Km2) پر مشتمل ایک جاگیر عطا کی گئی یہ جاگیر ضلع سرگودھا میں وزیر کوٹ قصبہ میں اب بھی ان کے ورثا کی تحویل میں ہے اور یہاں کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے فارسی زبان اپنے والد سے سیکھی اور پنجابی ان کی مادری زبان تھی۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے انھوں نے انگریزی زبان کی استعداد اپنے انگریزی بولنے والے احباب سے گہرے ربط اور تبادلہ خیال اور وسیع مطالعہ کے ذریعے حاصل کی۔ انگریزی زبان و ادب پر انھیں کامل دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے دریدا، رولاں بارتھ، سوسئیر اور لاکاں کا عمیق مطالعہ کیا اور ان کے خیالات پر اپنے مدلل دلائل سے اردو تنقید کا دامن متنوع نظریات سے مالا مال کر دیا۔

زمانہ طالب علمی ہی سے انھیں عالمی ادبیات اور شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے عالمی کلاسیک کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ان کے خیالات سے بھرپور استفادہ کر کے اردو ادب کو دھنک رنگ مناظر سے مزین کر دیا۔ پنجابی کلاسیکی شاعری سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ جھنگ میں قیام کے دوران میں انھیں حضرت سلطان باہو کی شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ابیات باہو کا مطالعہ کیا اور سلطان باہو کے کئی بیت انھیں زبانی یاد تھے۔ یہ بیت سن کر تو وہ فرط عقیدت سے

اشکبار ہو جاتے اور آنسو ضبط کرنا محال ہو جاتا۔

ع تاڑی مار اڈا نہ سانوں اسیں آپے اڈن ہارے ہو

اپنے آبائی گاؤں سے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا نے تاریخی مادر علمی گورنمنٹ کالج جھنگ میں انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخلہ لیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گورنمنٹ کالج جھنگ محض درسگاہ نہیں بلکہ یہ تو ایک درگاہ ہے جہاں قسمت نوع بشر تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہاں حاضری دینے والے گوہر مراد پاتے ہیں اور یہاں ذرے کو آفتاب بننے کے بے شمار مواقع میسر ہیں۔ جو اس ادارے کی عظمت کا معترف نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں ڈاکٹر وزیر آغا کو نابغہ روزگار اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہ جن اساتذہ کا نام بڑی عزت واحترام سے لیتے تھے ان میں رانا عبدالحمید خان، سی۔ ایم صادق، ایم۔ اے خان، غلام رسول شوق اور ڈاکٹر نذیر احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ آفتاب و ماہتاب ہیں جن کے افکار کی ضیا پاشیوں نے اذہان کی تطہیر و تنویر کا نہایت موثر اہتمام کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم جماعت پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنس دان) بھی تھے۔ سردار باقر علی خان بھی ان کے ہم جماعت تھے۔ سردار باقر علی خان بعد میں انڈین سول سروس کے امتحان میں اول آئے اور ملتان کے کمشنر مقرر ہوئے۔ ان کی یادوں کا مسودہ "قصہ ایک درویش کا" ان کے آبائی گھر واقع منگھیانہ تحصیل جھنگ موجود ہے اس میں انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی تمام یادیں قلم بند کی ہیں۔

گورنمنٹ کالج جھنگ کے علمی ادبی ماحول نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی ذوق کو صیقل کیا اور وہ اس کالج کے علمی و ادبی مجلے چناب کے مدیر معلم منتخب ہو گئے۔ یہ انتخاب مقابل مضمون نویسی میں اول آنے کی بدولت وہ جیتے۔ اس سے ان کی خداداد ذہانت اور تخلیقی استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں "چناب" نے یادگار اشاعتوں کا اہتمام کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ادبی نشستوں کا اہتمام کیا۔ شام کو منعقد ہونے والی ان ادبی نشستوں میں اس وقت کے ممتاز ادیبوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ان میں سید جعفر طاہر، مجید امجد، شیر افضل جعفری، کبیر انور جعفری، صاحبزادہ رفعت سلطان، سید مظفر علی ظفر، خادم مگھیانوی، الحاج سید غلام بھیک

محفلوں کی روح رواں تھے۔ زمانہ لاکھ ترقی کرے ایسی ہستیاں اب دنیا میں کہاں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

گورنمنٹ کالج جھنگ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے اور معاشیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1953 میں ان کی کتاب "مسرت کی تلاش میں" منظر عام پر آئی۔ 1956 میں انھوں نے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1960 میں ان کی ادبی زندگی کا درخشاں دور شروع ہوا جب وہ مولانا صلاح الدین احمد کے رجحان ساز ادبی مجلے "ادبی دنیا" کے مدیر معاون مقرر ہوئے۔ وہ مسلسل تین سال تک اس ممتاز ادبی مجلے کے ساتھ وابستہ رہے اور مولانا صلاح الدین احمد سے اکتساب فیض کیا۔ 1965 میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنا الگ ادبی مجلہ "اوراق" شائع کیا۔ اوراق کی اشاعت سے ان کی تخلیقی، تنقیدی اور تجزیاتی آرا کھل کر سامنے آتی چلی گئیں۔ اس ادبی مجلے کو عالمی سطح پر خوب پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس ادبی مجلے نے مسلسل چار عشروں تک فروغ علم و ادب کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کا پوری دنیا میں اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات سے چند برس قبل اس مجلے کی اشاعت تعطل کا شکار ہو گئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی علالت کے باعث "اوراق" عارضی تعطل کا شکار ہوا مگر اب ان کی وفات کے بعد یہ روشن ستارہ بھی گہنا گیا ہے اب "اوراق" تاریخ کے ان طوماروں میں دب گیا ہے جہاں پہلے سے افکار، نقوش، ادبی دنیا اور تہذیب الاخلاق پہلے سے موجود ہیں۔ ایسے مجلات جن کی ضیا پاشیوں سے سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے میں مدد ملی اب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ آفتاب و ماہتاب جو افق علم و ادب پر نصف صدی سے زائد عرصے تک اپنی تابانیاں بکھیرتے رہے اب گہنا چکے ہیں۔ ایسے دانائے راز اب کہاں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

ڈاکٹر وزیر آغا کی ابتدائی نظمیں 1948 میں جب مولانا صلاح الدین کے ادبی مجلے "ادبی دنیا" میں شائع ہوئیں تو ممتاز ادیبوں نے انھیں بہت سراہا اور ان کے کلام کو بہت پذیرائی

حاصل ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب وہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں زیر تعلیم تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو تنقید اور تحقیق کو مقاصد کی رفعت میں ہمدوش ثریا کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" میں ان کے اہم تحقیقی مقالات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف میں ان کی شمولیت سے اس گراں قدر تصنیف کی ثقاہت کا ایک عالم معترف ہو گیا۔ ان کے والد وسعت علی خان نے جب انھیں گورنمنٹ ہائی سکول لالیاں تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ (پنجاب پاکستان) میں ابتدائی کلاسز میں داخل کرایا تو اس وقت سے جھنگ شہر سدا رنگ کی علمی و ادبی روایات سے وابستہ ہو گئے۔ میاں صدیق لالی سے ان کی شناسائی اس عرصے میں ہوئی۔ اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی تربیت میں جھنگ کی ممتاز ادبی شخصیات کا نمایاں حصہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ساٹھ کے قریب وقیع تصانیف ہیں۔ انھوں نے تمام عمر علم و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ اپنے آبائی پیشہ زراعت کے علاوہ باقی وقت کتابیں ان کا چمن ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تصانیف کو علمی ادبی حلقوں میں جو شرف قبولیت نصیب ہوا وہ تاریخ ادب کا ایک درخشاں باب ہے۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح   1958

۲۔ تخلیقی عمل   1970

۳۔ اردو شاعری کا مزاج   1965

۴۔ تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں   1977

۵۔ مجید امجد کی داستان محبت   1991

۶۔ غالب کا ذوق تماشا   1997

۷۔ نظم جدید کی کروٹیں   1963

۸۔ تنقید اور احتساب   1968

۹۔ نئے مقالات   1972

۱۰۔ نئے تناظر   1979

maablib.org

۱۱۔ تخلیقی عمل اور تناظر 1998
۱۲۔ تنقید اور مجلسی تنقید 1976
۱۳۔ دائرے اور لکیریں 1986
۱۴۔ تنقید اور جدید اردو تنقید 1989
۱۵۔ انشائیہ کے خدوخال 1990
۱۶۔ ساختیات اور سائنس 1991
۱۷۔ دستک اس دروازے پر 1994
۱۸۔ امتزاجی تنقید اور سائنس فکری تناظر 2006
۱۹۔ شام کی منڈیر سے (خودنوشت)
۲۰۔ شام اور سائے (شاعری)
۲۱۔ دن کا زرد پہاڑ (شاعری)
۲۲۔ نروان (غزلیں)
۲۳۔ آدھی صدی کے بعد (شاعری)
۲۵۔ خیال پارے (انشائیے)
۲۶۔ چوری سے یاری تک (انشائیے)
۲۷۔ دوسرا کنارہ (انشائیے)
۲۸۔ شام دوستاں آباد (خاکے)

ڈاکٹر وزیر آغا نے آزادیِ اظہار کو انسانی آزادی سے تعبیر کرتے تمام عمر عجز و انکسار، استغنا، قناعت اور استقامت کا ارفع ترین معیار قائم رکھا۔ ان کی تخلیقی فعالیت اس حقیقت کی مظہر ہے کہ دل کی آزادی ہی ان کے لیے شہنشاہی کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ در قیصر و کسریٰ کو کھنڈر سمجھتے تھے اور انھوں نے کبھی کسی فرعون، نمرود، ہلاکو خان یا آسو بلا خان کے جعلی جاہ و جلال اور کر و فر کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔ ان کی شاعری میں صبر و استقامت کی درخشاں مثالیں ہر دور میں دلوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا کرتی رہیں گی۔ زندگی اور اس کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی کرنا کس کے بس میں ہے؟ خالق

کائنات نے انسان کو اس وسیع و عریض دنیا میں بھیج کر سعی پیہم کے لیے ایک میدان عمل کا تعین کر دیا ہے۔ فرصت زندگی اگرچہ بہت کم ہے مگر جو دم بھی میسر ہے وہی مغتنم خیال کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں ہوس زر نے انسانیت کو ناقابل اندمال صدمات سے دوچار کر دیا ہے۔ بے حسی کا عفریت چاروں جانب منڈلا رہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں خلوص اور دردمندی، قوی مشاہدہ، آفاقی اور کائناتی انداز فکر، متنوع تجربات اور دلدوز مشاہدات کے جو کرشمے موجود ہیں وہی ہمیں میراجی، مجید امجد اور فیض احمد فیض کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے ان شعرا کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان سے یقیناً اثرات قبول کیے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں دروں بینی کی جو کیفیت ہے وہ تخلیق کے لاشعوری محرکات کی غماز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صریر خامہ نے نوائے سروش کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ کلام دلوں کو مرکز مہر و وفا کرنے کا موثر وسیلہ بن جاتا ہے۔

جبین سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا میں رہگذر تھا مجھے روند کے زمانہ گیا

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم نگاری سے اردو نظم کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان کی بات دل سے نکلتی اور سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ قلب اور روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی کے معجز نما اثر سے وہ اپنی شاعری کو کمال خلوص اور دردمندی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب ان کی ذات ہے۔ یہ اسلوب اس قدر منفرد اور دلکش ہے کہ شاعری دراصل ساحری کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور قاری اس کے ہمہ گیر اثرات کی بدولت مسحور ہو جاتا ہے۔ تاثیر اور وجدان کی یہ کیفیت ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔

ٹین کی چھت پر اپنے اجلے پر پھیلا تھا
آنے والی سرخ رتوں کے بھاگوں میں جب کھو جائے گا
سب آوازیں تھم جائیں گی

پلکیں تھک کر سو جائیں گی

گئے دنوں کا نام منوں مٹی کے نیچے دب جائے گا

سب آوازیں تھم جائیں گی

پلکیں تھک کر سو جائیں گی

گئے دنوں کا نام منوں مٹی کے نیچے دب جائے گا

اگلا ساون کب آئے گا؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ ہماری آنکھیں یاد رفتگاں میں ساون کے بادلوں کی طرح برستی رہیں گی، ہم قلزم خوں پار کر جائیں گے، ہم زینۂ ہستی سے اتر جائیں گے مگر جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ان کے ہمراہ اگلا ساون دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ اجل کے ہاتھوں جو گھاؤ لگتے ہیں وہ دردلا دوا دے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے علامت کو ایک ایسے نفسیاتی کل کا روپ عطا کر دیا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے کر خواب غفلت سے جگانے کی صلاحیت سے متمتع ہے۔ چاند چہرے شب فرقت پہ وار کے آفتاب و ماہتاب لحد میں اتار کے دامن جھاڑ کے ہم بے بسی کے عالم میں اپنے سونے آنگن میں حسرت و یاس کی تصویر بنے بیٹھے ہوتے ہیں مگر اگلا ساون اب کبھی نہیں آئے گا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو نظم کو نئے امکانات سے آشنا کیا۔ ان کی نظمیں ان کے وسیع مطالعہ اور آفاقی انداز فکر کی آئینہ دار ہیں مثال کے طور پر ان کی نظم "آدھی صدی کے بعد" سیل زماں کے تھپیڑوں کا حقیقی احوال بیان کرتی ہے جن کی زد میں آ کر نظام کہنہ اور تخت و کلاہ و تاج کے سب سلسلے خس و خاشاک کے مانند بہہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اپنی نظم "ایک کتھا انوکھی" میں انھوں نے زندگی کی حقیقی

معنویت کے بارے میں نہایت خلوص اور دردمندی سے مثبت شعور اور آگہی پروان چڑھانے کی مستحسن سعی کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے آزاد نظم اور نثری نظم میں بھی خوب طبع آزمائی کی اور زبان و بیان اور اسلوب پر اپنی خلاقانہ دسترس کا لوہا منوایا۔ ان کی نظم "دن ڈھل چکا تھا" غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے یہ نظم اسلوب اور ڈسکورس کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا	سارا بدن لہو کا رواں مشت پر میں تھا

جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل	چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

حد افق پہ شام تھی خیمے میں منتظر	آنسو کا اک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا

لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا	کل تک جو ایک کوہ گراں رہگزر میں تھا

پاگل سی اک صدا کسی اجڑے مکاں میں تھی	کھڑکی میں اک چراغ بھری دوپہر میں تھا

اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ پوش	سورج کا اک گلاب سا طشت سحر میں تھا

اکادمی ادبیات پاکستان نے معماران ادب پر کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت، اسلوب اور علمی و ادبی خدمات پر ایک جامع کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس یگانۂ روزگار دانشور کو خراج تحسین پیش کر کے پاکستانی ادبیات کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے فروغ علم و ادب کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں 1995 میں اکادمی ادبیات پاکستان کا تاحیات رکن مقرر کیا۔ پاکستان میں ادیبوں کی فلاح و بہبود کے متعدد منصوبے ڈاکٹر وزیر آغا نے تجویز کیے۔ اس وقت پاکستان کے تمام ادیبوں کی انشورنس کی جس سکیم پر عمل جاری ہے ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار اس کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ 7 ستمبر 2010 کی شام جب ڈاکٹر وزیر آغا نے لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا تو ان کا جسد خاکی ان کے آبائی گاؤں وزیر کوٹ لایا گیا جہاں انھیں ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں اردو ادب کا ایک درخشاں باب اختتام کو پہنچا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم	تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ماہنامہ تخلیق (لاہور)
مدیر اظہر جاوید
پتہ: بھگوان اسٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

صدف تبسم

جوش کی خاکہ نگاری

(یادوں کی بارات کے آئینے میں)

خاکہ کے لغوی معنی ہیں "وہ نقشہ جو حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے، ڈھانچہ، چربہ" اور خاکہ اتارنا بمعنی "کیا نقشہ کھینچنا" short account or discription،(sketch)۔ خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں مدح سرائی کے بجائے کسی شخصیت کے سیرت و کردار کے اہم پہلوؤں اور اس کے خدو خال کو نمایاں کیا جاتا ہے دراصل خاکہ نگاری ایک فن ہے، مرقع سازی اور شخصیت کی ترجمانی کا۔ یہ خاکہ نگار کے زبان و بیان کی قدرت ہے اور اس کی جادو بیانی ہے کہ وہ شخصیت زندہ جاوید ہو جائے۔ خاکہ نگاری میں افراط وتفریط، غلو اور مدحت طرازی سے کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ جو شخصیت جیسی ظاہر ہوتی ہے بعین وعن اس کو اسی طرح ادبی پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہ خاکہ نگار کا کمال ہے کہ وہ شخصیت کی ایسی بھرپور عکاسی کرے کہ پڑھنے والوں کے سامنے ایک تصویر ابھر آئے، پھر اگر اسے زبان پہ قدرت ہو تو اس کی تحریر میں چار چاند لگ جائیں گے۔

خاکہ نگاری دراصل تاریخ یا سوانح نگاری سے الگ چیز ہے کیوں کہ تاریخ شخصیت کے کارناموں سے بحث کرتی ہے اور سوانح نگاری شخصیت کی سوانح عمری ہوتی ہے جبکہ خاکہ نگاری میں شخصیت کی جھلک منعکس ہوتی ہے۔

بقول ڈاکٹر وقار احمد رضوی:

"خاکہ ۔۔۔ کسی بھی شخصیت کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہے۔"

خاکہ حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے یہ شخصیت کی خوبیاں یا خامیاں دکھانے کے لیے نہیں لکھا جاتا، ودر حقیقت یہ ایک ایسا فن ہے جس میں شخصیت کی نگری یا عملی زندگی کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی خارجی اور داخلی دونوں جہتیں خاکے میں سمو جائیں، اس کو پڑھ کر قاری کبھی زیر لب مسکراتا ہے اور کبھی احساس کی شدت سے متاثر ہوتا ہے یہ شخصیت کی زندگی کے نجی اور فتری حالات کو بلاکم وکاست بیان کر دیتا ہے اردو ادب میں خاکہ نگاری بیسویں صدی کا کارنامہ ہے لیکن قدیم اردو تذکروں سے بجا طور پر خاکہ نگاری کے آغاز کی کڑیاں ملائی جاسکتی ہیں لیکن یہ توقعات صرف تذکروں سے پوری نہیں ہوتیں کیوں کہ ان میں شخصیت کا حال بیان کرنے سے زیادہ ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ انتخاب کرنے پر توجہ دی گئی ہے۔ تذکروں کے علاوہ شاعری میں بھی ہمیں ایسے مرقع نظر آتے ہیں لیکن زیادہ توجہ محبوب کے سراپے پر دی جاتی ہے نہ کہ ان محاسن پر جن سے شخصیت کا خاکہ نمایاں ہو۔۔۔ مثال کے طور پر:

ہرن کی آنکھ چیتے کی کمر ہے
مرا محبوب پورا جانور ہے

سراپا کھینچنے کا یہ کیسا انوکھا انداز ہے۔۔۔! لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیس و دبیر کے مراثی میں امام حسینؓ اور ان کے رفقاء کی سیرت کا بیان میں اُن کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے پھر تذکروں میں ہمیں چیدہ چیدہ ایسے مرقعے نظر آتے ہیں جنھیں ہم خاکہ نگاری کی اساس قرار دے سکتے ہیں ۔اس کے علاوہ سوانح عمریاں مثلاً حیات سعدی، الفاروق، المامون وغیرہ ان سے زندگی کے حالات اور کوششیں تو ابھرتی ہیں لیکن خاکہ کا بنیادی حق ادا نہیں ہوتا لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت زندہ ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتی سب سے زیادہ کوتاہی یہ ہے کہ اکثر تذکرہ نگار صاف جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ لیکن "آب حیات" سے تذکروں میں شخصی خاکہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ دراصل ان تذکروں میں بعض ایسے مرقع سامنے آتے ہیں جو خاکہ نگاری کا رنگ لیے ہوئے ہیں مثلاً آزاد نے شعراء کا حلیہ جزوی تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے اور اس طرز سے ان کی لفظی تصویریں بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً میر ضاحک کی تصویر ملاحظہ ہو:

"میر صاحب موصوف نہایت خوش طبع، خوش مزاج، خندہ جبیں، ہنسنے ہنسانے والے

"یادوں کی بارات" اردو کی ایک اہم کتاب ہے کیوں کہ اس میں ایک ایسے تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا عکس ہے جو ہمارا ادبی اور تاریخی ورثہ ہے۔ اس تحریر میں ہمیں وادیٔ گنگ و جمن اور سر زمین دکن کے قدیم و جدید معاشرے کی خوش نما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنف نے اپنے ایام طفلی و جوانی کو، خوش حال طبقوں کی سماجی قدروں کو، ان طبقوں کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز کو، ان کے عقیدوں اور توہمات کو، ان کے شوق اور مشغلوں پر ان کے تہواروں، رہن سہن اور رسم و رواج کو بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جوش صاحب ۱۸۹۶ء ملیح آباد میں پیدا ہوئے اصل نام "شبیر حسن خان تھا" جوش تخلص کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں کہ

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوش صاحب کی 'یادوں کی بارات' گو کہ ان کی ضخیم سوانح عمری ہے لیکن اس کا ایک بڑا حصہ ان کے دوست احباب کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ 'یادوں کی بارات' سوانح عمری کے ذیل میں ایک اچھا اضافہ ہے اور جو واقعات لوگ جان بوجھ کر بھول جاتے ہیں جوش صاحب نے سب کچھ بھول کر انھیں بیان کیا ہے 'یادوں کی بارات' کو ہم تین بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک ان کے حالاتِ زندگی جس میں انھوں نے اپنے خاندان کی وجاہت و ولایت میں خود ستائش سے بھی کام لیا ہے لیکن اپنی زندگی کی سچائیوں کو پردۂ راز میں نہیں رکھا۔ اپنی پیدائش، بسم اللہ، موسم اور تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے ملیح آباد کی ثقافت کا بہت خوبصورت بیان پیش کیا ہے لکھنؤ کے پہلے سفر سے لے کر دوبارہ آمد تک تمام واقعات کو بدرجہ اتم بیان کیا ہے، اپنے نکاح اور اس کے عقدے کا ذکر کیا، قومی تحریک سے وابستگی، حیدرآباد سے اخراج، دربدری سے لے کر اپنی موجودہ زندگی تک سب بیان کیا ہے۔ دوسرا حصہ ان کے شخصی خاکوں کا ہے۔ جس میں پہلے ان کے خاندان پھر چند قابلِ ذکر احباب اور آخر میں چند عجیب ہستیوں کا خاکہ کھینچا ہے، تیسرا حصہ ان کے معاشقوں کے بارے میں ہے جس میں ان کی نفسیاتی کجی صاف نمایاں ہے۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

"جوش صاحب کی پوری سوانح میں نفسیاتی اہمیت کا اتنا مواد موجود ہے کہ اس سے جوش کی شخصیت کی نفسیاتی اساس کی دریافت با آسانی کی جا سکتی ہے 'یادوں کی بارات' کی صورت

میں جس طرح جوش نے خود کو بے نقاب کیا ہے اس طرح ظاہر ہونے کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ فرائڈ کی (An autobiographical study) سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظریۂ حسن کا بانی اور لاشعور دریافت کرنے والا فرائڈ اپنی خود نوشت میں اپنی محبوبہ کا نام تک درج نہیں کرتا اور اس کے مقابلے میں جوش نے کس والہانہ انداز سے اپنی معشوقوں، طوائفوں اور لڑکوں کا بھی تذکرہ کیا ہے''۔ ۳

اور میں جوش صاحب کے لیے صرف اتنا کہوں گی کہ:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

'یادوں کی بارات' کی سب سے اہم بات اس کا زبان و بیان ہے، جوش صاحب کے پاس الفاظ کا ایک کثیر ذخیرہ موجود تھا اور ایک لفظ کے ڈھیروں مترادفات یکے بعد دیگرے صف آرا ہو جاتے تھے گو کہ ان کا یہ طرزِ بیان شروع میں بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے لیکن آگے چل کر طبیعت اکتاہٹ کا شکار ہونے لگتی ہے اور خود جوش کی طبیعت میں بھی یہ رجحان محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یادوں کی بارات جس خصوصیتِ زبان کے ساتھ آغاز کی گئی اس کے انجام تک آتے آتے یہ خصوصیت مدھم ہوتی چلی جاتی ہے اور بیان سادہ رہ جاتا ہے۔

شخصی خاکوں کی ذیل میں پہلے انھوں نے اپنے خاندان کے افراد مثلاً دادا، پر دادا، باپ، چچا، بیوی، بیٹی وغیرہ کو ملا کر کل آٹھ (۸) خاکے لکھے ہیں اپنے خاندان کا ذکر بہت شجاعت سے کیا ہے کہ ان کے پردادا کی شجاعت و بہادری کے ڈنکے بجے ہوئے تھے ان کے دادا بہت اچھے شاعر بھی تھے ان کا نام و القابات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تہور جنگ حسام اللہ ولہ نواب فقیر محمد خان گویا''

اپنے دادا نواب محمد احمد خان بہادر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اُن کے اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا ان کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا، کلائیاں دو آدمی کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں، اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے ذہنوں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں''۔ ۴

ہوئے الفاظ بہت کم دوہرائے ہیں ہر شخصیت کے لیے اس کی زندگی سے علیحدہ رنگ اکٹھے کیے ہیں اور کو نئے نئے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اس بات کے ثبوت میں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ قاضی خورشید احمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ریاضی استاد، شاعر ونقاد، فارسی و سنسکرت ماہر، مکذب بدیہات، طفل حرکات، اخلاص شعار، دوست نواز، دشمن شناس، امرد پسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ، بباطن یگانہ قسم کے ایسے منکی انسان تھے جن کو نفسیات کے ماہر غور وفکر کا ایک اہم موضوع بنا سکتے تھے''۔ ۷

مانی جائسی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''گورے رنگ اور متوسط قامت کے، خوش رو، بدگمان، سریع الغضب، خدمات فراموش، پریشاں روزگاری میں کامل دوست، فراغت میں قطعی اجنبی، اوہام کی حد تک راسخ العقیدہ، بدرجۂ اتم نکتہ سنج، قیامت کے ذہین، نہایت خوش فکر، غزل گو، بلا کے عاشق مزاج اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو صبح ازل سے شام ابد تک برابر پھٹتا ہی چلا جائے گا اور لہجے میں ایسی دلکش موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جارہے ہیں''۔ ۸

'دیوان سنگھ مفتون' ہوں یا 'علامہ حیرت' سب کے لیے الفاظ کے علیحدہ ذخیرے استعمال کیے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے لیے تحریر کرتے ہیں:

''مجموعۂ اضداد، آمیزۂ بلور وفولاد، گاہ نسیم بوستاں، گاہ صرصر بیاں، گاہے خضر درگاہ، گاہے گم کردہ راہ، گاہ شبنم برگ تاک، گاہ شعلۂ جوالہ و بے باک، گاہ یزداں بآغوش، گاہ اہرمن بردوش، رند قدح خوار، گوہر شاہوار، آسمان خوش لہجگی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر، اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار، جودت پناہ، نقاد نگاہ، مہبط جبرئیل، شاعر بزرگ وجلیل۔ ۹

اتنی خوبصورت تراکیب بناتے ہیں کہ تحریر پڑھنے کے بعد دیر تک محظوظ ہوتے رہیں۔ مثلاً ''مملکت

"شرعفیف کے تاجدار"، "تبسم خلوص کے شہزادے" اور "آ جیل جوش لیجئی کے بعد" یہ کہنا ان کی نثر کی خاص خوبی ہے۔ جوش میں انسانی نفسیات کو پرکھنے کی کس قدر صلاحیت تھی اس کا اندازہ ان کے خاکوں سے لگایا جا سکتا ہے وہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ رویے کا مطالعہ ژرف بینی سے کرتے ہیں، جوش چوں کہ خود بھی ایک کھلے دل اور کھلے ذہن کے انسان تھے اس لیے ہر وہ شخص جو ان سے تعلق پیدا کرتا تھا وہ خود بھی جوش پر کھلنے میں دیر نہیں کرتا تھا، انھوں نے زندہ اور چلتے پھرتے کرداروں کو خاکے کا موضوع بنایا ہے اور ان خاکوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخصیت آج بھی ہمارے معاشرے میں یہیں کہیں موجود ہے۔ ایک گمنام پٹھان شاعر سے لے کر پنڈت جواہر لال نہرو تک ہمارے سامنے اپنی پوری تصویر کشی کے ساتھ جوش نے لا کھڑے کیے ہیں اس معاملے میں جوش کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ ہر شخص کے سیرت و کردار کی تصویر پیش کرتے ہوئے رشتہ اور تعلق کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر پنڈت نہرو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ دراصل سیاست، پیغمبری کا دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے جو نوع انساں کو پھولوں کی سیج پر لٹانے کے لیے خود خارا شگاف کانٹوں پر چلتی ہے اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ نوع انساں کو کانٹوں پر چلا کر خود پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہے، اور اللہ کے کروڑوں بندوں کے پیٹ پہ پتھر بندھوا کر، فقط اپنا اور اپنے چہیتوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست چوں کہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی، اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے میں اس کی تائید کرتا ہوں اس لیے کہ آج کے اچھے سیاستدان کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ ناقابل برداشت حد تک برا آدمی ہو۔" ۱۰

جوش صاحب کے خاکوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احباب کی کسی ایک خصوصیت کو واقعہ بیان کرتے تھے، ابرار حسن خان اثر ملیح آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قہقہے لگانے میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا ان کے قہقہے پورے اٹھارہ کلکوں کے ہوا کرتے تھے۔ ان کا

ہر قہقہہ زمین پر میل ڈیڑھ میل تک پھیل کر آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ان کے قہقہوں کی آوازیں تو سن لیجیے قہ۔قہ۔قہ۔قہ۔قہ۔قہ۔قاہا۔قاہا۔قاہا۔قاہا۔ہاہا۔ہا۔ہاہا۔ہاہا۔ہاہاہا۔ہا۔ہا۔ہا۔آہ۔'' ۱۱

وہ اس طرح کرداروں کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہوئے ان کے معمولات سے واقعات اخذ کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس واقعے کا ایک حصہ محسوس کرتا ہے۔قاضی خورشید احمد کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ اکثر الفاظ تین دفعہ دہرایا کرتے تھے:

''جب ناشتہ چن دیا گیا تو ان کے یہاں جو ایک دو ستے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھی دستر خوان پر آکر بیٹھ گئے اسکے بیٹھتے ہی انھوں نے کہا۔نہیں۔نہیں۔نہیں۔آپ کا ناشتہ بعد کو آئے گا۔بعد کو،بعد کو،بعد کو۔یہ فقط کالج،کالج کالج جانے والوں کا ناشتہ ہے اور وہ پانی پانی ہو کر دستر خوان سے اُٹھ گئے۔'' ۱۲

جوش صاحب نے کچھ لوگوں کے بہت طویل خاکے لکھے جن میں ابرار حسن،قاضی خورشید احمد،حکیم صاحب عالم،فانی بدایونی اور پنڈت نہرو وغیرہ کے نام شامل ہیں جب کہ کچھ لوگوں کے بہت مختصر۔ لیکن مجھے جو خاکے پسند آئے ان میں ''علی گڑھ کے ایک گمنام شاعر''،''علامہ حیرت'' اور''فراق گورکھپوری'' کا خاکہ شامل ہے۔جس خوبی سے انھوں نے علی گڑھ کے ایک گمنام شاعر کا ذکر کیا اس نے انھیں گمنامی سے پہچان کی روشنی میں لا کھڑا کیا ہے کہتے ہیں کہ جب کوئی شاعر ان کے ہتھے چڑھ جاتا اسے اپنے کمرے میں لے آتے اور ان کا سدھا ہوا ملازم باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دیتا یہ اس کی خوب مدارات کرتے اور پھر الماری سے دیوان نکال کر سنانا شروع کر دیتے اور جب وہ واہ واہ کرتا تو اس سے کہتے کہ کھڑے ہو جاؤ اور اس کو بھینچ کر گلے لگاتے اور اگلی غزل شروع کر دیتے،اس اُٹھک بیٹھک اور مخلصانہ برتاؤ کے بعد جو حال اس شخص کا ہوتا ہوگا وہ قابلِ توجہ ہے،یہ ایک مختصر خاکہ ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ ذہن میں نقش ہو گیا ہے۔اسی طرح فراق صاحب کے بارے میں ایک واقعے کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''وہ ایک دوہری شخصیت کے انسان ہیں کبھی مسیح دوراں ہیں کبھی موسیٰ عمراں،کبھی مہکتے گلزار کبھی اُپی تلوار۔۔۔نہ عطا کر، مگر، مجھے معبود بھول کر بھی شب وصالِ فراق

"۔ ۱۳

اسی طرح "علامہ حیرت" کا خاکہ کھینچتے ہیں جو بڑا ہی مزے دار ہے:

"الگنی پہ لٹکے ہوئے مفلر کی طرح، دبلے پتلے اور غزل کے اس بیمار غم کی مانند نحیف و نزار، جو ہر آن کراہتا رہتا ہے کہ اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبار بستر کا

گورے چٹے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا بھبوکا سا رنگ رکھنے والے کہ عمر اور ریش دونوں کی درازی اس کو بھانہ سکی اور چہرے کا یہ عالم ہے کہ حضرت مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں"۔ جوش صاحب نے ان پر ایک غزل کے چند اشعار بھی تحریر کیے ہیں۔ جس کی طویل ردیف ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہے۔ ملاحظہ کریں:

مکاں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی
زماں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی
نہایت نیک طینت ہیں مگر حد سے سوا کچھ بد
گماں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی
خضاب وخندہ وخوش لہجگی کے فیض سے اب تک
جواں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی
جو مسجد میں پکارا میکدے سے یہ صدا آئی
یہاں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی ۱۴

جوش صاحب کے خاندان۔ عزیز ورشتہ دار اور احباب کے علاوہ جن چند شخصیات کا انھوں نے ذکر کیا ہے ان میں ایک خوبی مشترک ہے کہ سب بہ بانگ دہل گالیں دیتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں غرضیکہ جا بجا گالیاں دینا، شراب اور عورت کا رسیا ہونا نہ صرف ان کے بلکہ احباب کی بھی گھٹی میں تھا۔

جیسا کہ مولانا سہا بھوپالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"وہ عورت اور شراب دونوں کے رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے۔" ۱۵

یہ خوبی ان کو وراثت میں ملی تھی اپنے دادا نواب احمد خان بہادر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان کی پچیس تھیں بیویاں، چار نکاحی اور باقی سب لونڈیاں، باندیاں تھیں۔۔۔ وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے۔ ان کے بچاسی بچوں کے نام غالباً میرے پاس لکھے ہوئے ہیں، باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں؟''۱۶

یہی وجہ ہے کہ بچپن ہو یا جوانی و بڑھاپا، پیدائش ہو یا موت بات اس موضوع سے شروع ہو کر اسی پہ ختم ہو جاتی ہے جیسا کے نواب زادہ مصطفیٰ علی خان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چوں کہ مصطفیٰ علی کا لڑکپن ان حسینوں کی زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا اس لیے بچپن ہی سے وہ تماش بینی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔''۱۷

اور امیر احمد خان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے انتقال کا واقعہ بھی سن لیجیے ایسی وضع داری کے ساتھ مرنا کس کے بس کی بات ہے ان پر جب کرب نزع طاری ہوا، انھوں نے اپنی بیوی سے کہا، خدا کے لیے مجھے جلدی اُٹھا کر بٹھا دو۔۔ بیوی نے کہا، ارے غضب خدا کا یہ وقت بیٹھنے کا ہے؟ انھوں نے کہا، ارے بیوی جلدی کرو۔ میری اطاعت تم پر فرض ہے۔ میرا یہ دل چاہتا ہے کہ اس حرام زادی موت کو ایک گالی دے کر تو مروں، بیوی نے رو کر کہا، ارے کلمہ پڑھو، انھوں نے ہاتھ جوڑے کہ مجھے بٹھا دو اور جب بیوی نے بٹھا دیا تو انھوں نے مٹھی بند کر کے بایاں ہاتھ ہلایا اور کہا، ''لے حرام موت۔۔۔۔'' اور سدھار گئے۔''۱۸

جوش صاحب کی شخصیت کی بات ہو یا ان کے خاندان کی، یا پھر ان کے احباب کی۔۔۔ شدت پسندی نمایاں نظر آتی ہے۔ جب ان کی بیوی اشرف جہاں کی نانی کا ذکر آیا تو یہی بات سامنے آئی کہ ان کے کہنے پر ایک کم سن لونڈی کو زندہ دفن کر دیا گیا اور جب ان کے شوہر منع کرنے کے باوجود لکھنؤ جانے لگے تو انھوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے سِل ماری کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ مختار احمد خان کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی جنسی انتہا پسندی کو چھو جاتی ہے اور وہ موقع بے موقع جنسی سے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے ہیں۔ ''مولانا سہا بھوپالی'' ہوں یا ''علی گڑھ کے گمنام شاعر'' شدت پسندی ان کا شعار ہے۔ جیسے ''پھدو خان'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ملیح آباد کے بڑے زمیں داروں میں سے تھے، جو شخص ان کے غصے، جھڑکی گالی کا

فوری جواب نہ دے اسے پٹھانوں کے زمرے سے خارج کرکے قطع تعلق کرلیا

کرتے تھے۔ تیسری خصوصیت، ملازم ان کے پکارتے ہی دو سیکنڈ کے اندر حاضر نہ ہوجائے اسے

چھڑا دیا کرتے تھے، اسی بنا پر "نادر شاہی" حکم کی طرح "چھدو خانی" حکم دور دور تک مشہور تھا۔[19]

ان کے لیے بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ

کوئی دیوانہ ہی سمجھے گا تکلم کے رموز

کس سلیقے سے سجایا ہے گلستان جنوں

انھوں نے اپنے عہد کی چند عجیب ہستیوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہوگئیں ہیں جن میں 'محبوب شاہ مجذوب'، 'کنجو خان'، 'ہدایت اللہ خان'، 'الویرا اور چھدو خان' شامل ہیں۔ ان میں سب سے دلچسپ انسان کے طور پر جوش صاحب نے "مولوی احمد حسین" کو پیش کیا ہے جو ایک پر اسرار شخصیت کے مالک تھے۔ فلسفے کا گہرا علم رکھتے تھے اور تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے ان کی یادوں نے جوش کے دل پر جو انمٹ نقوش چھوڑے جوش نے کمال فن کے ساتھ ان نقوش کو تحریر میں منتقل کر دیا، اور ان کا نو (۹) صفحات کا طویل خاکہ لکھا۔ اسی طرح مجاز کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوبصورت جملہ لکھا کہ:

"صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ 'مجاز مر گیا'۔۔۔!"[20]

اور اس شعر کا پس منظر لکھا جب مجاز نے انھیں ایک پرچی پر لکھ کر بھیجا تھا کہ:

جو گذرتی ہے قلب شاعر پر

شاعر انقلاب کیا جانیں

یہ وصف تو جوش صاحب میں تھا کہ انہوں نے خاکوں میں اثر پذیری پیدا کی اور جس طرح رعایت لفظی اور صنائع سے کام لیا اس نے ان کی تحریر میں چار چاند لگا دیے۔ جوش صاحب نے ساٹھ (۶۰) کے قریب خاکے لکھے۔ اور اپنی اس کتاب "یادوں کی بارات" جو ۱۹۷۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی ادبی دنیا میں ایک نئے اور منفرد باب کا اضافہ کیا۔ دراصل اس سے قبل سوانح نگاری کی فضا میں ایک جمود کی کیفیت طاری تھی یعنی سب کچھ ایک گی بندھی روٹین کے مطابق چل رہا تھا، اس فضا میں جتنی بھی سوانح عمریاں آئیں وہ کئی اعتبار سے اپنے لوازمات پورے نہیں کرتیں اور اس میں

شخصیت کو فرشتہ بنا کر پیش کرنے کی سعی کی گئی بلکہ اکثر ان میں مبالغہ آرائی کی آمیزش اس حد تک پائی جاتی تھی کہ ایک معمولی زندگی بسر کرنے والا انسان خودنوشت یا سوانح عمری میں ولی اللہ کے طور پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا قول بڑا دلچسپ ہے: "ہمارے یہاں کسی بھی شخص کو مرنے کے بعد لانڈری بھیج دیا جاتا ہے اور پھر رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔"

ایک عرصے تک ہمارے سوانح نگاروں کو معلوم نہ تھا کہ انسان کو انسان ہی رہنے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے "انسان" یعنی ۔۔۔ اچھائیوں اور برائیوں کا منبع، نیکی اور بدی کا امتزاج۔ حالی جن کا پیغام سرسید کی تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری تھا مگر بطور سوانح نگار وہ ہمیں حقائق سے چشم پوشی کرنے والے سب سے بڑے انسان نظر آتے ہیں ان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، مگر اس جمود کی فضا کو جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات" نے بالآخر توڑا بلکہ زبردست دھماکے سے تہ و بالا کر دیا اور سوانح نگاری کے لیے نئی روایت یعنی تمام حقائق سے پردہ دری کو جنم دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے خاندان اور اہم شخصیات کی مکمل تصویر کشی کی بلکہ زندگی کے بے حد اہم اور نجی معاملات کو ہر زاویے سے کھول کر بیان کر دیا۔ ان کے اس قدم نے حلقۂ ادب اور طبقۂ شرفاء میں کافی حد تک بے چینی پھیلا دی اور ان پر فحش نگاری کے الزامات لگے، لیکن ایک طبقۂ فکر ایسا بھی تھا جن کے اذہان اب کھل چکے تھے اور نگاہیں روشن ہو گئیں تھیں چنانچہ عام ڈگر سے ہٹ کر اس نئے رجحان کا روشن نظر لوگوں نے اعتراف کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس کے بعد کی سوانح عمریوں میں لوگ اپنی ذاتیات کو بیان کرنے سے نہیں ہچکچائے۔

جوش صاحب نے اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب کے علاوہ چھوٹی بڑی، عجیب و غریب شخصیات کو بھی خاکوں کا حصہ بنایا لیکن کیا وجہ ہے کہ جوش صاحب نے اپنے ہم عصر "احسان دانش" جیسے بلند پایہ شاعر کا تذکرہ نہیں کیا، شاید ان کی خودپسندی نے انھیں اس امر سے روکے رکھا یا پھر پیشہ ورانہ حسد نے۔ چوں کہ اس کتاب میں مبالغہ آرائی اور خودنمائی بھی بڑی حد تک ہے اور وہ خود کو قدم قدم اونچے خاندان کا چشم و چراغ ثابت کرنے کے لیے الفاظ کا بے محابا استعمال کرتے ہیں تو محسوس یوں ہوتا ہے کہ شاید ملیح آباد کیا پورے ہندوستان میں ان کے خاندان سے بڑا کوئی خاندان ہی نہیں، آپ ایک بہت اچھے شاعر تھے پھر بھی خود کو عالی مرتبت شاعر کے طور پر پیش

کرنے کے لیے اس کتاب میں پوری پوری نظمیں اور کئی رباعیاں کہہ ڈالیں۔۔جس نے ان کے خود پسندی کے عنصر کو نمایاں کر دیا۔اس وقت احسان دانش کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا اور "احسان دانش" نے جو خود بھی بڑے شاعر تھے اپنی سوانح میں بڑی عاجزی کا ثبوت دیا ہے۔۔۔اور جوش سے ملاقات کا ذکر بڑے مفصل انداز میں کیا ہے،اور اس ملاقات کو باعث صد افتخار قرار دیا ہے۔۔اس کی ایک وجہ جوش کی خاندانی پرورش اور اس کا زعم بھی ہو سکتا ہے۔۔۔

اس سے قطع نظر جوش کے خاکوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ ایک بہترین کاوش ہے اور جوش صاحب کی شخصیت کی جو نمایاں خصوصیات ہمیں یادوں کی بارات میں نظر آئیں وہی ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں میں مشترک پائی جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے ایک مصرعہ بار بار میرے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ

پھول سے بات چلی خار سے آگے نہ بڑھی

اور میری طبع نے اسی زمین میں ایک غزل کے چند شعر کہے جو جوش صاحب کی نذر خدمت ہے۔(شاعر سے معذرت کے ساتھ)

سرخی غازہ و رخسار سے آگے نہ بڑھی
زندگی قصہ دلدار سے آگے نہ بڑھی

بات احباب کی بھی خوب سنائی لیکن
گالیوں کے مہااوتار سے آگے نہ بڑھی

حسن زن دیکھ کے آنکھوں میں جو کوندا لپکا
نور سے بات چلی ، نار سے آگے نہ بڑھی

ہم نے چاہا کہ بتائیں گے حقیقت اپنی
یہ زباں حسن کے اظہار سے آگے نہ بڑھی

حواشی

۱۔ زیبا، شجاع احمد، پروفیسر، "مقدمہ از اردو میں قلمی خاکے"، ص ۵
۲۔ جوش، ملیح آبادی، "یادوں کی بارات"، ص ۳۴
۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "جوش کا نفسیاتی مطالعہ"، ص ۸
۴۔ جوش، ملیح آبادی، "یادوں کی بارات"، ص ۳۳۸
۵۔ ایضاً // ص ۳۳۷
۶۔ ایضاً // ص ۳۸۳
۷۔ ایضاً // ص ۳۱۷
۸۔ ایضاً // ص ۳۵۸
۹۔ ایضاً // ص ۵۳۶
۱۰۔ ایضاً // ص ۵۲۲
۱۱۔ ایضاً // ص ۳۰۳
۱۲۔ ایضاً // ص ۳۲۳
۱۳۔ ایضاً // ص ۵۵۰
۱۴۔ ایضاً // ص ۵۳۱
۱۵۔ ایضاً // ص ۳۳۷
۱۶۔ ایضاً // ص ۳۳۹
۱۷۔ ایضاً // ص ۵۹۸
۱۸۔ ایضاً // ص ۵۷۸
۱۹۔ ایضاً // ص ۶۲۵
۲۰۔ ایضاً // ص ۵۵۹

قاضی محمد اختر جونا گڑھی

پروفیسر ممتاز حسین: ایک علمی اور تخلیقی شخصیت

آج سے ۵۰ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب ۱۹۶۲ء میں اسلامیہ کالج کراچی کے فرسٹ ایئر آرٹس میں داخلہ لیا تو پتہ چلا کہ اردو ادب اور تنقید کی دو نہایت اہم اور ممتاز شخصیات اسلامیہ کالج کے شعبہ انگریزی اور شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔ شعبہ انگریزی کے سربراہ پروفیسر محمد حسن عسکری اور شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر ممتاز حسین تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پروفیسر کرار حسین صاحب بھی اسلامیہ کالج سے وابستہ رہ چکے تھے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری کے انتقال پر میں نے ایک مفصل مضمون تحریر کیا تھا جو پہلی بار ۱۹۷۸ء میں روزنامہ 'جنگ' کراچی کے ادارتی صفحات پر شائع ہوا تھا۔ بہرکیف! داخلوں کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جب کالج میں باقاعدہ کلاسیں شروع ہو گئیں تو پروفیسر ممتاز حسین صاحب کو بے حد قریب سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ چونکہ میٹرک تک آتے آتے اردو شعر و ادب اور تنقید سے دلچسپی، اور ساتھ ہی ساتھ کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی پیدا ہو چلا تھا، لہٰذا اختیاری مضامین میں اردو (ایڈوانس) کا انتخاب کیا جو پروفیسر ممتاز حسین پڑھاتے تھے۔ اردو (لازمی) محترمہ خالدہ شوکت صاحبہ پڑھایا کرتی تھیں، جو ڈاکٹر عبادت بریلوی کی بھتیجی ہیں اور ان دنوں کراچی کے اسلامیہ کالج سے وابستہ تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اردو (ایڈوانس) کا پیریڈ پانچواں، اور سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ جس دن ممتاز صاحب کا پیریڈ تھا، گھنٹہ بج چکنے کے بعد، وہ قدرے آگے کی جانب جھکے ہوئے اور تقریباً جھومتے ہوئے انداز میں کلاس روم میں داخل ہوئے۔ ممتاز صاحب کے چلنے پھرنے کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے بلا ارادہ جھومتے چلے جا رہے ہوں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چند کتابیں تھیں۔ جونہی وہ کلاس روم میں داخل ہوئے اردو (ایڈوانس) کے تمام طلباء اور طالبات (اسلامیہ

کالج میں کو ایجوکیشن تھی) ان کے احترام میں اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے...... ''بیٹھو! بھئی بیٹھ جاؤ'' ۔ممتاز صاحب نے قدرے ناپسندیدگی کے ساتھ ہم سب کو بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ استاد کے احترام میں اپنی نشستوں سے اس طرح کھڑے ہو جانا انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ میں نے ذرا تعجب اور حیرت کے ساتھ بڑے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا اور چہرہ گول تھا۔ بالخصوص نچلا ہونٹ قدرے باہر کی طرف جھکا ہوا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ جو لیکچر کے دوران وہ آنکھوں سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا کرتے تھے۔ سر کے بال بہت کم رہ گئے تھے۔ ممتاز صاحب کے سراپا میں جس چیز نے مجھے زیادہ متوجہ اور متاثر کیا وہ ان کی آنکھیں تھیں۔ گہری سانولی اور کشادہ پیشانی سے نیچے دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ذہانت اور ذکاوت کی غیر معمولی چمک سے معمور تھیں۔ طلباء و طالبات سے فرداً فرداً ذاتی تعارف کے بعد ممتاز صاحب بولے۔

''بھئی آج ہمارا موڈ کچھ پڑھانے وڑھانے کا بالکل نہیں ہے! تو پھر کیا کیا جائے''۔ پھر قدرے توقف کے بعد خود ہی بولے۔

''ایسا کرتے ہیں آج آپ سب لوگوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ کراتے ہیں دیکھیں کسے سب سے زیادہ اشعار یاد ہیں''!

بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا کے مصداق دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ آج تک جتنے اشعار اور نظمیں یاد کی تھیں کسی نہ کسی کام آ ہی گئیں۔ چلو ممتاز صاحب کو 'فرسٹ امپریشن' دینے کا اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دو گروپ بنا دیے گئے اور بیت بازی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ میدان آخر کار ہمارے گروپ کے ہاتھ رہا جس کی فتح اس خاکسار کے اچھے حافظے کی مرہون منت تھی۔

جب پیریڈ ختم ہو چکا تو ممتاز صاحب کلاس روم سے باہر نکلتے ہوئے اچانک مجھ سے مخاطب ہوئے ''قاضی اختر! جانے سے پہلے ذرا مجھ سے کالج کی لائبریری میں ملتے ہوئے جانا''...... یہ بات مجھے اس زمانے میں بڑی عجیب لگی تھی کہ عسکری صاحب اور ممتاز حسین صاحب دونوں اپنے اپنے متعلقہ شعبوں کے سربراہ تھے لیکن ان دونوں ہیڈز آف ڈپارٹمنٹ کے لیے اسلامیہ کالج جیسے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے تعلیمی ادارے میں کسی علیحدہ کمرے یا دفتر وغیرہ کا انتظام نہیں کیا

گیا تھا۔ ممتاز حسین صاحب گراؤنڈ فلور پر کالج کی لائبریری کے ایک گوشے میں اپنی مستقل نشست رکھے ہوئے تھے جب کہ محمد حسن عسکری صاحب اسی گراؤنڈ فلور پر، لائبریری سے کچھ پہلے، ایک بڑے سے کلاس روم میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ اپنی انگریزی کی تمام کلاسیں بھی اسی کمرے میں لیا کرتے تھے۔ ایک بڑی اہم بات یہاں برسبیل تذکرہ یاد آ گئی جسے خاص طور سے بتانے کو جی چاہتا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر محمد حسن عسکری دونوں اپنے اپنے مرتبے اور مقام کے لوگ تھے۔ فکر و خیال کے شدید نظریاتی اختلافات کے باوجود دونوں کا تعلق اولاً اور آخرکار اردو زبان، ادب اور تنقید نگاری ہی سے تھا۔ ادب دونوں بڑی شخصیات میں قدر مشترک تھا۔ لیکن جب تک میں اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم رہا، میں نے ان دونوں اساتذہ کو کبھی آپس میں سلام دعا کرتے، ملتے یا بات چیت کرتے نہیں دیکھا۔ ممتاز حسین صاحب اپنی کلاس لینے کے لیے لائبریری سے نکل کر اوپر واقع منزل پر آجاتے اور کلاس لینے کے بعد سیدھا لائبریری کا رُخ کرتے۔ عسکری صاحب اُسی کلاس روم ہی میں بیٹھے رہتے اور ان کے انگریزی (ایڈوانس) کے طلباء و طالبات وہیں ان سے پڑھنے کے لیے آجایا کرتے تھے۔ عسکری صاحب کی ایک بات اور یاد آ گئی۔ میں نے انہیں کبھی، کسی لمحہ، اس کلاس روم میں بے کار بیٹھے یا کسی سے باتیں کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ان کی کوئی کلاس نہ ہوتی تو عموماً ان کے ہاتھ میں بالخصوص ولیم شیکسپیئر کی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی جسے وہ اتنی توجہ اور گہرے انہماک سے پڑھنے میں مصروف رہتے کہ انہیں اس بات سے کوئی علاقہ اور غرض نہ رہتی کہ ان کے کمرے کی راہداری سے کون آ رہا ہے۔ کون جا رہا ہے۔ وہ کبھی اتفاقاً بھی گردن گھما کر کسی کو دیکھنے کی زحمت کرتے ہی نہ تھے...... بات ذرا طویل ہو گئی۔

میں ممتاز صاحب کے حکم کے مطابق نیچے گراؤنڈ فلور کے بالکل ایک سرے پر واقع لائبریری میں گیا جہاں کتابوں کے بڑے بڑے شیلف رکھے تھے اور ان کے پیچھے ممتاز صاحب اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ میں نے ان کے قریب جا کر انہیں بڑے ادب سے سلام کیا تو انہوں نے فوراً مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا بیٹا ہوں اور شعر و ادب سے دلچسپی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ اردو شعر و ادب سے

میری دلچسپی اور لگاؤ کو دیکھتے ہوئے ممتاز صاحب بولے۔

"ابھی بیت بازی کے دوران تم نے میر، غالب، فراق اور یگانہ کے جو اشعار پڑھے اور مجاز اور اختر الایمان کی نظموں کے جو بند سنائے اسی سے مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ جو لڑکا میٹرک سے فرسٹ ایئر میں آیا ہو اس کا مطالعہ اتنا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے جواباً کہا کہ یہ سب ان کتابوں کا فیض ہے جو میرے مرحوم والد ریاست جونا گڑھ سے یہاں لے آنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور کچھ دخل میرے ذاتی شوق اور دلچسپی کا بھی ہے۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ممتاز صاحب اچانک بولے" بھئی! میں چاہتا ہوں کہ تم اردو ایڈوانس کے لوگ مل کر ایک "بزم ادب" تشکیل دو جس کی چدرہ روزہ تنقیدی نشستیں یہیں کالج کے کلاس روم میں ہوا کریں گی"۔ پھر ذرا توقف کے بعد کہا "میں چاہتا ہوں تم "بزم ادب" کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے اس کی تشکیل اور سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرو۔ ایسی سرگرمیوں سے تخلیقی اور ادبی صلاحیت نکھرتی ہے"۔ ممتاز صاحب کی زبان سے یہ سن کر میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ حواس بجا ہوئے تو میں نے کہا۔

"سر! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ناقص رائے میں یہ بہتر ہوگا کہ اگر آپ کل اپنے پیریڈ میں "بزم ادب" کی تشکیل کا اعلان فرما دیں اور جس جس کو جو عہدہ دینا چاہیں سب طلبا اور طالبات کی موجودگی میں دے دیں" ممتاز صاحب نے میرے اس خیال سے مکمل اتفاق کیا اور دوسرے ہی دن اردو (ایڈوانس) کے پیریڈ میں "بزم ادب" کی تشکیل کا باضابطہ اعلان ہو گیا۔ جمال پانی پتی صاحب کو ممتاز صاحب نے اس "بزم ادب" کا صدر اور مجھے جنرل سیکریٹری مقرر کر دیا۔ جمال پانی پتی چونکہ نیشنل بینک میں ملازم تھے لہٰذا اردو (ایڈوانس) کے پیریڈ میں شاذ و نادر ہی شریک ہو پاتے تھے۔ تاہم "بزم ادب" کی چدرہ روزہ تنقیدی نشستوں میں وہ بھی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ طے پایا کہ چدرہ دنوں میں ایک بار یہ "بزم ادب" تنقیدی نشستوں کا اہتمام کرے گی جس میں اردو (ایڈوانس) کے طلبا و طالبات اپنی اپنی شعری اور نثری تخلیقات تنقید کے لیے پیش کریں گے۔

اب باقاعدہ کلاسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ سب طلباء اور طالبات جنہوں نے اردو (ایڈوانس) لے رکھی تھی بڑے بے تابی کے ساتھ آخری پیریڈ کے منتظر رہنے لگے۔ چوتھے پیریڈ

کے افتتاحی گھنٹے کے ساتھ ہی ممتاز حسین صاحب اپنے مخصوص انداز میں جھومتے جھامتے کلاس میں داخل ہوتے۔ خطوطِ غالب کا ایک انتخاب بھی ہمارے نصاب میں شامل تھا۔ اتفاق سے والد مرحوم کے ذخیرہ کتب سے مجھے 'اردوئے معلیٰ' کا ایک پرانا مگر مجلد نسخہ مل گیا تھا جسے میں اپنے ساتھ کالج لے جایا کرتا تھا۔ ممتاز صاحب نے درس و تدریس کا آغاز خطوطِ غالب ہی سے کیا۔ خطوطِ غالب کو بآوازِ بلند پڑھنے کی ذمہ داری بھی انہوں نے مجھ پر عائد کر دی۔ وہ پہلے غالب کے خطوط پڑھواتے اور اس دوران غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے جاتے۔ بعد میں ان خطوط کی تشریح اور وضاحت بڑی تفصیل سے کرتے۔ 'انتخاب خطوطِ غالب' کے علاوہ غالب کی غزلیات بھی ہمارے نصاب میں شامل تھیں۔ چند ہی کلاسوں کے بعد مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ غالب ممتاز حسین صاحب کا آئیڈیل تھا۔ شعر کی گفتگو ہو رہی ہو یا نثر کی، غالب ممتاز صاحب کا واحد حوالہ تھا۔ غالب کی شخصیت، شاعری، فن اور نظریات پر لیکچر دیتے ہوئے ممتاز صاحب کسی اور ہی عالم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ادھ کھلی کتاب ان کی انگلیوں کے درمیان ہوتی دوسرے ہاتھ میں ان کا چشمہ ہوتا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تقریباً بند کیے کلاس روم میں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹہل ٹہل کر لیکچر دیتے رہتے اور ہم سب لوگ غالب کی دنیا سے نکل کر سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن خلدون، کارل مارکس، لینن، آئن اسٹائن، حافظ، خیام اور امیر خسرو کی دنیاؤں کی سیر کرنے لگتے۔ پیریڈ کب ختم ہوا کسی کو اس بات کا قطعاً کوئی احساس نہ رہتا۔ اچانک ممتاز صاحب اس علمی سفر سے واپس لوٹ آتے اور عموماً غالب کا یہ شعر پڑھتے جو انہیں سب سے زیادہ پسند تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

جیسا کہ اردو شعر و ادب اور تنقید سے واجبی دلچسپی اور تعلق رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ پروفیسر ممتاز حسین اولاً اور اصلاً ایک مارکسی نقاد تھے۔ وہ نظریاتی اعتبار سے کارل مارکس کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے بالکل اسی طرح جیسے پروفیسر محمد حسن عسکری ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے مکتبہ خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ انسانی تاریخ کی مادی اور جدلیاتی تعبیر پر ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ معروف معنوں میں ممتاز حسین صاحب خالصتاً ایک ترقی پسند مفکر اور سائنٹفک تنقید کے آدمی تھے اور انہی

حوالوں سے ترقی پسندی، روشن خیالی، خرد افروزی اور عقلیت پسندی پر عامل اور ان کے سرگرم مبلغ تھے۔ شعر و ادب کی افہام و تفہیم میں بھی وہ انہی نظریات سے استفادہ کرتے تھے۔ 'نقد حرف' سے لے کر 'ادب و شعور' تک اور 'امیر خسرو: حیات و شاعری' سے 'حالی کا تنقیدی شعور' تک ان کی تمام کتابیں اسی نظریاتی حوالے سے فیض یاب ہیں

ممتاز حسین صاحب کی بعض تعبیرات اور تفہیمات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جس جذبے، خلوص اور لگن سے وہ اپنے مضمون پر محنت کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ خطوط غالب کے بعد نصاب کی دوسری تمام کتابیں بھی انہوں نے اسی انداز سے پڑھوائیں اور ان کی تشریح اور توضیح کی۔ اردو شعر و ادب کے علاوہ ممتاز صاحب فارسی ادبیات کا بھی تربیت یافتہ ذوق رکھتے تھے۔ اور اکثر اوقات اپنی بات سمجھانے کی خاطر غالب کے فارسی کلام سے بھی مدد لیا کرتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ 'بزم ادب' کی پندرہ روزہ نشستوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ممتاز حسین صاحب بڑی پابندی اور جوش و خروش کے ساتھ ان نشستوں میں شریک ہوتے اور ہم سب نو آموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی کرتے جاتے۔

تقریباً ایک سال پورا ہونے کو آیا تو ایک دن ممتاز صاحب نے تجویز کیا کہ "بزم ادب" کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج میں ایک سالانہ مشاعرے کا انعقاد ہونا چاہیے۔ مشاعرے کی صدارت کے لیے جناب فیض احمد فیض کا نام بھی انہوں نے خود ہی پیش کر دیا۔ میرے خیال میں اردو ادب کے تناظر میں غالب کے بعد، فیض صاحب دوسری شخصیت تھے جن سے ممتاز حسین صاحب کو غیر معمولی اُنس اور عقیدت تھی۔ فیض کی شاعری پر وہ بہت کچھ لکھ بھی چکے ہیں جن سے ان کی فیض سے عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

فیض صاحب اس زمانے میں عبداللہ ہارون کالج، کراچی کے پرنسپل تھے یہ غالباً ۱۹۶۲ء یا اس کے آس پاس کی بات ہے۔ ہم سب لوگ ممتاز صاحب کی سربراہی میں عبداللہ ہارون کالج پہنچے۔ فیض صاحب نے ممتاز صاحب کو بڑے خلوص اور احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اور مشاعرے کا دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے بڑے اصرار کے ساتھ یہ اعادہ کیا کہ کالج کے مشاعروں میں شرکت سے وہ کبھی انکار نہیں کرتے۔ مشاعرے والے دن فیض صاحب ٹھیک وقت پر

اسلامیہ کالج آ گئے جناب حفیظ ہوشیار پوری میرے اور عبید اللہ علیم کے شدید اصرار پر اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ اس تقریب میں پروفیسر مجتبیٰ حسین بھی ممتاز صاحب کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔

مشاعرہ شروع ہوا تو ممتاز صاحب اسٹیج پر ہی تشریف فرما تھے۔ ان کا والہانہ پن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سامعین کے بے حد اصرار پر جب صدر مشاعرہ فیض احمد فیض نے اپنی مشہور اور تازہ نظم

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

سنانی شروع کی تو ممتاز صاحب کی کیفیت دیدنی تھی۔ نظم کے ہر مصرعے پر وہ بے ساختہ جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ جب فیض صاحب ان آخری مصرعوں پر پہنچے:

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

تو میں نے دیکھا کہ ممتاز حسین صاحب نے اپنا چشمہ اتارا اور رومال سے اپنی نم آلود آنکھیں پونچھیں اور چشمہ پھر لگا لیا۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ بظاہر ایسے سنجیدہ، متین اور بردبار آدمی کے سینے میں ایک درد بھرا دل بھی ہے جو خاک نشینوں کے ذکر پر اس طرح بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ وہ تو بنیادی طور پر آدمی ہی خاک نشینوں کے تھے۔ ان کی ہر بات، ہر لفظ، ہر جملہ انہی خاک نشینوں کے لیے تھا۔

آج جب وہ خود پردہ خاک میں جا چھپے ہیں مجھے میر تقی میر کا یہ شعر بار بار یاد آ رہا ہے جو خود ممتاز صاحب بھی اکثر دہرایا کرتے تھے

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ممتاز مصنف ڈاکٹر سید قاسم جلال کی سترھویں کتاب
صور اسرافیل (شعری مجموعہ)
جبران اشاعت گھر کراچی کے زیر اہتمام شائع ہو گئی ہے

۹

خواجہ رضی حیدر

تابش دہلوی......تہذیبی تشخص کے شاعر

مسعود الحسن تابش دہلوی کے نام اور آواز سے تو میری سماعت لڑکپن سے ہی آشنا و مانوس تھی کیونکہ وہ ریڈیو پاکستان سے خبریں پڑھا کرتے تھے، لیکن اُن سے مجھے نیاز ۱۹۶۳ء میں حاصل ہوا۔ اُس وقت میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور یاور مہدی کے مشہور زمانہ پروگرام 'بزمِ طلبہ' میں شرکت کے لیے ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹیشن گیا تھا۔ مجھے اس پروگرام میں ایک مضمون 'ہماری زندگی میں تاریخ کا مقام' پڑھنا تھا۔ یاور مہدی نے جن کو تمام طالب علم 'یاور بھائی' کہتے تھے مجھ سے کہا کہ برابر والے کمرے میں تابش دہلوی صاحب بیٹھے ہیں، آپ اُن کو اپنا مضمون سنا دیں تاکہ وہ آپ کا تلفظ دیکھ لیں۔ میں برابر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں شگفتہ رخ تابش دہلوی صاحب تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گویا ہوئے۔ آیئے میاں۔ بیٹھیے، کیا مضمون ہے پڑھیے۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں مضمون سنانا شروع کر دیا۔ کئی مقامات پر انہوں نے آواز کے اُتار چڑھاؤ اور تلفظ کے بارے میں مشورہ دیا۔ خصوصاً مشہور تاریخ دان ابن خلدون کے نام کا تلفظ درست کرتے ہوئے فرمایا "اس نام کا بہت پڑھے لکھے لوگ بھی تلفظ غلط کرتے ہیں۔ یہ 'خلدُ ن' ہے 'خلدُ ون' نہیں ہے۔ 'خ' کا 'ل' سے وصل ہے۔ 'خ' پر زبر نہیں ہے۔ 'خ' اور 'ل' پر جزم ہے۔ 'خ' اور 'ل' کو الگ الگ ادا کریں گے تو اس کا تلفظ غلط ہو جائے گا۔ عربی ناموں میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے"۔ تابش دہلوی جس زمانہ میں مسعود تابش کے نام سے ریڈیو پاکستان سے خبریں پڑھتے تھے اُس وقت درحقیقت عوام الناس کے لیے خبروں کا یہ مختصر دورانیہ صحتِ لفظی یعنی

تلفظ کی دُرستی کا ایک مدرسی دورانیہ تصور کیا جاتا تھا۔

تابش دہلوی صاحب سے اوّلین تعارف کے بعد مجھے پھر ریڈیو اسٹیشن پر اکثر اُن سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ شعری نشستوں میں بھی اُن کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ خصوصاً ۱۹۶۶ء میں بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام جب میں نے مشاعرہ جناح کالج میں منعقد کیا تو اس مشاعرہ میں مدعو کرنے کے لیے میں تابش دہلوی کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ وہ نہایت شفقت سے پیش آئے اور تاکیداً فرمایا کہ شاعری صرف سنا ہی مت کیا کرو پڑھا بھی کرو۔ پڑھنے سے شعر کی معنوی تہوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ مشاعرے تو 'واہ واہ' ہوتے ہیں۔ یہی وہ موقع تھا جہاں سے تابش دہلوی سے میری باقاعدہ نیاز مندی کا آغاز ہوا۔ اُس وقت میں شعر نہیں کہتا تھا لیکن مجھے جدید شعراء کے بہت اشعار یاد تھے۔ میرے ذوق و شوق کو دیکھ کر وہ اکثر مجھے اساتذہ کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ اساتذہ کے ہاں قدامت ضرور ہے، لیکن فنی و معنوی حسن و التزام بھی وہاں ہے، جو ہر دور میں اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے۔ شعر کی تفہیم کا سلیقہ اساتذہ کا مطالعہ کیے بغیر نہیں آتا''۔

تابش دہلوی صاحب ناظم آباد تین نمبر میں مقیم تھے اور میں ناظم آباد دو نمبر میں رہتا تھا۔ اسی زمانہ میں نوحؔ ناروی کے جانشین حضرت دعاؔ ڈبائیوی نے بھارت سے نقل مکانی کر کے میرے پڑوس میں رہائش اختیار کی۔ دعا ڈبائیوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا، لہٰذا اُن کے گھر ملاقات کے لیے عموماً شاعر آیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تابش دہلوی صاحب بھی تشریف لاتے جس کی بنا پر مجھے تابش صاحب سے مزید قربت حاصل ہوگئی۔ رضویہ سوسائٹی کی امام بارگاہ میں تابش دہلوی نے ڈاکٹر یاور عباس کی جانب سے منعقدہ ایک خصوصی مجلس میں پہلی مرتبہ مرثیہ پڑھا، جسے سننے کے لیے میں بھی اپنے ہم عمر احباب کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجلس مرثیہ کے اختتام پر معروف نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم نے تابش دہلوی صاحب سے مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ نے دادخواہی کے لیے نہیں سچے جذبۂ عقیدت کے ساتھ مرثیہ لکھا ہے۔ تابش دہلوی صاحب اپنے عقیدے میں واضح آدمی تھے اور کبھی اپنی زبان سے کوئی ایسا حرف ادا نہیں کرتے تھے جو کسی کی دل آزاری کا باعث ہو سکے۔ ہر مسلک اور عقیدے کا آدمی اُن سے بغیر کسی احتیاط اور پیش بندی کے قریب ہو جاتا تھا۔ شاید تابش صاحب کا یہی مزاج اُن کی ہردلعزیزی کا ایک بڑا سبب

تھا۔

تابش صاحب اپنی تہذیب وشائستگی، کشادہ خیالی، اور تخلیقی اہتمام والتزام میں مثالی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اسّی سال شعروادب کے حوالے سے بسر کیے اور اس مال ومنال اور قحط الرجال سے آلودہ ادبی ماحول میں اپنے مزاج سے فضیلتوں کے چراغ روشن کرتے رہے۔ وہ ایک عمر ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہنے کے باوجود نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہے اور نہ وہ مالی فراوانی کبھی اُن کو میسر آئی جو ہمارے ہاں اکثر تخلیق کاروں کو ممتاز اور قابلِ ذکر بناتی ہے۔ تابش دہلوی صاحب کا امتیاز ان کا فن اور شخصی رکھ رکھاؤ تھا اور انہی اوصاف نے اُن کو اس قدر قابلِ احترام بنادیا تھا کہ کوئی بھی محفل ہو اُن کی ذات نمایاں اور مرکزِ نگاہ رہتی تھی۔ معروف دانشور سید ہاشم رضا نے ایک محفل میں تابش دہلوی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”کسی فنکار کو یہ احترام کسی مادّی یا سیاسی بالادستی سے نہیں ملتا بلکہ اُس عرفانِ علم سے ملتا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں سطح پر فہم وادراک کو بلوغت سے ہمکنار کرتا ہے۔ تابش دہلوی ان گرانقدر مثالیوں میں سے ایک ہیں جو اپنے ادبی رکھ رکھاؤ کے سبب شکست وریخت اور انتشار وافتراق میں مبتلا شہر کراچی کی ادبی فضا میں ایک دبستان کا درجہ رکھتے ہیں“۔

تابش صاحب کی شاعری دہلی کے اُس اسکول سے تعلق رکھتی ہے جو مرزا غالبؔ سے معنون ہے۔ وہ فانیؔ بدایونی کے شاگرد تھے اور فانیؔ بدایونی کا غالبؔ کے مکتبہ فکر سے اس قدر ربط تھا کہ اگر فانیؔ اپنی شاعری میں میر تقی میر کی یاسیت کا پیوند نہ لگاتے تو وہ مرزا غالبؔ کے طرزِ اظہار میں محصور ہوکر رہ جاتے۔ تابش دہلوی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فانیؔ کی یاسیت اور غالبؔ کی بلند آہنگی کو اس قدر ملائم کیا ہے کہ ان کا اپنا لہجہ ظہور میں آگیا ہے۔ اپنے اندازِ فکر اور لہجہ کے تعین کے لیے تابش دہلوی نہ صرف ایک طویل تجزیہ اور غور وفکر سے گزرے ہوں گے بلکہ انہوں نے اُس رمز تک رسائی بھی حاصل کی ہوگی جس نے غالبؔ کو غالبؔ اور فانیؔ کو فانیؔ کے مرتبے پر فائز کیا اور اسی بناپر تابش دہلوی کی شاعری روایت اور جدیدیت کے مابین نہ صرف ایک توازن کی نمائندہ ہے بلکہ شاعری کے اُس تاریخی تسلسل کا حصہ ہے، جس کا آغاز میرؔ سے ہوا اور جو فانیؔ پر آکر ٹھہر گیا۔ انہوں نے اردو شاعری کی تہذیبی اقدار کو اپنے فن میں اس طرح سمویا ہے کہ جہاں ایک طرف روایت کی

موثر نمائندگی ہو گئی ہے وہاں حال کی جدت کے مثبت خطوط بھی اجاگر ہو گئے ہیں''۔

تابش دہلوی کے ہاں غزل اپنے موضوعات کے تنوع اور پورے تہذیبی بانکپن کے ساتھ موجود ہے۔ فنی ریاضت اور تخلیقی قوت کے اشتراک عمل سے اُن کی شاعری ظہور کرتی ہے۔ خیالات کی فراوانی اور الفاظ و معانی کی یکجائی کا تابش دہلوی کے فکر و فن کی معیار بندی میں اہم کردار ہے''۔

فیصلہ اب یہ مکینوں ہی کو کرنا ہوگا — گھر کو گھر رکھنا ہے یا گھر کو مکاں رکھنا ہے

ہم نے تو عیب سدا اپنے ہنر کو سمجھا — لوگ تو بے ہنری کو بھی ہنر جانتے ہیں

اپنی شادابیِ غم کا مجھے اندازہ ہے — روح کا زخم پرانا ہے مگر تازہ ہے

چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر — پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے

مجھ سے کچھ خوش مرا ہمسایہ نہیں تھا لیکن — سایہ ہمسائے کی دیوار نے گھر پر رکھا

تو ہی رہتا ہے دیر تک موجود — بزم میں تو جہاں سے اٹھتا ہے

اک قدم ہم کو اٹھانا دشوار — اور یہی فاصلہ منزل ٹھہرا

اس قدر کوئے شب و روز سے ناواقف ہوں — بارِ ہستی نہیں معلوم کہاں رکھنا ہے

تو مل گیا ہے مگر شوق کے مراحل میں — تری تلاش تری جستجو تو اب بھی ہے

ہم نے اس دنیا کو اے اہلِ جہاں — اس قدر چاہا کہ نفرت ہو گئی

اپنی رسوائیوں کے پردے میں — ہم نے کس کس کو معتبر رکھا

پھر سینۂ آرزو میں ایک زخم — سورج کی طرح نکل رہا ہے

مجھ کو سنا کے میری ہی آواز بازگشت — کس کس کو میرا مد مقابل کہا گیا

دل کا مٹنا ہے سانحہ لیکن — ختم اک عہدِ آرزو تو ہوا

آئینہ در آئینہ ترا حسن — حیراں ہوں ترے طالبِ دیدار کہاں تک

maglib.org

تابش دہلوی کے معاصرین نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے تابش صاحب کو ایک ایسا شاعر قرار دیا ہے جس نے موجودہ عہد میں زبان و بیان کی لطافت اور حلاوت کو صحت کے ساتھ

یکجا کر کے غزل کی تخلیقی قوت کو اعتبار سے روشناس کرایا ہے۔ احسان دانش نے لکھا ہے کہ 'تابش دہلوی کی شاعری تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے'۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ 'تابش دہلوی کی شاعری میں معنی آفرینی اور دل نشینی کی ایک ایسی سنجیدہ فضا موجزن ہے جس سے ان کے بہت سے معاصر محروم ہیں'۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ 'تابش دہلوی نے اپنی غزل میں درد کی تہذیب اور غم کی شائستگی کے ساتھ ہی ساتھ حیات اور ماورائے حیات کے مسائل سے فن کی سطح پر نمٹنے کی خوبصورت اور موثر مثالیں پیش کی ہیں'۔ سلیم احمد نے لکھا ہے کہ 'تابش دہلوی کے ہاں زبان و بیان کے حوالے سے شاعری میں ایک ایسا ارتکاز اور صحت پائی جاتی ہے جو فی زمانہ کمیاب ہے'۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا خیال ہے کہ 'تابش دہلوی کی آواز اس دورِ شور آفریں میں ثقہ، سنجیدہ اور فکر خیز ہے'۔ تابش دہلوی خود اپنی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'میں خود جدید و قدیم کے سنگم پر کھڑا ہوا ہوں۔ اس لیے میری غزلوں میں آپ کو دونوں دھارے بہتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرے نزدیک جدت کا نام مہمل گوئی نہیں ہے بلکہ اسلوب کے نئے پن کو میں جدت سمجھتا ہوں۔ کوئی خیال نیا نہیں ہے۔ خیال کو صرف اسلوب و اظہار نیا پن دیتا ہے اور غزل کی شاعری میں نیا پن بڑی مشکل سے پیدا اور حاصل ہوتا ہے'۔ تابش دہلوی صاحب کو اظہار کے روایتی اسالیب کے استعمال پر جہاں قدرت حاصل ہے وہاں وہ اپنی فطری جدت و ندرت سے انفرادیت اور تازہ گوئی کو عام کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ جذبہ اور فکر کو ہم آہنگ کرنے پر ان کی مکمل توجہ رہتی ہے۔

شعر و ادب سے تابش دہلوی کا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی تھا۔ وہ اپنے والد کی طرف سے معروف فارسی شاعر مولوی نظام الدین نظامی اور والدہ کی طرف سے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی کے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ آپ کی اہلیہ کے رشتہ دار اور مرزا غالب رشتہ میں خالو تھے۔ تابش دہلوی ۱۹۱۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء تک اپنے ددھیال لکھنؤ میں رہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں حیدر آباد دکن سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال اردو کے سب سے معیاری رسالہ 'ماہنامہ ساقی' دہلی میں ان کی پہلی نظم شائع ہوئی۔ گویا ۱۹ سال کی عمر میں انہوں نے سند اعتبار پائی۔ ابتداً فانی بدایونی سے اصلاح لی لیکن رنگ فانی اختیار نہیں کیا۔ پہلا شعری مجموعہ 'نیم روز' ۱۹۶۳ء

میں شائع ہوا تھا اور اس مجموعہ کی تقریب تعارف اب سے چھیالیس (۴۶) سال قبل آرٹس کونسل، کراچی میں ہوئی تھی۔ تابش دہلوی کے اُن کی زندگی میں چھ شعری مجموعے شائع ہوئے، نیم روز (۱۹۶۳ء)، چراغ صحرا (۱۹۸۳ء)، غبار انجم (۱۹۸۴ء)، تقدیس (۱۹۸۴ء)، ماہ شکستہ (۱۹۹۳ء) اور دھوپ چھاؤں (۱۹۹۶ء) اس کے علاوہ انہوں نے اپنی یادوں کے حوالے سے ایک کتاب 'دید باز دید' بھی مرتب کی جو گزشتہ اسی سال کی ادبی سماجیات کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں شعرا وادبا اور فنون لطیفہ سے وابستہ افراد کے مثبت اور منفی رویوں کی خفی اور جلی داستانیں پھیلی ہوئی ہیں۔

تابش صاحب مشاعروں کو سماجی تہذیب کی تشکیل کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے مشاعروں کی اہمیت اور روایت پر نہ صرف مضامین تحریر کیے ہیں بلکہ اپنی زندگی میں تخمیناً پانچ ہزار سے زائد مشاعروں میں شرکت کی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ تابش دہلوی کی شاعرانہ اور مشاعرانہ مصروفیتوں سے ہٹ کر ایک مصروفیت اور بھی تھی اور وہ مصروفیت اپنے اہل خانہ اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے حوالے سے تھی۔ وہ ایک نہایت فعال سربراہ خانہ تھے۔ اکثر شعراء گھریلو ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی تو کیا واجبی طور پر بھی عہدہ برآ نہیں ہو پاتے لیکن تابش صاحب نے اس حوالے سے خود کو ایک مثالی شوہر اور مثالی باپ کے روپ میں پیش کیا اور آخری وقت تک اپنے گھر کے تمام کام بہ اصرار خود انجام دیتے رہے۔

تابش دہلوی کے شعری مجموعوں کی روشنی میں ان کی شاعری پر اب تک متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں بیشتر مضامین کو ان کے عزیز شاگرد محترم قیم میرٹھی نے ۱۹۹۹ء میں ایک خصوصی ضخیم مجلّہ 'نذر تابش' میں یکجا کر دیا تھا۔ نذر تابش میں شامل مضامین یقیناً بہت اہم ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اب تک کسی نقاد نے تابش دہلوی کے شعری مقام ومرتبہ کے تعین اور موجودہ دور میں ان کی شاعری کی اہمیت کے حوالے سے کوئی ایسا تجزیاتی مضمون تحریر نہیں کیا جو تابش دہلوی کی اُس فکری اور فنی مرکزیت کو دریافت کر سکے جو تابش دہلوی کو اردو کے اہم شعراء کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ محترم قیم میرٹھی کو یہ سبقت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ۲۰۰۶ء میں تابش صاحب کے تمام کلام کو یکجا کر کے کلیات کی صورت میں 'کشت نوا' کے عنوان سے

بقیہ ص ۱۲۳ پر

پروفیسر حسنین کاظمی صاحب

پروفیسر حسنین کاظمی صاحب سے یک طرفہ آشنائی بہت عرصے سے تھی۔ وہ کالج ٹیچرز ایسوی ایشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن جس زمانے میں، میں نے ایسوی ایشن میں دلچسپی لینا شروع کی اور اپنے کالج کے یونٹ کی نمائندگی کی تو کاظمی صاحب اس اسٹیج سے رخصت ہو چکے تھے۔ ٹریڈ یونین کی سیاست ہو یا ملکی سیاست، سیاست کار کے بارے میں بہت سی گفتنی ناگفتنی باتیں آنے والے کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ لیکن پروفیسر حسنین کاظمی صاحب ایسے شریف آدمی ہیں کہ اس حوالے سے ان کے بعد آنے والے افراد سے نہ کبھی گفتنی سننے کا اتفاق ہوا اور نہ ناگفتنی کا۔

وہ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں اور میں بھی لیکن ایک طویل عرصے تک ان سے صرف سالانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سالانہ ملاقاتوں کی تفصیل یہ ہے کہ ہر سال انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کی کاپیاں جانچنے کا کام ایک مرکزی مقام پر ہوتا ہے جسے اساتذہ کی اصطلاح میں Centralized Assesment کہا جاتا ہے۔ کئی سال ممتحن اول کے طور پر کاظمی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دھلا دھلایا پرسکون چہرہ، شیروانی، علی گڑھ کاٹ پجامہ ولباس اور گفتگو دونوں سے خوش ادائی اور جامہ زیبی کا اظہار۔ دھیما مزاج، مسکراہٹ اور اچھے فقرے اور پر مزاح بات پر مسرت کا اظہار بلند شگاف قہقہے کے بجائے چہرے کی سرخی سے ہوتا ہے۔ لباس میں بھی ہلکے رنگ پسند ہیں۔ امتحانی کاپیاں جانچنے کے ان مواقع پر بھی ان سے رسمی تعارف کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

کانپور کے تین آدمیوں کو قریب سے ملنے اور جاننے کا موقع ملا۔ سرشار صدیقی کہ اصل نام امان صدیقی ہے اور ان کے ایک شاعر دوست نے 'تلخ سلطاس' کا نام دیا ہے۔ مجھے سرشار صدیقی

صاحب کا ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سید ابوالخیر کشفی صاحب مزاج کے شاکی بہت ملے۔ اور اتفاق سے میرے ان سے مراسم ایک تلخ گفتگو کے بعد قائم ہوئے جسے معاف کرتے ہوئے کشفی صاحب نے اس اظہار کو سچائی کا اعتراف کہا تھا۔ کاظمی صاحب کے قریب ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کے روبرو تلخ بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ انہیں دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شرافت اور خاموشی بالآخر ہر چیز کو شکست دے دیتی ہے۔

میں نے ہر شعبہ اور ہر جگہ کاظمی صاب کو ان کی شرافت کی بنا پر لوگوں میں محترم پایا۔ وہ ایک اچھے استاد ہیں۔ انتظامی امور میں شرافت کے اظہار کی بنا پر ان کے ماتحت خود بخود اس بات کا خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ شریف آدمی ہیں۔ کاظمی صاحب نے ایک نجی کالج بھی قائم کیا تھا۔ جس کے وہ بانی پرنسپل تھے۔ یہ کالج امداد باہمی کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا اور اس میں کاظمی صاحب اپنے دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں معمولی سا زائد مشاہرہ وصول کرتے تھے۔

کسی زمانے میں جامعہ کی وائس چانسلری اور کالجوں، خاص طور سے مشہور کالجوں کی پرنسپلی باعث اعزاز و افتخار سمجھی جاتی تھی۔ زمانے کا رنگ ڈھنگ بدلا ہے تو اکثر شرفاء ان ذمہ داریوں کو عطائے تو بہ لقائے تو کہہ کر واپس کر دیتے ہیں۔ بعض سیاسی عہدوں کی طرح یہ منصب بھی اب زبردستی قبول کرنے پڑتے ہیں۔ ظفر اقبال کا ایک شعر اس صورت حال کے بارے میں خوب ہے۔

وہ نوک تیغ پہ رکھ لائے تھے ظفر دستار
قبول کر کے ہی آخر بچا ہے سر میرا

کاظمی صاحب نے بھی بدلے ہوئے حالات میں ایک بڑے کالج کی پرنسپلی کے فرائض انجام دیئے لیکن بالآخر گھبرا گئے۔ اس منصب کی بجا آوری میں اندیشہ ہائے دارو دراز تو بہت سے ہیں لیکن کاظمی صاحب نیک نامی کو ہی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کالج کا کوئی دفتری اہل کار ان کے نام سے کسی طالب علم سے معمولی سا نذرانہ بھی طلب کر بیٹھا تو وہ کیا کریں گے اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ ایسے امکانات بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ میں ان کے کالج میں ٹرانسفر ہو کر گیا تو راہ میں یہی سوچتا ہوا گیا کہ اب دیکھیں کیا معاملہ درپیش ہو۔ اور اب کاظمی صاحب سے ملاقات ہوگی جن سے سالانہ امتحانات کے مواقع کے علاوہ اب ٹی وی پروگرام

، تفہیم دین کے ذریعے بھی ملاقات ہونے لگی ہے۔ ٹی وی کا پروگرام ہو یا اخبار میں ان کے مضامین ہوں یا دائرے میں ان کی حسن ادارت کا معاملہ ہر جگہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کا خاص میدان یہی ہے۔ ان سے قربت ہو جانے اور گھنٹوں ان کے سامنے بیٹھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کی پہلی اور آخری محبت پاکستان اور قائداعظم ہے۔ اور باقی جو کچھ بچا ہے وہ اس عشق کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ قائداعظم سے ایسی محبت کرنے والا یا تو میں نے ایک آدمی دیکھا ہے جس کا ذکر اپنے افسانے قطبی میں کر چکا ہوں یا پھر کاظمی صاحب کو ایسا والا اور شیدا پایا۔ یوں تو بہت سے سیاست دان جناح صاحب کا نام لیتے نہیں تھکتے، لیکن اس میں ایک غرض مندی کا گمان گزرتا ہے۔ جب کہ کاظمی صاحب جناح صاحب کا نام ازراہ محبت لیتے ہیں اور اس محبت کی یاد دلاتے ہیں جو برصغیر کے کروڑوں عام سے انسانوں کے دلوں میں تھی اور جس محبت نے پاکستان کے قیام کو ممکن بنایا۔ یہ معجزہ فن عام سے مسلمانوں کے خون جگر سے نمود پایا ہے۔ مشاہیر شخصیات سے ان کی محبت کے دائرے کو اور توسیع دیں تو اس میں مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ثانی الذکر دونوں شخصیات سے محبت کا اظہار بھی وہ عجیب اور مشروط انداز میں کرتے ہیں مثلاً حسرت موہانی یاد آ گئے تو قائداعظم بھی یاد آئے اور فرمانے لگے کہ قائداعظم کی عظمت اپنی جگہ مگر حسرت موہانی کی بھی کیا بات تھی؟ اس طرح کسی شعر پر غالب یاد آیا تو فرمایا اقبال اپنی جگہ مگر غالب واقعی غالب ہے۔ یہ انداز محبت منفی نہیں، مثبت ہے۔ اس میں ہٹ دھرمی نہیں اخلاص اور احترام ہے۔

ملک کی سیاسی صورت حال ایسی رہی ہے کہ اس کی بنا پر بعض اردو بولنے والے بھی اقبال کے مخالف ہو گئے۔ مگر ہر شاعر کی عظمت کے حقیقی اسباب پر نظر رکھنے والے کاظمی صاحب نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ اقبال کا جب انتقال ہوا تو سیماب اکبرآبادی نے فرمایا تھا کہ مجھے تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ اور پھر ہنس پڑے اور کہنے لگے 'ہوتا ہے، ہوتا ہے' لیکن اس میں بھی وہ سیماب اکبر آبادی کی 'غلط فہمی' کا لفظ نہیں لائے، بلکہ ہنس دیئے۔ اس پر میں نے انہیں چراغ حسن حسرت کے نام فیض کا ایک خط سنایا جو انہوں نے زنداں سے لکھا تھا اور اپنے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے فارسی کا کوئی شعر لکھ دیا تھا اور پھر آخر میں لکھا تھا کہ اس وقت حضرت آسی غازی پوری یاد آ گئے جو

غالب کے ہر شعر کی تشریح بیان کر چکنے کے بعد اپنا شعر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں 'راقم نے بھی کہا ہے، راقم نے یہی کہا تھا'۔

کالج اساتذہ کے تقرر میں پبلک سروس کمیشن میں کاظمی صاحب بطور ماہر مضمون کے بھی جاتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ ایک امیدوار کو اقبال کی شاعری سے آگاہی کا مشورہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ کاظمی صاحب کو اقبال سے بڑا شغف ہے۔ بعض شاعر بعد مرون روزگار کے حصول کے لیے کیسا اچھا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ بقول احسان دانش:

خدا کا شکر ہے کچھ لوگ رزق پاتے ہیں
ہمارے شعر کا مطلب نکالنے کے لیے

تین چار برس ہوئے کہ سننے میں آیا کہ حسنین کاظمی صاحب دائرہ کے نام سے ایک ماہوار ادبی پرچے کا اجرا کر رہے ہیں۔ رسالے کے اجرا سے قبل اپنے بعض دوستوں کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو یہی معلوم ہوا کہ حسنین کاظمی صاحب مضامین و مقالے کے لیے تشریف لائے تھے۔ لاعلمی کی بنا پر ہمارے ہاں بہت سی غلط فہمیاں بلکہ غلط بیانیاں اور افواہیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ اتفاق سے ایک اہم سرکاری محکمے کے ایک بڑے افسر کاظمی صاحب کے دیرینہ دوست تھے۔ لہذا یہ بھی سننے میں آیا کہ ان صاحب کے اثر و رسوخ سے کام لے کر کاظمی صاحب اس رسالے میں بہت سے اشتہارات حاصل کریں گے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ رسالہ نکالا ہی اس مقصد کے لیے جا رہا ہے۔ لیکن جب مجھے ان سے قریب ہونے کا موقع ملا تو یہ حقیقت کھلی کہ اشتہارات کا تو دور دور تک پتہ نہیں اور اگر اس پرچے کی ناشر داؤد بھائی فاؤنڈیشن نہ ہوتی تو یہ مسلسل خسارے کی بنا پر اب تک بند ہو چکا ہوتا۔ کاظمی صاحب نے ایک ایڈیٹر کی طرح آبرو اور وقار کے ساتھ رسالے کے لیے اشتہارات کی کوشش کی۔ مشتہرین کے نام اس نوع کے خط لکھے کہ ادب و تہذیب کے فروغ کے لیے مشترکہ کوششیں اور تعاون ہم سب کا فرض ہے لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ آج دائرے کو شائع ہوتے ہوئے چار سال کا عرصہ ہونے کو آیا۔ لیکن اس میں نیشنل بنک اور ہمدرد کے علاوہ شاید ہی کسی اور ادارے کا کوئی اشتہار پابندی سے شائع ہوا ہو۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ حسنین کاظمی صاحب ایک ادبی رسالہ نکال رہے ہیں تو مجھے حیرت

ہوئی اس لیے کہ ادبی رسالہ نکالنا کوئی آسان بات نہیں۔ مشترین تعاون نہیں کرتے اور ارباب قلم شکوہ کرنے سے نہیں تھکتے۔ بلکہ ہمیشہ شکوے سے پر رہتے ہیں۔ اور ادیبوں شاعروں کا سب سے بڑا شکوہ مدیر سے یہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کے جائز مقام پر شائع نہیں کیا گیا۔ اس طرح ہر شاعر و ادیب کا نام اور تخلیق مقامات آہ و فغاں بن کر رہ جاتی ہے۔ مدیر اور اہل قلم کا معاملہ بھی اس کہاوت کے مانند ہے کہ جب میں مدیر تھا تو ادیب اچھے نہیں ملے اور ادیب بنا تو مدیر اچھے نہیں ملے۔ شکوے کی اس تکنیک میں اب مزید ترقی ہوگئی ہے۔ بعض اہل قلم اپنی بجائے اپنے شکوے کو اپنی اہلیہ محترمہ کے حوالے سے یوں بیان کرنے لگے ہیں کہ آپ کی بھابی یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کے بھائی کو صحیح مقام پر نہیں چھاپا گیا۔ یا آپ کی بھابی یہ کہہ رہی ہیں تھیں کہ سب کی کتابوں کے اشتہار چھپتے ہیں آخر مدیر کو آپ سے کیا دشمنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے شکوے شکایت کاظمی صاحب کو بھی سننے کے بارہا مواقع ملے لیکن ان کی فطری شرافت نے کوئی عذر یا کوئی جواب دینا پسند نہ کیا۔

مدیروں کے دفتروں میں آنے جانے والے ادیبوں شاعروں کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ پوری برادری ہر دفتر میں جا کر مدیر کے لیے وہی تعریفی الفاظ استعمال کرتی ہے جو پہلے کسی اور کے لیے استعمال کر چکی اور یکساں انداز کے خطوط سے مدیروں کو نوازتی رہی۔ مدیر افکار صہبا لکھنوی جب کسی صاحب قلم کی اپنے دفتر میں آمد پر ناراض ہوا کرتے تھے تو اس کے جانے کے بعد ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ایڈیٹر کا دفتر اور رنڈی کا کوٹھا ایک جیسا ہوتا ہے اس میں کسی کو آنے جانے سے کیسے منع کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ مماثلت مناسب اور موزوں ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ مدیروں کی مرضی و منشا کے بغیر رسالوں کے دفتروں میں اہل قلم کی ہارس ٹریڈنگ ضرور نظر آتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ حسنین کاظمی صاحب کے دفتر میں بھی اہل قلم کا مجمع ہوا کرے گا لیکن چونکہ کاظمی صاحب کی اپنی کوئی ادبی لابی نہیں اور نہ ہی وہ کسی کی عدم موجودگی میں اس پر یقین رکھتے ہیں لہذا کبھی مدیر کے کمرے میں مجمع نہ لگ سکا۔

پرچہ نکالنے کا شوق کاظمی صاحب کا پرانا شوق ہے۔ انہوں نے کم عمری میں ہی کانپور سے شیرازہ کے نام سے ایک ادبی پرچہ نکالا تھا۔ اور اس کے پہلے شمارے میں ہی فیض صاحب پر ایک

مضمون شائع کیا تھا۔ فیض صاحب کو یہ بات یاد تھی اور ایک مرتبہ انہوں نے ایک صاحب سے پوچھا تھا کہ یہ وہی حسنین کاظمی ہیں جنہوں نے شیرازہ کے نام سے ایک ادبی پرچہ نکالا تھا۔

جب کبھی فیض صاحب کی اشتراکیت، الحاد وغیرہ کا ذکر آیا تو کاظمی صاحب نے ہمیشہ یہ کہا کہ ہمارے ہاں آدمی کو دور کرنے کے آسان طریقے رائج ہیں۔ وہ افسوس کیا کرتے تھے کہ انہیں فیض صاحب سے کبھی گفتگو کرنے کا موقع ملتا اور اس کے اظہار کی صورت پیدا ہوتی تو فیض صاحب پر چھائی ہوئی ملامت کی گھٹا کچھ نہ کچھ چھٹ جاتی۔ ایک زمانے میں پاکستانی ثقافت کے مسئلے پر فیض صاحب، کرار صاحب، اور بعض دوسرے دانشوروں کی تقاریر ٹیلی ویژن پر نشر ہوئی تھیں۔ کاظمی صاحب نے اس بحث پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ مہاجروں نے پاکستان بنادیا اب انہیں سیاسی عمل کے بجائے ادب، تہذیب وثقافت کے محاذوں پر اپنے آپ کو سرگرم عمل کرنا چاہیے اور سیاسی عمل سے اجتناب برتنا چاہیے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کاظمی صاحب کی یہ تجویز اور رائے بڑی بصیرت افروز اور بروقت تھی۔ کیونکہ مہاجروں کے سیاسی محاذ پر سرگرم عمل ہونے سے پاکستان کی تمام قومیتوں کے عام افراد خائف نہیں ہیں بلکہ وڈیرے اور جاگیردار خائف ہیں۔ اس بنا پر کہ اس بیداری اور اس کے اثرات کے پھیلاؤ سے سیاست کی پشتینی گدیاں خطرے میں پڑنے کا ڈر ہے۔ کاظمی صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے معروف صحافی اور دانش ور زیڈ اے سلہری نے لکھا تھا کہ اگر پاکستان بنانے والے ہی یہ سوچنے لگیں تو پھر کیا ہوگا؟ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی جماعتیں مقبول ہوئیں لیکن میرے خیال میں مہاجروں اور ان کی آل اولاد کو کم از کم ایک صدی تک سیاست سے دور رہنا چاہیے۔ اس ایک صدی کے بعد دوسری قومیتوں کے دلوں سے یہ بات بھی دور ہو جائے گی کہ وہ فرزند زمین نہیں ہیں۔ اور شاید اس عرصے میں قومی سطح پر کوئی ایسا معجزہ نمودار ہو جائے کہ پاکستانی سیاست وڈیروں اور جاگیرداروں کی ذاتی سیاسی پارٹیوں کے بجائے حقیقی سیاسی پارٹیوں کی شکل اختیار کرلے۔

کاظمی صاحب تو مہاجروں کو سیاسی عمل سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے ممدوح علامہ اقبال نے تو ایک ایسی بات کہی تھی جس سے ان کی سیاسی بصیرت اور دور بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالباً عاشق حسین بٹالوی نے اقبال کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ علامہ مرحوم نے کہا تھا کہ

مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانوں کی نقل مکانی کو کسی طرح روکا جائے۔ ان کی نگہ بصیرت شناس دیکھ رہی تھی کہ ایک طویل عرصے سے شمالی خطے میں مسلمان جس زبوں حالی کا شکار رہے ہیں۔ بالآخر وہ اپنے ہم مذہب آبادی کی نقل مکانی کے نتیجے میں ایسے تضادات کا شکار ہو جائیں گے جو مسلمانوں کی اس نئی مملکت کو بے شمار مسائل کی آماجگاہ بنا دے گا۔ علامہ اقبال کسی طرح ان لاکھوں مسلمانوں کی نقل مکانی یا ہجرت کو اس لیے بھی بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ اس سے بہر حال یو پی کے مسلمانوں کو غیر معمولی معاشی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بجا ہے کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں نے سکھوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر پاکستان ہجرت کی لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں نے نئی مملکت کے نظم ونسق چلانے اور خلا کو پر کرنے کے لیے قائداعظم کے فرمان پر ہجرت کی۔ اگر اس وقت عرب ملکوں کی طرح تعلیم یافتہ اور ناگزیر افراد کو عارضی مدت کے لیے نوکریوں کی خاطر طلب کیا جاتا تو میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا۔ آج بہت سے سیاسی افراد پاکستان کے مسائل کا ذمے دار مہاجروں اور بمبئی کے تاجروں وغیرہ کو ٹھہراتے ہیں۔ جب کہ میں شمالی ہند میں قائم مسلمان بادشاہوں کے ایک ہزار سالہ دور کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ انہوں نے موجودہ پاکستان کے باشندوں کے لیے وہ کچھ نہ کیا جس کے وہ بحیثیت شہری اور مسلمان حق دار تھے۔

مذکورہ بالا باتیں اس لیے بھی یاد آ گئیں کہ کاظمی صاحب نے 'تحریک پاکستان مشاہدات و تاثرات' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جسے دادا بھائی فاؤنڈیشن نے ہی شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اخبارات میں مشتہر کیے جانے والے ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو اس کے فاضل مرتب نے پاکستان کے لیے ہجرت کرنے والوں سے دریافت کیے تھے۔ اس میں غالباً شملے سے ہجرت کر کے آنے والے ایک صاحب نے یہ لکھا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل پاکستان کے ایک مخالف نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ پاکستان کے حق میں کیوں ہے؟ اور ان صاحب نے جواب دیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں اس کا حق ہندو غصب کرے گا' پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اگر پاکستان میں بھی اس کے حقوق کسی نے غصب کر لیے تو؟ اس پر ان صاحب نے جواب دیا کہ کم از کم انہیں اس بات کا اطمینان ہوگا کہ ان کا حق ان کا ایک مسلمان بھائی غصب کر رہا

ہے۔ کاظمی صاحب نے یہ سوال جواب پڑھے، ان کی تعریف کی اور اس قابل قدر جوش و جذبے پر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

میں نے عرض کیا ان صاحب کا یہ جذباتی بیان اور جوش و خروش اپنی جگہ قابل تعریف ہے لیکن تاریخ ایسے تجربات کے حق میں مہر تصدیق ثبت نہیں کرتی'۔

ایک مرتبہ کاظمی صاحب کہنے لگے کہ اکثر لوگ مجھے شیعہ سمجھتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ میں شیعہ نہیں ہوں۔ میں انہیں اب کیا بتاتا کہ ایک طویل عرصے تک میں بھی انہیں شیعہ سمجھتا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ یہ صورت حال بھی عجیب و غریب ہے۔ ان کے نام آئے ہوئے بعض ایسے خطوط بھی میں نے دیکھے جس کا آغاز 'یا علی مدد' اور 'علی مولا' وغیرہ سے ہوتا ہے۔ منقبتیں بھی بہت سی آئیں۔ تفہیم دین کے حوالے سے بعض بدگمان سنیوں نے انہیں ایسے خطوط بھی تحریر کیے کہ وہ پورا پروگرام تو بہت مناسب انداز میں کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں درمیان یا آخر میں اپنے مسلک کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر نے یہ جانا کہ مسلمان ہوں میں

ایسے رویوں کے بارے میں مولانا روم بہت پہلے متنبہ کر چکے ہیں:

اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

غالب مرحوم بھی اس مسئلے سے دوچار ہوئے تھے۔ اور بندگی بوتراب میں خود کو مشغول حق سمجھنے والے غالب نے بقول خلیفہ عبدالحکیم یہ کہہ کر اپنے نظریے کی وضاحت کی تھی کہ 'شیعی کیوں کر ہو ماوراالنہری'۔ دیکھیں ہمارے کاظمی صاحب کون سا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

کاظمی صاحب کی ایک عادت سے مجھے بڑی الجھن سی محسوس ہوتی ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں اور جھوٹا وعدہ بھی کم کرتے ہیں خیر آخرالذکر بات تو اس معاشرے میں ایک جہاد سے کم نہیں ہے۔ لیکن فیصلے میں تاخیر کرنے کی اس عادت سے میں کبھی کبھی حیران ہوا کرتا ہوں کہ وہ بڑے بڑے اہم مناصب پر فائز رہے ہیں۔ جب فوری فیصلے کرنے کی ضرورت درپیش ہوا کرتی ہوگی تو وہ کیا کرتے ہوں گے؟ شاید اس تاخیر کو بھی ان کی شرافت کے پیش نظر برداشت کرلیا جاتا

ہوگا۔

کاظمی صاحب نے دائرے کا پہلا شمارہ شائع کیا تو بہت سے قارئین کو مایوسی ہوئی اور بہت سے افراد نے اس بات کو پسند کیا کہ کاظمی صاحب ادب، مذہب اور تحریک پاکستان کو یک جا کر کے پیش کرتے رہیں گے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس طرح وہ ادب، تحریک پاکستان اور اسلام کسی کی خدمت بھی نہیں کر سکیں گے۔ مگر کاظمی صاحب اپنی بات پر ثابت قدم رہے۔ اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس طرح بھی وہ ایک رنگا رنگ گلدستہ پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ دائرہ کے شمارہ اول میں پہلا مضمون اسلامی تھا۔ اور باقی مندرجات پر بھی کم و بیش ایسا ہی رنگ نمایاں تھا۔ دوسرے شمارے میں اتفاق سے حیات اللہ انصاری کا ایک طویل مقالہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے 'گرہن' اور 'دیو مالا' کے حوالے سے شائع ہوا۔ اس میں انصاری صاحب نے بے احتیاطی کے ساتھ بعض جنسی حوالوں کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ کاظمی صاحب کے بچپن کے دوست سید ابوالخیر کشفی صاحب نے اس پر خوب جملہ کہا کہ "پہلے شمارے کا آغاز اسلام سے اور دوسرے ہی شمارے سے دیو مالا پر اتر آئے"۔

اتفاق سے ایک اور جگہ بھی حیات اللہ انصاری کا یہ مضمون زیر بحث یوں آ گیا کہ ایک صاحب نے جیسے ہی ورق گردانی شروع کی تو ان کی نظر فوراً ہی مذکورہ مضمون کے ناگفتہ حصوں پر جا پڑی۔ وہ صاحب بولے "یہ کاظمی صاحب کو کیا ہو گیا ہے میں جانتا ہوں وہ شریف آدمی ہیں"۔

میں نے ان سے کہا کہ "صاحب یہ ادب ہے اس میں بعض مرتبہ ایسی باتیں آ جاتی ہیں اور پھر مصنف ہندوستان کا شہری ہے جہاں اظہار پر ہمارے ملک کی طرح اخلاقی پابندیاں کم سے کم ہیں"۔ وہ صاحب میرے جواب سے متفق نہ ہوئے اور بولے "کیا کدو کا ادب ہے؟ سراسر بے ادبی ہے اور پھر کاظمی صاحب جیسے شریف آدمی کی طرف سے"۔

آخر میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا "آپ حیات اللہ انصاری صاحب کو کاظمی صاحب کی وجہ سے اور کاظمی صاحب کو ان کی شرافت کی وجہ سے معاف کر دیجیے" اس پر وہ صاحب مسکراتے ہوئے چپ ہو گئے۔ شاید محکمہ اطلاعات کے سنسر کے شعبے نے بھی ان کی توجہ اس جانب دلائی اور ان کی شرافت کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔ حتیٰ کہ مرحوم جنرل ضیاء الحق نے بھی انہیں کچھ

نہیں کہا۔ دادا بھائی ایوارڈ تقسیم کرنے ضیاء الحق آئے تو انہوں نے دائرے کی بر سرِ محفل تعریف کی اور دوسرے شمارے میں مطبوعہ حیات اللہ انصاری کے مضمون کی اشاعت کی طرف بھی انکسارانہ توجہ دلائی۔ اس تقریب میں جب ہال کی بتیاں تھوڑی دیر کے لیے گل کر کے حرمین شریفین اور مسجد نبوی کی فلم دکھائی گئی اور پروگرام بڑا اثر آفریں اور پروقار ہو گیا تھا تو سرشار صدیقی نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ کیا پتہ تھا کہ ایک خاموش خاموش اور شریف سالڑکا کسی دن ایسی ایسی تقریبات بھی کرے گا۔ سرشار صدیقی بظاہر کاظمی صاحب سے عمر میں چھوٹے لگتے ہیں لیکن شاید ایک آدھ سال بڑے ہوں گے۔ کاظمی صاحب، کشفی صاحب، سرشار صاحب، اور زیب غوری کو دیکھ کر یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید ہی کانپور کی طرح کوئی اور شہر ایسے متضاد شخصیت رکھتا ہوگا۔ زیب غوری نے اپنا مجموعہ 'چاک' کاظمی صاحب کو بڑے خوبصورت الفاظ کے ساتھ لکھ کر دیا۔ اس میں کانپور کے کسی فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے نمک کے بوروں کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کاظمی صاحب یہ بورے جس جگہ چھوڑ کر آئے تھے وہ ابھی تک اسی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ آپ بھی زیب غوری کے یہ الفاظ ملاحظہ کریں......

''کاظمی صاحب اول تو کسی کو کوئی امید دلاتے نہیں اور اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن ہو گیا تو پھر وہ امید اور توقع کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیتے مجھے امید ہے کہ دائرے بھی خسارے کے باوجود ان کی اسی نیک نیتی کی بنا پر چلتا رہے گا کہ ہر ماہ سینکڑوں ادیب و شاعر بلا معاوضہ ان کے پرچے کے منتظر رہتے ہیں۔ اب بھلا یہ سلسلہ کیسے منقطع ہو سکتا ہے''۔

کاظمی صاحب کے زمانہ شباب میں پاکستانی نوجوان یا تو کیمونسٹ ہوا کرتے تھے یا پھر غلام جیلانی برق اور غلام احمد پرویز کے معتقد ہوا کرتے تھے۔ کاظمی صاحب بھی ایک زمانہ میں اپنے بچپن کے دوست سید ابوالخیر کشفی صاحب کے ساتھ غلام احمد پرویز کے عقیدت مندوں میں شامل تھے ان کے نام سے پرویز صاحب کے بارے میں مداحانہ انداز کا ایک کتابچہ بھی کبھی شائع ہوا تھا۔ ایک دن کاظمی صاحب نے اس کتابچے کے اصل مصنف کی شخصیت سے بھی پردہ اٹھا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کتابچہ، کشفی صاحب نے لکھا تھا لیکن اپنی کسی مصلحت کی بنا پر انہوں نے کاظمی صاحب کا نام بطور مصنف اس پر لکھ دیا تھا۔ یہ وضاحت اپنی جگہ مگر اسے ہماری آج کی دونوں

محترم شخصیات پروفیسر حسنین کاظمی صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب کی زمانہ نوجوانی کی غلطی کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ دونوں صاحبان پکے اور سچے مسلمان ہیں۔

بقیہ تابش دہلوی

محفوظ کردیا ہے۔

کلیات کسی شاعر کے احساس و اظہار تک رسائی کا ایک ذریعہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ کسی شاعر کی تخلیقی قوت کا ہشت پہلو آئینہ بھی ہوتا ہے۔ اور یقیناً تابش دہلوی اس کلیات کے آئینہ میں اپنی پرگوئی، فطری ذہانت، فنی استقامت اور متخیلہ کی بھرپور قوت کے ساتھ پورے کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

موصولہ رسائل

نیرنگ خیال، سلطان رشک ۲۲۱۔ پی ایم اے ہاؤس، راولپنڈی

شاعر (بمبئی) افتخار امام صدیقی، پوسٹ بکس ۷۷۰۶، گرگام پوسٹ آفس، بمبئی

اجمال نعیم الاسلام انصاری، ہم لوگ جبلی کیشنز A-201، اجمیر پرائڈ گلستان جوہر، کراچی

ادب لطیف، مدیرہ صدیقہ بیگم ۳۹، گرین ایکرز رائے ونڈ روڈ لاہور۔

پیام ہوی، مدیرہ حمیرا راحت، اے ۳۶ بلاک ۸، عزیز آباد، ایف بی ایریا کراچی

لوح ادب، مدیر اعلیٰ شکیل احمد خان، ادارہ بزم صادق ۲۱۔ اے لطیف آباد، حیدرآباد

تہذیب، مجمد ذاکر علی خاں، علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان ایم آر کیانی روڈ، کراچی

مخزن (۱۰) مرتب منصور الحق شیخ، بریڈفورڈ، برطانیہ

کتابی سلسلہ، مدیر مرتضیٰ شریف، سلسلہ جبلی کیشنز کراچی

ماہنامہ ضیائے آفاق، مدیر سجاد حیدر۔ رحمان مارکیٹ غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور

ماہنامہ نفاذ اردو، مدیر شبیر احمد انصاری، جی ۱۸، بلاک بی شمالی ناظم آباد، کراچی

بازیافت (ن م راشد نمبر) مدیر ڈاکٹر تحسین فراقی، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج

قرطاس (سالنامہ) جان کاشمیری / مکنون احمد جان، بی ۳۰، ہائیٹس کالونی شاہین آباد بجلی گھر، گوجرانوالہ

شاعری۔ مرتب سہیل غازی پوری، آر ۱۰۵۵، بلاک ۹ دستگیر سوسائٹی، ایف بی ایریا کراچی

بیلاگ، مدیر اعلیٰ، عزیز جبران انصاری، جبران اشاعت گھر، عائشہ منزل اردو بازار کراچی

تخلیق، مدیر، اظہر جاوید، بھگوان اسٹریٹ پرانی انارکلی لاہور

تجدید نو، مدیران: عذرا اصغر / شبہ طراز ۱۳۰، رحمٰن ہاؤسنگ سوسائٹی BOR جوہر ٹاؤن لاہور

پروفیسر رئیس فاطمہ

شعلۂ مستعجل

مدیر 'انشا' کی فرمائش پہ جب میں نے کسی شخصیت کا خاکہ لکھنے کا ارادہ کیا تو بہت ساری شخصیات نگینوں کی طرح جگمگاتی نظر آئیں۔ ان میں میرے اساتذہ بھی تھے، ساتھی بھی تھے اور بہت سی دوسری نامور ہستیاں بھی تھیں۔ ان میں سے میں نے سید ذوالفقار علی بخاری کا انتخاب کیا جو ایک مایہ ناز براڈ کاسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر، ایک ادیب اور ماہر موسیقی بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے والد کے نوجوانی کے زمانے کے دوست تھے، شملہ میں دونوں کا بہت ساتھ رہا۔ موسیقی اور تھیٹر دونوں کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ اور میرے لیے وہ بخاری چچا تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن پہ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی زندگی کے بے شمار گوشوں سے واقفیت مجھے والد صاحب ہی کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔ جب شخصیت طے ہوگئی تو کاغذ قلم سنبھالا...... ابھی لکھنا شروع بھی نہ کیا تھا کہ ایک چہرہ میری نگاہوں میں ابھرا...... کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، گہری رنگت، بڑی بڑی زمانہ شناس آنکھیں، جن کی چمک اور انسان شناسی چشمے کے شیشوں کے پیچھے سے بھی عیاں تھی۔ سر کے بال درمیانی مانگ کے ذریعے دونوں حصوں میں تقسیم، لمبا قد، کسرتی بدن، زیادہ تر لباس بش شرٹ اور پتلون، ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ، ہمہ وقت سیماب صفت، کہ جو بھی ہو جلد ہی ہو جائے...... یہ چہرہ مجسم ہو کے میرے سامنے آیا اور سرگوشی کی...... مجھے بھول گئیں......؟؟...... میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا...... ارے......!!...... یہ تو حسن ظہیر ہیں...... میری آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں...... حسن ظہیر میرے بھائی...... تم جب بھی یاد آتے ہو، مجھے اپنے آنسوؤں پہ اختیار نہیں رہتا...... تمہارے سارے دوست احباب اور انجمن کے تمام لوگوں کو تمہاری کمی محسوس ہوتی ہے۔ احفاظ الرحمٰن صاحب ہوں یا قاضی اختر صاحب سب تمہیں یاد کرتے ہیں...... حسن ظہیر...... میرے بھائی تمہیں اتنی جلدی کیا تھی مرنے کی...... غالب

نے شاید تمہارے لیے ہی یہ مرثیہ لکھا تھا۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم نے انجمن کے پلاٹ کو قبضہ مافیا سے چھڑایا۔ شاید تم اسی لیے انجمن آئے تھے۔ کیا کیا منصوبے نہ تھے تمہارے پاس۔ اکادمی ادبیات کی طرز پہ ادیبوں کے ٹھہرنے کے لیے ہوسٹل بنوانا، لائبریری کو وسعت دینا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تحقیق و تنقید کے حوالے سے جینوئن لوگوں کو سامنے لانا اور ان سے کام کروانا۔ تم تو شعلہ مستعجل تھے۔ اپنی جھلک دکھلائی اور بجھ گئے۔ لیکن جھلک بھی ایسی کہ سارا ماحول منور ہو گیا۔ لیکن یہ روشنی اتنے کم عرصے کے لیے تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

کئی سال پرانی بات ہے کہ 'ایکسپریس' کے ادارتی صفحے پر کالم نگار کی حیثیت سے ایک نام ابھرا..... یہ نام تھا حسن ظہیر کا..... پھر ایک دن میرے پاس ایک فون آیا۔

"جی فرمایئے" میں نے کہا۔

"جی میں حسن ظہیر بول رہا ہوں..... آپ یقیناً نرگس فاطمہ ہیں"

"جی ہاں بالکل..... لیکن آپ نے کیسے جانا کہ میں کون ہوں"

"محترمہ..... میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ دو چوٹیاں باندھتی تھیں، کراچی کالج کی سرگرم طالبہ تھیں۔ یونین کی صدر تھیں اور بزم طلبہ میں باقاعدگی سے شرکت کرتی تھیں..... اور..... اور روزنامہ جنگ میں 'نذر طالبات' کے نام سے کالم لکھتی تھیں"۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی..... "لیکن میں تو آپ سے کبھی نہیں ملی"

"ملی ہیں...... لیکن یاد نہیں رکھا...... بزمِ طلبہ کے بیشتر پروگراموں میں اور بہت سے کالجوں کے فنکشن میں۔ کیونکہ میں بھی ایک سرگرم طالب علم تھا"

پھر اکثر باتیں ہوتی رہیں۔ حسن ظہیر نے انجمن ترقی اردو میں بحیثیت جوائنٹ سیکریٹری آ کر اسے بہت فعال کر دیا تھا۔ انجمن پر بوجوہ جو ایک مردنی سی چھائی رہتی تھی، ہر شخص اپنے خول میں بند ڈرا ڈرا اور سہما سہما سا رہتا تھا۔ حسن ظہیر نے آ کر جیسے سب کے منہ کے قفل توڑ ڈالے تھے۔ اب انجمن میں ایک زندگی ایک رونق نظر آتی تھی۔ جو بلاشبہ حسن ظہیر کی ذات کا کرشمہ تھی۔ میرا بھی اب آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بطور خاص انجمن طلب کیا۔ میں پہنچی تو وہ حسب عادت سگریٹ کے کش لے رہے تھے اور ذرا جلدی میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چائے منگوائی اور بولے۔

"آپ کی آٹھ کتابیں آ چکی ہیں۔ لیکن آپ نے کوئی کام انجمن کے لیے نہیں کیا، لکھنے لکھانے کے معاملے میں سنجیدہ ہونے کے باوجود آپ نے انجمن کو کیوں فراموش کیا۔ جبکہ آپ کا خود بھی تعلق انجمن سے رہا ہے۔ اور آپ کے نامی گرامی سسر جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا گہرا تعلق بھی بابائے اردو اور انجمن سے رہا ہے"۔

میں نے ان کی بات سن کر خود انہیں سے سوال کر ڈالا۔

"آپ کہتے ہیں کہ آپ مجھے جانتے ہیں، میری مصروفیات اور کام سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں...... آپ بتایئے ریڈیو کا بزم طلبہ ہو، ٹی وی کے طلبہ کے پروگرام ہوں، جنگ اور دوسرے اخبارات و رسائل میں لکھنا ہو، کیا میں نے ان سب کے لیے کوئی سفارش یا خوشامد استعمال کی؟"

وہ جھٹ سے بولے...... "ہرگز نہیں...... آپ نے جو کچھ حاصل کیا اپنے قلم کی طاقت سے حاصل کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے"

"تو پھر میں اب بھی یہی چاہتی تھی کہ انجمن کے لیے کام کروں...... لیکن اس کے لیے مجھے نہ کسی کی خوشامد کرنا پڑے اور نہ کسی کی سفارش درکار ہو۔ اگر انجمن سمجھتی ہے کہ میں کسی قابل ہوں اور کچھ کر سکتی ہوں تو اسے خود آفر کرنا چاہیے"...... میں نے وضاحت سے کہا۔

حسن ظہیر نے فون اٹینڈ کرنے کے بعد اچانک مجھ سے پوچھا...... "اگر میں آپ سے پوچھوں کہ آپ انجمن کے لیے کس موضوع پر کام کرنا پسند کریں گی تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟"

"قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ"...... میں نے فوراً جواب دیا۔

"بہت خوب...... گویا طے کر کے بیٹھی تھیں"۔ وہ ہنسے۔

"ہاں...... بالکل طے کر کے بیٹھی تھی کہ یہ کتاب بھی میں خود شائع کروں گی"

"نہیں یہ کتاب اب انجمن سے شائع ہوگی"۔ انہوں نے یقین سے کہا۔

"Done" میں نے کہا۔

"بالکل...... Done" وہ بولے۔

"انہوں نے اپنے بریف کیس سے ایک کاغذ نکال کر دیا اور بولے

"اس پر آپ جناب جمیل الدین عالی کے نام ایک درخواست لکھ دیجئے۔ کہ آپ یہ کام کرنا چاہتی ہیں"

میں نے تعجب سے انہیں دیکھا اور کہا۔

"ابھی تو آپ نے فرمایا Done اور اب کہہ رہے ہیں کہ ایک عدد درخواست لکھوں...... تو فیصلہ تو درخواست کا جواب آنے کے بعد ہوگا نا...... ابھی سے Done کیا معنی؟"

وہ زور سے ہنسے اور کہنے لگے...... "جب آپ سفر پر جاتی ہیں اور یہ طے کر لیتی ہیں کہ کہاں جانا ہے۔ انڈیا جانا ہے، لاہور جانا ہے یا کہیں اور ٹکٹ بھی آپ نے لے لیے۔ لیکن کچھ سفری لوازمات کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے"

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے فوراً وہیں بیٹھے بیٹھے ایک درخواست لکھ دی جسے انہوں نے اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ دو دن بعد جب میں قرۃ العین حیدر پہ کام کرنے کی غرض و غایت لکھ کر لے گئی تو وہ حسب معمول صبح دس بجے انجمن کے دفتر میں موجود تھے۔ حسب دستور چائے آئی تو انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے تو پے منٹ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ انجمن جو کام کروائے گی اس کا معاوضہ بھی دے گی"

"اگر انجمن کے علاوہ کوئی دوسرا ادارہ ہوتا تو میں یقیناً پہلے ہی اس سلسلے میں بات کر لیتی......
لیکن یہ انجمن کا معاملہ ہے۔ جہاں میں بہت چھوٹی عمر سے والد صاحب کے ساتھ جاتی تھی۔ پھر
میرے سسر قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا دیرینہ اور قریبی تعلق انجمن اور بابائے اردو مولوی
عبدالحق سے رہا ہے۔ تو پھر میرے لیے پے منٹ کی بات ثانوی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے وہ ہمارا معاملہ ہے...... آپ بس یوں کیجیے کہ کام جلدی ختم کر لیجیے تاکہ دسمبر
۲۰۱۰ء میں یہ کتاب آ جائے...... میں جانتا ہوں کہ آپ بھی میری طرح چیلنج سمجھ کر کام قبول کرتی
ہیں...... اسی لیے کہہ رہا ہوں"۔ انہوں نے اپنے بال پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کام شروع کر دیا، انجمن آنا جانا ہوتا رہا، ان سے صلاح مشورے ہوتے رہے۔
میں نے جب بھی اور جہاں بھی انہیں دیکھا، ان میں ایک ایسی سرگرم روح نظر آئی جو کسی بھی لمحے
نچلی نہ بیٹھنا جانتی ہو...... ابھی انجمن، ابھی بیٹے کو کالج میں ایڈمیشن دلانے کے لیے ٹیسٹ دلوانے
لے جانا، اپنے کاروبار کو بھی دیکھنا، کالم بھی لکھنا، پریس کلب بھی جانا، لوگ سوچتے تھے کہ یہ انسان
ہے کہ جن......؟ کوئی کام کل پر نہ چھوڑتے تھے۔ بس آپ کسی اہم کام کا منصوبہ ان کے سامنے پیش
کیا اور انہوں نے کہا Done۔ بولتی کتابوں کا منصوبہ بنایا اور چند ہم عصر پہ C.D ریلیز کر دی۔
اس کے بعد ان کے پاس خواتین و حضرات کی آمد بڑھ گئی۔ ویسے بھی حسن ظہیر نے مختلف لوگوں
سے کئی منصوبوں پر کام شروع کروایا تھا اور ان میں وہ ان کی پوری معاونت بھی کرتے تھے...... میں
جب جب کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں یا اپنے کسی کام سے انجمن ترقی اردو کے دفتر گئی اکثر
ایک ہی خاتون کو وہاں تواتر سے آتے دیکھا۔ میں ان کے نام سے تو واقف نہیں لیکن وہ مجھے میرے
کالموں اور افسانوں کے حوالے سے اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہوں نے شاید یہ سوچ کر اپنا تعارف
نہ کرایا کہ میں انہیں جانتی ہوں اور میں نے اس شرماحضوری میں نہ پوچھا کہ شاید انہیں برا لگے کہ
میں ان کا نام نہیں جانتی...... اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ میں اور وہ حسن ظہیر کے پاس ساتھ ساتھ پہنچے۔
ایک دن ابتدائی باب کا ایک حصہ مکمل کر کے انہیں دینے گئی تو وہ خاتون وہاں پہلے سے موجود تھیں۔
میں تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی تاکہ موصوفہ جو مجھ سے پہلے تشریف لائی ہیں وہ اپنا مدعا بیان
کر لیں۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید وہ میرے سامنے بات نہ کرنا چاہ رہی

ہوں۔ میں نے حسن ظہیر سے کہا کہ میں دس منٹ میں آتی ہوں۔ یہ کہہ کر میں شہاب قدوائی کے پاس آ کر بیٹھ گئی ان سے اپنے کام کے سلسلے میں تبادلہ خیال کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے آ کر کہا کہ حسن صاحب بلا رہے ہیں۔ میں پہنچی گئی وہ بولے...... "بھئی آپ چلی کیوں گئیں؟"

میں نے کہا کہ شاید وہ خاتون آپ سے میرے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھیں، اس لیے چلی گئی، کیونکہ ان کو میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ لیکن وہ میرے سامنے آپ سے بات نہیں کرتیں۔ حسن ظہیر نے یہ سن کر اپنا سر پکڑ لیا۔ چشمہ اتارا اور بولے "یہ خاتون آپ کے ساتھ نہیں آئیں"

"نہیں بھئی...... مجھے تو ان کا نام بھی معلوم نہیں اور نہ ہی انہیں کبھی پہلے یہاں دیکھا ہے۔ یہ آپ کے آنے کے بعد یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس لیے میں نے سمجھا کہ آپ کی کوئی واقف کار ہیں اس لیے اٹھ کر چلی گئی، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے یہاں موجود تھیں"

"ارے نہیں بھائی...... میں انہیں نہیں جانتا...... میں تو یہ سمجھتا رہا کہ وہ آپ کے ساتھ آئی ہیں۔ میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا"...... وہ ہنس کر بولے۔

اب کے ہنسنے کی باری میری تھی...... "یہ تو بتایئے کہ محترمہ کس سلسلے میں آپ کے پاس تشریف لائی تھیں"

"بھئی پہلے تو وہ اس لیے آ رہی تھیں کہ میں انہیں کوئی ٹاپک دوں اور لکھنے میں ان کی مدد کروں...... اور اب وہ اصرار کر رہی ہیں کہ بولتی کتابوں کی اگلی سی ڈی ان کی آواز میں ہو"

"اس طرح تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میری مستند ریڈیو وائس ہے۔ مجھے بھی شامل کر لیجیے"...... میں نے مذاقاً کہا۔

"بس بالکل یہی عالم ہے۔ میں مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ہر دوسرا آدمی اپنی آواز بولتی کتابوں کے لیے دینا چاہتا ہے"

پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگے...... "رئیس فاطمہ صاحبہ وہ تو شکر کیجیے کہ عالی جی نے انجمن کی تقریبات کے لیے پابندی لگا دی ہے کہ ہر تقریب کی صدارت صرف اور صرف انجمن کا صدر کرے گا، ورنہ تو؟"

تقریباً تین چار دن بعد کراچی پریس کلب میں ان سے ملاقات ہوئی کیپٹن نذیر کی کتاب کی تقریب اجراء تھی وہ اور میں دونوں مقررین میں شامل تھے۔ تقریب کے اختتام پر جب وہ صدر انجمن آفتاب احمد خاں کو چھوڑنے جا رہے تھے تو ان سے کہنے لگے۔

''آفتاب صاحب ۲۰۱۰ء کے آخر میں ان کی کتاب آجائے گی ہم قرۃ العین حیدر کے کام کی پذیرائی ان کے شایان شان کریں گے'' آفتاب صاحب جواب میں مسکرا دیئے۔ ایسے جیتے جاگتے، ہنستے مسکراتے اور چہکتے ہوئے انسان کو دیکھ کر کسے یقین آئے گا کہ موت کی دیوی کا دل حسن ظہیر پہ آگیا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر جانے والے ہیں۔

پریس کلب کی تقریب سے دو تین دن پہلے جب میں انجمن پہنچی تو وہ فون پہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ میں اٹھ کے جانے لگی تو اشارے سے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں بیٹھ گئی۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ کچھ گفتگو میرے سسر قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے حوالے سے اور کچھ قرۃ العین حیدر کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اچانک انہوں نے فون پہ کہا...... ''لیجئے آپ خود بات کر لیجئے۔ یہ ابھی آئی ہیں''۔ یہ کہہ کر ریسیور انہوں نے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری جانب جناب جمیل الدین عالی تھے۔ چند منٹ ان سے بات ہوئی جس کے دوران اندازہ ہوا کہ ان کی طبیعت بے شک ناساز ہے، لیکن انجمن کے کاموں سے مکمل طور پر باخبر رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ جو کام میں نے شروع کیا ہے وہ آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں گھبرا کر درمیان ہی میں چھوڑ دوں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی کہ کام ادھورا چھوڑ دوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

میری حسن ظہیر سے فون پہ بات تین اور چار جون دونوں دن ہوئی۔ کسی کام کے حوالے سے ہم نے یاور مہدی صاحب کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے اگلے دن بات کرنے کو کہا۔ ۵ جون ۲۰۱۰ء کو صبح نو بجے میں نے انہیں فون کیا تو پہلی بار ان کا موبائل بند ملا۔ جبکہ وہ کبھی اپنا موبائل آف نہ کرتے تھے۔ انجمن فون کیا تو وہاں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی۔ اور وہ لوگ بھی حسن ظہیر اور آفتاب احمد صاحب کا انتظار کر رہے تھے تا کہ ان کی آمد کے بعد تقریب شروع ہو سکے۔ خدا جانے میرا دل کیوں انجمن جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

اور مجھے حسن ظہیر پہ سخت غصہ آ رہا تھا کہ آج انہیں کیا ہو گیا ہے کہ نہ تو موبائل پہ کال وصول کر رہے ہیں اور نہ ہی اب تک انجمن پہنچے ہیں۔ تب میں نے نسیم احمد صاحب سے کہا کہ جیسے ہی حسن ظہیر آئیں ان سے کہیں مجھے فوراً فون کر لیں۔ وہ بولے کہ جیسے ہی حسن ظہیر آتے ہیں میں آپ کو خود فون کرا دوں گا......

اور پھر ساڑھے گیارہ بجے دن فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف نسیم احمد تھے...... انہوں نے جو خبر مجھے دی وہ اتنی اچانک اور اتنی ہولناک تھی کہ میں بے اختیار رونے لگی۔ جیسے میرا حقیقی بھائی مر گیا ہو...... شہر میں کسی کو یقین نہ تھا۔ معراج جامی نے جب فون پہ مجھ سے پوچھا "کوئی خبر آپ تک پہنچی؟" تو میں سمجھ گئی کہ انہیں بھی یقین نہیں آ رہا اسی لیے وہ محتاط انداز میں تصدیق چاہ رہے تھے۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ وہ انسانوں سے پیار کرنے والا بلا تفریق مسلک و مذہب ہر ایک سے محبت کرنے والا جنوں کی طرح کام کرنے والا، یوں اچانک منظر سے غائب ہو گا۔ بھلا کس کو یقین آئے گا۔ ایسا دیانت دار اور پر خلوص آدمی اب شاید ڈھونڈے سے نہ ملے۔ اس نے ہر طرف پاؤں پھیلا رکھے تھے، کالم نویسی، ڈرامہ نویسی، کاروبار، انجمن اور نہ جانے کہاں کہاں اس کا قلم اور اس کی سماجی طبیعت نے اپنے جوہر نہ دکھائے تھے۔

یاور مہدی اور نثار احمد زبیری کے بعد یہ تیسرا شخص تھا جو ٹیلنٹ اور میرٹ کا قدردان تھا۔ یاور بھائی جب تک ریڈیو پہ بزم طلبہ سے منسلک رہے انہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر طلبہ و طالبات کی ایک کھیپ نکالی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کراچی کالج سے میرا انتخاب بزم طلبہ کے لیے کس طرح کیا تھا۔ اور بعد میں جب میں نے ڈراموں میں صدا کاری کے لیے الگ سے آڈیشن دیا اور مجھے انتخاب کا لیٹر ملا تو یاور بھائی نے کہا...... "بہت مبارک ہو کہ آواز، تلفظ، ادائیگی ہر لحاظ سے تم نمایاں ہو۔ لیکن ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ڈراموں میں صدا کاری کے بعد تمہارا رابطہ بزم طلبہ سے ٹوٹ جائے گا"...... بس پھر میں نے ہمیشہ بزم طلبہ سے جڑے رہنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یاور بھائی کے بعد بزم طلبہ میں سفارش اور اقربا پروری در آئی اور مجھ جیسے لوگوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اسی طرح جناب نثار احمد زبیری ہیں۔ جو آج کل جناح ویمن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

اور کراچی یونیورسٹی کے ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے بھی منسلک ہیں۔ وہ جب روزنامہ جنگ کے صفحات طلبہ کے انچارج تھے تو میں نے انہیں جو کچھ بھیجا وہ فوراً شائع ہوگیا۔ پھر انہوں نے ۱۹۶۷ء میں کالم 'نذر طالبات' کے لیے کل پاکستان مقابلہ کالم نویسی کروایا۔ میں نے بھی اس میں حصہ لیا اور میرا انتخاب ۶۹۔۱۹۶۸ء کے لیے ایک سال کے لیے کالم لکھنے کے لیے ہوا۔ زبیری صاحب کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اقربا پروری اور سفارش کو معاشرے کے لیے دیمک سمجھتے ہیں۔ میں نے جب روزنامہ ایکسپریس میں چھپنے والے کالموں کا انتخاب (۲۰۰۰ تا ۲۰۰۸ء) چھپایا تو اس میں نثار احمد زبیری کی رائے کو شامل کرنا مقدم سمجھا۔

ان دو ہستیوں کو (خدا انہیں سلامت رکھے) کے بعد تیسرا شخص صرف حسن ظہیر تھا جو سفارش کو مانتا ہی نہیں تھا۔ دوستوں کے لیے لڑ جاتا تھا اور میرٹ کو نظر انداز نہ ہونے دیتا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے خبر تھی کہ وہ زیادہ نہیں جیے گا۔ اسی لیے ہر کام "ابھی اور فوراً" کرنے کا عادی تھا۔ وہ کیوں اتنی جلدی چلا گیا۔ اسے کیوں اتنی جلدی اوپر بلا لیا گیا۔ ابھی تو اس کا بڑا بیٹا صرف چودہ برس کا تھا۔ بوڑھی ماں جو بستر مرگ پر سے صحت یاب ہو کر آئی تھی۔ کیونکہ اس نے جیتے جاگتے بیٹے کی جگہ ایک ساکت چہرہ دیکھا ہوگا۔

آج کے دور میں حسن ظہیر جیسا انسان ایک عجوبہ ہی تھا۔ یہ ایک عام مشاہدہ بھی ہے اور تجربہ بھی کہ جب آپ کے بیشتر ساتھی کسی اونچے عہدے پہ پہنچ جاتے ہیں تو اپنے دوست احباب سے ملنے سے کترانے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی انہیں فون کر رہا ہے یا ملنا چاہتا ہے وہ ان سے کسی نہ کسی کام کا طالب ہوگا۔ اسی لیے میں ہمیشہ اپنے ان ساتھیوں سے دور رہی۔ جو زمانہ طالب علمی میں ہمارے اچھے ساتھی تھے۔ لیکن جیسے ہی بڑے عہدوں پہ پہنچے خود کو ناگزیر سمجھنے لگے۔ ایک ساتھی جب ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر سے ترقی کرتے کرتے ایک بڑے عہدے پہ پہنچے تو ان کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی جاننے والے کا فون اٹینڈ نہ کرتے تھے۔ منہ بنا کر فون اٹھانے والے کو اشارہ کر دیتے تھے کہ "کہہ دو نہیں ہے"۔ البتہ خوشامدی حضرات کو وہ بڑے والہانہ انداز میں خوش آمدید کہتے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر میں نے انہیں ایک دو بار کے بعد کبھی فون نہ کیا۔ البتہ ایسے لوگ ان کے دربار تک بآسانی رسائی حاصل کرتے تھے جن سے یا تو ان کا کوئی مفاد وابستہ ہو یا کوئی تگڑی سفارش

ہو۔ انہیں وہ پر بے اور ہم بھی دل کھول کر دیتے تھے۔

لیکن حسن ظہیر ایک ایسا انسان تھا جس نے جوہر قابل کی ہمت افزائی کی اور ان کے کام کو سراہا۔ وہ اس دنیا کا انسان ہی نہ تھا۔ بڑا عجیب تھا۔ جو نہ سفارش کی پرواہ کرتا تھا اور نہ اپنے کسی ذاتی فائدے کو سامنے رکھتا تھا۔ اس نے مختصر ترین عرصہ میں انجمن کے لیے جو کچھ کیا وہ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے۔ جس طرح پھول اپنی خوشبو بکھیرتا ہے اسی طرح حسن ظہیر نے اپنی ذات اور کام کی خوشبو ہر طرف بکھیر دی۔ کون ہے جو اس سے اتفاق نہیں کرے گا کہ وہ منافق نہیں تھا کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرے اور اسی شخصیت کو دیکھتے ہی گلے مل کر کہے "بڑی عمر ہے آپ کی ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا" اور اس کے جاتے ہی شکر ادا کریں کہ ...... "پتہ نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں وقت ضائع کرنے"۔

وہ تو ایک کھلی کتاب تھا۔ اپنے گھر والوں کے لیے بھی اور اپنے دوست احباب کے لیے بھی۔ اس نے انجمن کے دروازے سب کے لیے کھول دیئے تھے کہ ...... "آؤ اور کام کرو" وہ اپنی بساط سے بڑھ کر لوگوں کے کام آتے تھے۔ جس دن قبضہ مافیا سے چھڑائی جانے والی زمین 'شادی باغ' میں تقریب تھی چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان جناب فخر زماں بھی معہ اپنی بیگم کے وہاں موجود تھے۔ فخر زماں صاحب کو کسی وجہ سے دیر ہوگئی تو حسن ظہیر کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ بار بار آ کر مائیک پہ معذرت کرتا ...... ایسا لگ رہا تھا کہ مہمان کی آمد کی تاخیر کی ذمہ داری بھی گویا ان پر ہی تھی۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے مجھ سے کہنے لگے "بھئی آپ نے اب تک اپنی کوئی تخلیق کسی چینل کو کیوں نہیں دی" میں نے کہا کہ ایک دفعہ بدر رضوی صاحب نے پی ٹی وی کے ایک پروڈیوسر سے میرے سامنے کہا تھا کہ "گلاب زخموں کے" کی تمام کہانیاں اس قابل ہیں کہ ان پر ڈرامہ بنایا جائے۔ ان کے علاوہ جناب محمود شام صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ "چاروں ناولٹ پر بہترین سیریل بن سکتی ہیں"۔ لیکن مجھ سے کسی نے رابطہ نہ کیا اور یہ میرے مزاج کے خلاف تھا کہ میں لوگوں کی خوشامد کروں۔ کیونکہ یہاں تو سفارش کے بغیر کسی جینوئن آدمی کا کامیاب ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور سفارش کروانا میرے مزاج میں نہیں"۔

تب انہوں نے پی ٹی وی کے ایک ذمہ دار افسر کا نام لے کر پوچھا۔ " کیوں...... وہ تو آپ کے یونیورسٹی کے فیلو بھی ہیں...... اور بزم طلب میں بھی آپ کے ساتھی رہے ہیں۔ انہوں نے بھی کوئی مدد نہیں کی' تب میں نے صرف اتنا کہا...... " حسن ظہیر صاحب کیا آپ نہیں جانتے کہ اس دنیا میں give and take کا اصول کارفرما ہے۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی اس دوران میں نے کچھ نجی چینل کی وہ کارستانیاں بھی بتائیں جن میں میری تین کہانیوں کو دھوکے سے لے کر غائب کر دیا گیا۔ مجھ سے پروڈیوسر نے ان کہانیوں کو لینے کی اجازت مانگی۔ لیکن اجازت ملنے پر نہ مجھے کوئی لیٹر دیا گیا نہ ہی کسی کنٹریکٹ پر سائن کروائے گئے۔ ایک ماہ تک میں متعلقہ شخص کو فون کرتی رہی۔ لیکن وہاں کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اپنی ایک کہانی 'پیاس کا صحرا' سے ملتی جلتی کہانی ڈرامہ کی شکل میں دیکھی جو معمولی سی ردوبدل کے بعد ڈھٹائی سے پیش کر دی گئی تھی۔ تب اگلے ہی روز میں نے اس چینل کے مالک کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور ان سے اپنی کہانیاں واپس منگوائیں۔

ساری روداد سن کر کچھ دیر افسردہ سے رہے۔ پھر بولے۔ " ذرا میں فارغ ہو جاؤں...... آپ مجھے پندرہ دن دیجئے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کی کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل خود کروں گا۔ سیریل بھی بنواؤں گا اور سیریز بھی"۔ لیکن پندرہ دن ختم ہونے سے پہلے ہی ان کا بلاوا آ گیا۔ اے پروردگار...... تو نے حسن ظہیر جیسے نیک فطرت انسان کو اتنی جلدی کیوں اٹھالیا۔ جو لوگوں کی راہوں میں چراغ روشن کرتا تھا۔ اور بددیانت و بدفطرت خود غرض اور منافقوں کی رسی اتنی دراز کیوں کرتا ہے...... ؟؟ ہے کوئی اس کا جواب......

عجب آدمی تھا وہ بھی جس سے بات کی اسے اپنا گرویدہ کر لیا۔ ساتھ ساتھ منہ پھٹ اور صاف گو بھی۔ لگی لپٹی رکھے بغیر جو دل میں آتی کہہ گزرتے۔ اسی لیے بہت سے لوگوں کو ان کا وجود ناگوار بھی گزرتا۔ لیکن وہ سچ کہنے سے نہ رکتا۔ اسی سچائی کے طفیل اور تعلقات نبھانے کی وجہ سے لوگ اسے کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ حسن ظہیر تمہیں بھلا کون سکتا ہے؟ کم از کم میں تو کبھی نہیں بھلا پاؤں گی...... یہ مصرعہ کسی نے تمہارے لیے ہی کہا تھا

خود درخشید ولے، شعلۂ مستعجل بود

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

ڈاکٹر نثار احمد قریشی

مجھے لمحے نہیں صدیاں سنیں گی
میری آواز کو محفوظ رکھنا

عالمی شہرت کے حامل اردو زبان و ادب کے نامور استاد، محقق، زیرک نقاد، ممتاز دانشور، اور یگانۂ روزگار فاضل پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی ۲۳ جون ۲۰۰۷ء کو دائمی مفارقت دے گئے۔ علم و ادب کا وہ آفتاب جہاں تاب جو ۱۹۴۸ء میں گوجر خان (راول پنڈی۔ پنجاب پاکستان) سے طلوع ہوا پوری دنیا کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کرنے اور سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے کے بعد عدم کی بیکراں وادیوں میں غروب ہو گیا۔ اسلام آباد میں جب ان کا آخری دیدار کرنے میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ملک کے طول و عرض سے آنے والے ان کے ہزاروں شاگرد دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پورا شہر حسرت و یاس کی تصویر بن گیا تھا۔ ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ دلوں کو مسخر کرنے والے اس عظیم استاد نے اردو تحقیق و تنقید کی ثروت میں جو اضافہ کیا وہ تاریخ ادب میں آب زر سے لکھا جائے گا۔ ان کی المناک وفات سے اردو زبان و ادب کے طلبا اور اساتذہ خود کو بے یار و مددگار محسوس کرتے ہیں۔ اردو تحقیق اور تنقید کا یہ مرد آہن اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ دسترس کا ایک عالم معترف تھا۔ ان کی اچانک وفات اتنا بڑا سانحہ ہے جس کے اثرات عالمی سطح پر فروغ اردو کوششوں پر بھی مرتب ہوئے۔ پوری دنیا کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کی وفات پر صف ماتم بچھ گئی اور بے شمار تعزیتی پیغامات آئے۔ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ اردو کے سربراہ اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے۔ ان کی قیادت میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ اردو نے کامیابیوں اور کامرانیوں کے درخشاں باب رقم کیے۔ انہوں نے پانچ سو سے زائد طلباء اور طالبات کو ایم فل اردو کی تعلیم دی اور پچاس کے

قریب ریسرچ اسکالرز نے ان کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے تحریر کیے جو کہ ان کا منفرد اعزاز ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا تعلق ایک ممتاز علمی اور ادبی خاندان سے تھا۔ ان کے والد ایک عالم باعمل تھے۔ پورے علاقے میں انہیں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستان بھر میں اس عظیم خاندان کی شرافت، خودداری، انسانی ہمدردی، خلوص اور علم دوستی مسلمہ تھی۔ حقیقت میں وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے شخص تھے۔ ان کی خاندانی روایات جو انہیں ورثے میں ملیں ان کے مطابق ان کے مزاج میں ایک استغنا تھا۔ وہ در کسری پر صدا کرنے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ نان جویں پر ہی گزر بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ خودی کو برقرار رکھ کر غریبی میں نام پیدا کرنے کا عملی نمونہ تھے۔ مشرقی تہذیب اور اردو زبان و ادب کا اتنا بڑا شیدائی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تہذیب اور زبان و ادب کے اعتبار سے وہ آفاقیت کے قائل تھے۔ ان کی تربیت ہی ایسے انداز میں ہوئی تھی کہ وہ انسانی مساوات کو اولین ترجیح دیتے۔ علاقائی، لسانی، نسلی اور دیگر امتیازات ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انسانیت کا وقار اور انسانی حقوق کی پاسداری زندگی بھر ان کا نصب العین رہا۔ کسی کو دکھ اور تکلیف کے عالم میں دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے اور مقدور بھر کوشش کرتے کہ ان دکھوں کا مداوا کر کے آسانی کی کوئی صورت تلاش کر سکیں۔ غریبوں کی حمایت، دردمندوں اور ضعیفوں سے محبت ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہا۔ ہوائے جور و ستم میں بھی وہ رخ وفا کو بجھنے نہ دیتے تھے۔ ان کی زندگی شمع کی صورت تھی اور وہ اذہان کی تطہیر و تنویر کے لیے وقف تھی۔

گوجر خان سے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے اردو زبان و ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وہ شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ اپنی تدریسی زندگی کا آغاز انہوں نے ۱۹۷۲ء میں پاکستان فضائیہ کے کالج چکلالہ راولپنڈی سے بحیثیت لیکچرار کیا۔ یہاں انہوں نے دو سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس دور کی یادوں کو وہ اپنی زندگی کا بہترین اثاثہ قرار دیتے تھے۔ دو سال بعد وہ گورنمنٹ کالج گجرات میں تدریسی

خدمات پر مامور ہو گئے۔ انہوں نے بڑے زوروں سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے نامور ماہر تعلیم اور ادیب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی حیات اور ادبی خدمات کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ معیار اور وقار کی رفعت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اعلیٰ تعلیم ان کا نصب العین تھا اس کے بعد وہ پاکستان کے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج اصغر مال، راول پنڈی، میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔ اس عرصے میں ان کی علمی اور ادبی فعالیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ راول پنڈی اور اس کے گردونواح میں منعقد ہونے والی علمی اور ادبی نشستوں میں ان کی شمولیت سے ان محافل کی رونق کو چار چاند لگ جاتے اور اس طرح اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے ایک وقیع سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ اس عرصے میں انہیں جن ممتاز ادیبوں کے ساتھ بیٹھنے اور مل کر کام کرنے کا موقع ملا ان میں سید ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، بریگیڈیر شفیق الرحمٰن، کیپٹن سید جعفر طاہر، محمد خالد اختر، یوسف حسن خان، خاطر غزنوی، محسن احسان، غلام محمد قاصر، غفار بابر، بشیر سیفی، شیر افضل جعفری، رام ریاض، مجید امجد اور محسن بھوپالی کے نام قابل ذکر ہیں۔ راول پنڈی میں تنقیدی نشستوں کے باقاعدہ انعقاد کے سلسلے میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا نام اس کے بنیاد گزاروں میں شامل ہے۔ ان کے ادبی مضامین اور شعری تخلیقات ۱۹۶۰ء میں شائع ہو رہی تھیں۔ انہیں ملک کے تمام ادبی حلقوں میں پذیرائی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے اس علاقے میں علم و ادب کے فروغ کے سلسلے میں ایک تڑپ پیدا کر دی اور دلوں میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر کے اردو زبان و ادب کے شیدائیوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ گورنمنٹ کالج اصغر مال راول پنڈی میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے چار سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان چار برسوں میں اس عظیم مادر علمی میں بزم ادب نے جو فقید المثال کامرانیاں حاصل کیں ان کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج بھی اس ادارے کے اعزازات میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی گراں قدر خدمات کا ممنونیت کے جذبات سے اعتراف کیا جاتا ہے۔ کل پاکستان علمی و ادبی تقریبات میں اس ادارے کے طلبا نے بھرپور شرکت کی اور خیبر سے مہران تک اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ خود ایک قادر الکلام شاعر، شعلہ بیان مقرر، بلند پایہ مضمون نگار اور ماہر تعلیم تھے اس لیے ان کے شاگردان کی فکر پرور اور بصیرت افروز

رہنمائی میں بلند ترین منزلوں کی جستجو میں رواں دواں رہتے تھے۔ وہ خاک کو اکسیر کرنے اور ذرے کو آفتاب بنانے کے لیے اپنے خون جگر کی آمیزش سے ید بیضا کا معجزہ دکھانے پر قادر تھے۔ غبار راہ سے جلوہ ہا تعمیر کرنا ان کی ایسی کرامت تھی جس میں ان کا کوئی شریک اور سہیم نہ تھا۔

۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں لیکچرار اردو منتخب ہوئے۔ یہاں ان کی آمد سے علمی و ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جمود کا خاتمہ ہو گیا اور تخلیق ادب کے لیے فضا انتہائی سازگار ہو گئی۔ اس دور میں پاکستان کے نامور ادیب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تدریسی خدمات پر مامور تھے۔ ان میں ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر محمد ریاض، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر محمود الرحمن، ڈاکٹر سلطانہ بخش اور ڈاکٹر بشیر سیفی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی مقناطیسی شخصیت کے اعجاز سے یہاں ایک ایسی فضا پروان چڑھنے لگی جس نے حالات کی کایا پلٹ دی اور صحرا کو گلزار میں بدل دیا گیا۔ پورے ملک سے ریسرچ اسکالرز اس عظیم جامعہ میں داد تحقیق دینے لگے۔ ملک کے طول و عرض سے تشنگان علم ان نابغہ روزگار دانشوروں سے اکتساب فیض کرنے کے لیے ایسے دیوانہ وار یہاں آنے لگے جیسے پیاسا کنویں کی جانب آتا ہے۔ ان اساتذہ کی بے مثال شفقت اور ایثار کا ہر طالب علم معترف تھا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا گھر دور دراز علاقوں سے آنے والے طلباء کے لیے مہمان خانہ بن جاتا تھا۔ مالی لحاظ سے مستحکم طلباء و طالبات تو وزارت تعلیم کے ہاسٹل یا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ہاسٹل میں قیام کرتے جبکہ مجھ جیسے طالب علموں کی پسندیدہ اقامت ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا گھر ہی قرار پاتا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھے وہ دلوں کا سب احوال جانتے تھے۔ چہرہ شناسی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ خود مستحق طلبا کو دعوت دے کر اپنے ہاں ٹھہراتے اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے۔ ان کے ہاں ہر طالب علم ایک اپنائیت محسوس کرتا اور کھل کر اپنے مسائل پر گفتگو کرتا۔ ان کے خلوص اور بندہ پروری نے لاکھوں دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں تمام تدریسی عملہ، دفتری ملازمین اور درجہ چہارم کے ملازمین غرض سب ان سے والہانہ محبت کرتے۔ وہ سب کی مشکلات اور مسائل سنتے اور حتی الوسع ان کی دستگیری کرتے۔ اکثر لوگ ان کو ایسا راہنما قرار دیتے جو سب کا سانجھا تھا۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی علمی فضیلت اور قابلیت کا دنیا بھر میں اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ان کا انتخاب بحیثیت پروفیسر اردو جامعہ الازہر قاہرہ (مصر) ہوا۔ انہوں نے چار سال تک دنیا کی اس قدیم ترین یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کی تدریس میں اہم خدمات انجام دیں۔ اس عرصے میں انہوں نے عالمی سطح کے متعدد سیمینارز منعقد کرائے۔ اس عرصے میں فیض احمد فیض، مجید امجد، ن۔م۔راشد، میراجی، سعادت حسن منٹو، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور ناصر کاظمی پر ان کا تحقیقی کام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی انہوں نے دنیا کے تمام ممالک میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے طویل اور صبر آزما جدوجہد کی۔ دنیا میں فاصلاتی تعلیم کے وہ سب سے بڑے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے مصر میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران میں وہ بے حد فعال اور بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ دنیا کی ممتاز جامعات میں اردو زبان کے ارتقا پر ان کے توسیعی لیکچرز کی بدولت اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچا۔ مصر کی ایک عرب طالبہ نے ان کی نگرانی میں اردو افسانے کے ارتقاء پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا۔ دنیا کے متعدد ممالک سے غیر ملکی زبان بولنے والے ان سے اردو سیکھتے اور تخلیقی ادب میں ایسی جاں فشانی اور انہماک کا مظاہرہ کرتے کہ اردو زبان پر ان کی اکتسابی مہارت پر حیرت ہوتی۔ وہ اس دردمندی اور خلوص سے شاگردوں کی صلاحیتوں کو صیقل کرتے کہ جوہر قابل نکھر کر سامنے آتا۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی معجز نما تدریس کا کرشمہ تھا۔ انہوں نے عالمی سطح پر منعقد ہونے والے فاصلاتی نظام تعلیم کے بارے میں متعدد سیمینارز میں کلیدی مقالے پیش کیے جنہیں بے حد پذیرائی نصیب ہوئی۔ انہوں نے میٹرک سے لے کر ایم اے، ایم فل پی ایچ ڈی سطح پر اردو زبان کے نصاب کے اردو زبان کے نصاب کی تمام درسی کتب نہایت محنت اور ذاتی دلچسپی سے مرتب کرائیں۔ اس وقت یہ کتب پوری دنیا میں فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے پڑھائی جارہی ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی خدمات سے اس زبان کو پوری دنیا میں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ ان کے بار احسان سے اردو داں اہل علم کی گردن ہمیشہ خم رہے گی۔

دنیا میں کئی طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایسے بہت کم ہیں جو اپنا سب

کچھ وطن، اہل وطن اور بنی نوع انسان کے لیے وقف کر دیں۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی ایسے ہی انسان تھے۔ موجودہ دور میں فرد کی بے چہرگی اور عدم شناخت کا مسئلہ روز بروز گمبھیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کو انسان شناسی میں کمال حاصل تھا۔ ان کی دوستیاں لامحدود تھیں مگر کسی کے ساتھ دشمنی کے بارے میں انہوں نے کبھی نہ سوچا اور نہ ہی ان کا کوئی دشمن تھا۔ جو شخص بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ وزیر آباد میں مقیم ان کے ایک شاگرد نے ان کے لیے کٹلری کا ایک بیش قیمت سیٹ لیا اور ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے اس تحفے کو قبول کرنے سے معذرت کر لی اور کہا کہ اس کو فروخت کر کے اس سے ملنے والی رقم کسی ضرورت مند گھرانے کو دے دی جائے۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق اس سیٹ کی رقم وزیر آباد کی ایک مفلس اور بے سہارا بیوہ کو پہنچا دی گئی۔ ملک کے طول و عرض میں ان کے لاکھوں شاگرد موجود ہیں وہ سب اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ انہوں نے تمام عمر کی جمع پونجی اپنی شاگردوں کی فلاح پر خرچ کر دی۔ ضرورت مند طلبا و طالبات کی دامے، درمے، سخنے مدد کرنا ہمیشہ ان کا شیوہ رہا۔ وہ سب شاگردوں اور احباب کی بلا امتیاز مدد کرتے اور کبھی ان کی طرف سے احساس تشکر اور ممنونیت کی توقع نہ رکھتے۔ احسان کر کے بھول جانا ان کی عادت تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے رہنے والے ایک پروفیسر جو کہ اسلام آباد میں ایم فل کی ورکشاپ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے، صحت افزا مقام کے تفریحی دورے کا پروگرام منظور نہ ہونے کے باعث ڈاکٹر نثار احمد قریشی سے الجھ پڑے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے ایبٹ آباد اور مری کی برف باری اور شدید دھند کی وجہ سے تفریحی دورہ منسوخ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نثار احمد قرشی نے بہت سمجھایا مگر وہ دل ہی دل میں رنجیدہ رہا۔ دسمبر کا مہینہ تھا مری سے آنے والی برفانی ہواؤں کے باعث وہ پروفیسر صاحب شدید نمونیے کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کلاس میں آئے اس کی غیر حاضری کی وجہ جان کر سخت مضطرب ہو گئے اور اسی وقت اپنی چھٹی کی درخواست لکھی اور شاگرد کو لے کر پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز اسلام آباد پہنچے۔ ادویات کے تمام اخراجات خود برداشت کیے جب تک بخار کی شدت کم نہ ہوئی اس وقت تک باوضو ہو کر دعائیں مانگتے رہے۔ تین گھنٹے کے بعد جب شاگرد اٹھا تو استاد کو سجدہ شکر میں پایا۔ وہ فرط عقیدت سے بے قابو ہو کر آگے

بڑھا اور استاد کے قدموں میں گر پڑا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی اس سے لپٹ کر رونے لگے اور کہا میدانی علاقے کے باشندے پہاڑی علاقوں کی شدید سردی برداشت نہیں کر سکتے اسی لیے میں نے تفریحی دورہ منسوخ کر دیا تھا۔ اس شاگرد کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے معافی کی استدعا کی تو ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے مسکرا کر کہا' اللہ کریم آپ سب کے لیے آسانیاں پیدا کرے'۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر نثار احمد قریشی دوسروں کے لیے آسانیاں تلاش کرتے کرتے بعض اوقات خود کو مشکلوں میں ڈال دیتے۔ ان کی زندگی اسی کشمکش میں گزری۔ کبھی سوز و ساز رومی اور کبھی پیچ و تاب رازی۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر کبھی گرد ملال کسی نے نہ دیکھی۔ دنیا میں خیر اور فلاح کا نظام ایسے ہی نیک انسانوں کے وجود کا مرہون منت ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھے۔ ہر قسم کی عصبیت اور فرقہ وارانہ تعصب سے انہیں شدید نفرت تھی۔ انہوں نے چار مرتبہ فریضہ حج کی سعادت حاصل کی اور چار مرتبہ رمضان المبارک کے مہینے میں عمرہ کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ عمرہ کے دوران ماہ صیام کے آخری عشرے میں وہ مسجد نبوی اعتکاف میں بیٹھتے اور ہر تیسرے روز وہ قرآن حکیم کی مکمل تلاوت کر لیتے۔ ان کی نیکیوں اور عبادات سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ اک شان استغنا سے متمتع تھے۔ نمود و نمائش اور ریاکاری سے ان کو چڑ تھی۔ وہ پابند صوم و صلوۃ تھے۔ ہر روز وہ نماز تہجد اسلام آباد کی فیصل مسجد میں ادا کرتے۔ اپنی رہائش گاہ سے مسجد تک کا فاصلہ جو تقریباً ایک کلو میٹر ہے وہ روزانہ پیدل طے کرتے۔ یہی ان کی ورزش تھی اور اسی کو وہ صبح کی سیر پر محمول کرتے تھے۔ نیکی اور صحت کا یہ حسین امتزاج ان کی شخصیت کو مسحور کن بنا دیتا تھا۔ وہ باوضو ہو کر اپنے دفتر میں بیٹھتے نہایت مستعدی اور فرض شناسی سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے۔ ان کی پیشہ ورانہ دیانت اور احساس ذمہ داری کو سب تسلیم کرتے تھے۔ ان کے دفتر میں دعوتوں اور ضیافتوں کا تصور ہی نہ تھا۔ فارغ وقت میں درود پاک اور آیات قرآن حکیم کی تسبیح پڑھتے۔ ہمارا معاشرہ قحط الرجال کے باعث عمومی اعتبار سے بے حسی کا شکار ہے کسی کے بارے میں کلمہ خیر ادا کرنے میں بالعموم تامل سے کام لیا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ حسد اور بغض و عناد کے باعث بعض کینہ پرور لوگ بلاوجہ بھی درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ ان اعصاب شکن حالات میں وہ ایسے وقت گزارتے جیسے بتیس دانتوں میں

زبان رہتی ہے۔ وہ سب کے لیے فیض رساں تھے جو لوگ ضرر رساں ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ دور رہتے یہاں تک کہ ان سے سرسری ملاقات میں بھی اکثر تامل کرتے تاہم کسی کے خلاف کوئی رد عمل کبھی ظاہر نہ کرتے البتہ قرآن حکیم کی سورۃ الناس اور سورۃ الفلق کا کثرت سے ورد کرتے۔ ان کا برتاؤ سب کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ رہا کسی کو محض ذاتی رنجش کی بنا پر انہوں نے کبھی ہدف تنقید نہ بنایا۔ وہ احباب کی خوبیوں پر نظر رکھتے اور ان کو جی بھر کر سراہتے اگر کسی کی کوئی خامی انہیں معلوم ہوتی تو اسے تنہائی میں سمجھاتے اور دلائل سے قائل کرتے، تحکمانہ لہجہ کبھی اختیار نہ کیا بلکہ ہمیشہ عجز و انکسار کی روش اپنائی۔ کسی کی غیبت نہ کرتے اگر کوئی ان کی موجودگی میں کسی کی غیبت کرتا تو سختی سے اس کی ممانعت کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ معاشرتی زندگی کے بیشتر مسائل اور فسادات کا بنیادی سبب غیبت ہی ہے۔ ان کی محفل میں جب کوئی نادانستہ طور پر بھی کسی کے عیوب خواہ وہ حقیقی بھی ہوتے ان کے سامنے بیان کرتا تو ڈاکٹر نثار احمد قریشی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور وہ نہایت ناگواری سے اسے ٹوکتے اور اکثر یہ مصرع پڑھتے

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ڈاکٹر نثار احمد قریشی ۲۰۰۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۲۰۰۵ء میں انہیں ڈین آف آرٹس کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور وسیع تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ نے اس یونیورسٹی کو ملک کی یونیورسٹیوں کی رینکنگ میں بہت آگے پہنچا دیا۔ عالمی جامعات کی رینکنگ میں بھی اس عظیم مادر علمی کو ممتاز اور منفرد مقام نصیب ہوا۔ یہ سب کامرانیاں ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی ولولہ انگیز قیادت اور فقید المثال تدبر کا ثمر ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی تاریخ میں جس طرح ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کا اندرون ملک اور بیرون ملک ہر سطح پر اعتراف کیا گیا اور ان کے اعزاز میں پروقار تقریبات کے انعقاد سے ان کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا، اس سے قبل ایسی کوئی تابندہ روایت موجود نہ تھی۔ انہوں نے اس عرصے میں متعدد سیمینارز کا اہتمام کیا جن میں ممتاز ماہرین لسانیات، ادیب، محقق، اساتذہ، فلسفی، ماہرین نفسیات اور نقاد شامل ہوئے۔ اب جامعہ کے ڈھنگ ہی نرالے تھے کہیں ادبی نشستیں منعقد ہو رہی تھیں اور کہیں ڈرامہ فیسٹول کا اہتمام

ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے تعلیمی نظام میں پائے جانے والے تشکیک، بے یقینی، بے عملی اور جمود کو رفع کرنے کی خاطر جو لائق صد رشک و تحسین جدوجہد کی عالمی سطح پر اسے بنظر تحسین دیکھا گیا۔ ان کی طلسمی شخصیت، مشفقانہ طرز عمل، تبحر علمی اور ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی کی کیفیت نے قلب و نظر کو مسخر کر لیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام کی تاریخ میں آرٹس کے شعبے میں اس قدر چہل پہل اس سے قبل کبھی نہ دیکھی گئی اور اب ان کی وفات کے بعد شعبہ آرٹس حسرت و یاس کی تصویر نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیض کا یہ شعر بے ساختہ لبوں پر آ جاتا ہے:

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

پاکستان میں اور پاکستان سے باہر رہنے والے دانشوروں سے ڈاکٹر نثار احمد قریشی کے قریبی تعلقات تھے۔ ممتاز فرانسیسی دانشور دریدا (Derrida) اور ماہر بشریات کلاڈ لیوی سٹراس سے وہ مل چکے تھے ان کے نظریات کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد جب وہ رد تشکیل، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، اور پس ساختیات کے بارے میں تجزیہ پیش کرتے تو فکر و نظر کے نئے دریچے وا ہوتے چلے جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ دریا کی روانی کے مانند دلائل کا سیل رواں ہے جو جہالت کو خس و خاشاک کی صورت بہائے لیے جا رہا ہے۔ جب وہ تقریر شروع کرتے تو سننے والے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ تقریر کی اثر آفرینی کا یہ عالم ہوتا کہ جو کچھ وہ کہتے وہ قلب و روح کی گہرائیوں میں سما جاتا۔ ان کی بات دل سے نکلتی ہوئی اور دل میں اترتی چلی جاتی اور پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیتی۔ ان کے لیکچرز اگر کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو یہ بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی طرف سے اب تک اردو کی جتنی نصابی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی کے معرکہ آرا تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں جہاں اردو کی تدریس جاری ہے وہاں یہ کتب بے حد مقبول ہیں۔ درسی کتاب کے علاوہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتب کی تعداد بیس کے قریب ہے۔ ان کی کتاب 'دنیا جن سے روشن ہے' بے حد مقبول ہوئی۔ اس تالیف میں انہوں نے نامور شخصیات سے ان کے پسندیدہ اساتذہ کے سوانحی خاکے لکھوائے۔ یہ سب خاکے ان نابغہ روزگار اساتذہ کے

بارے میں لکھے گئے ہیں جن کے فیضان نظر سے نوع انساں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ زندگی کی معنویت اور مقصدیت کو اجاگر کرنے میں یہ کتاب ایک گنج گرانمایہ ہے۔ اپنے تخلیقی وجود کا اثبات کرنا ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی حیات اور خدمات پر ان کی تحقیقی کتاب اس کی درخشاں مثال ہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے اپنے فنی تجربات کے ذریعے وہ نئے امکانات کی جستجو میں ہمہ وقت مصروف عمل رہتے۔ ان کا لہجہ اور اسلوب ندرت، تازگی اور تنوع کا مظہر تھا۔ اس وقت اردو زبان و ادب کی تدریس کا سلسلہ پوری دنیا میں روز افزوں ہے اس کی بنیاد میں بلاشبہ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی محنت شاقہ اور خون جگر کی آمیزش موجود ہے۔ اردو زبان و ادب اس وقت افلاک کی وسعتوں سے آشنا ہے اس ارفع مقام تک رسائی کے کٹھن مرحلے میں اسے ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی بے لوث اور دانشورانہ اعانت نصیب رہی ہے۔ اس شمع کو فروزاں رکھنے میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے جو گراں قدر خدمات انجام دیں، ان کی بدولت جریدہ عالم پر ان کا نام ابد تک نمایاں طور پر ثبت رہے گا۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی زندگی میں مذہب کو بہت اہم مقام حاصل رہا۔ عبادات اور عقائد کو وہ ہمیشہ کلیدی مقام کا حامل سمجھتے۔ سیمینارز، تقریبات کلاسز، ادبی محافل اور مشاعروں میں بھی وہ نماز کے لیے وقفہ ضرور رکھتے اور یہ کوشش کرتے کہ تمام حاضرین باجماعت نماز پڑھیں۔ جب وہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں مسجد میں درس قرآن دیتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ماہتاب اور ستاروں کی ایک کہکشاں بن گئی ہے جو ظلمتوں کو کافور کرنے کی سعی میں انہماک سے مصروف عمل ہے۔ وہ الفاظ کے برمحل استعمال سے اپنی ذہنی اور روحانی کیفیات سے سامعین کو مسحور کر دیتے۔ تاریخ کو وہ ایک مسلسل عمل سے تعبیر کرتے اور اسے تہذیبی بالیدگی کے لیے ناگزیر قرار دیتے۔ وہ تاریخ اسلام کے ذریعے نئی نسل کو اسلام کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے روشناس کرانے کی سعی کرتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ تہذیب اور تمدن کی نشوو ارتقا اور بالیدگی کا تقاضا یہ ہے کہ عصری آگہی کو فروغ دیا جائے اور اقتضائے وقت کے مطابق ہر قسم کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود کو تیار رکھا جائے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کو وہ بہت اہم قرار دیتے اور اس بات کی جانب توجہ دلاتے کہ یہ الہامی کتاب تمام بنی نوع انسان کے لیے پیام نو بہار ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی تحریک پاکستان میں

خدمات اور معاشرتی زندگی کو راہ راست پر لانے کی انتھک جدوجہد کے بارے میں تمام حقیقی واقعات وہ بڑے انکسار سے بیان کرتے۔ اپنے خاندان کی علمی وادبی خدمت پر انہیں بجا طور پر ناز تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کو لائق اعتذار نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے، جس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنے لیے رزق حلال کے مواقع پیدا کیے۔ ماضی اور حال کے بارے میں غور وفکر سے وہ اپنے شاگردوں کے ذہنوں کو جلا بخشتے اور استعداد کار کو مہمیز کرتے۔ حریت فکر وعمل اور آزادیٔ اظہار کو وہ انسانی آزادی کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے حقیقی آزادی کا احساس وہ گوہر یکتا ہے جو شعور اور ذہن کے لیے ارتقا کے لیے لازمی ہے۔ اور اسی کے اعجاز سے مقاصد زیست کی رفعت میں ہمدوش ثریا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ فطرت جس طرح لالے کی حنا بندی کرتی ہے اس کے تہذیب و معاشرت اور معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں پر دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فطرت کی تمنا یہ ہے کہ ہر شب کو سحر کرنے کی سعی کی جائے۔ منشائے قدرت اور رمز مسلمانی بھی یہی ہے کہ بنی نوع انساں کو ایسی تہذیب سے متمتع کیا جائے کہ اس کا وجود پوری تابانی کے ساتھ برقرار رہے اور ہر رنگ میں اس کے وجود کا اثبات سامنے آئے۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی انتہائی وضع دار، شریف اور خوش اخلاق انسان تھے۔ یہاں تک کہ تمام وضیع بھی ان سے خائف رہتے۔ وہ اکثر کہا کرتے روزمرہ معمولات میں ملاقاتیوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آنا بھی ایک نیکی ہے، جس کا اجر اللہ کریم کی بارگاہ میں ضرور ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی نیکی ہے لیے چلہ کشی یا کسی بڑی تپسیا کی ضرورت نہیں درد آشنا لوگوں کے لیے اس کے فراواں مواقع تسبیح روز وشب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت سامنے آتے ہیں۔ حیف صد حیف کہ اکثر لوگ خلوص، دردمندی اور ایثار سے عاری ہونے کے باعث اس نیکی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہوس نے نوع انساں کو جس انتشار اور پراگندگی کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے اسکے باعث ایسی نیکیوں سے لوگوں نے شپرانہ چشم پوشی کو شعار بنالیا ہے۔ زندگی آرزوؤں، امنگوں اور تمناؤں کے ایک لامحدود اور غیر مختتم سلسلے کا نام ہے۔ ان حالات میں بھی دل بینار کھنے والے اپنے لیے ایک الگ راہ کا تعین کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی زندگی قناعت، استغنا، اور خودداری کی درخشاں مثال

تھی۔ آپ نے اپنی خواہشات کو ہمیشہ اعتدال اور توازن میں رکھا اس لیے وہ ایام کے مرکب نہیں بلکہ راکب تھے۔ ان کی شخصیت کی عطر بیزی اور اور سدا بہار شگفتگی کا راز یہ تھا کہ وہ ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے اور دانش مندانہ ذاتی رائے کی روشنی میں فیصلے کرتے۔ وہ متلون مزاج لوگوں کو ناپسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اس کے تمام پہلو پیش نظر رکھتے اور حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں ایک مضبوط اور مستحکم انداز میں رائے قائم کرتے۔ اس کے بعد اس پر نہایت استقامت کے ساتھ قائم رہتے اور ہر قسم کی آزمائش سے گزرنے پر تیار ہو جاتے۔ کورانہ تقلیدی تصورات کو انہوں نے ہمیشہ مسترد کیا اور جہان تازہ کی جستجو پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

اللہ کریم نے ڈاکٹر نثار احمد قریشی کو اطاعت خداوندی، ضبط نفس، تحمل، بردباری اور توازن کی فراواں دولت عطا کی تھی ان کے ذوق سلیم اور عمدہ صفات کا ایک عالم معترف تھا۔ زندگی کی اقدار عالیہ کے فروغ میں انہوں نے گہری دلچسپی لی۔ انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے وہ قلم کی حرمت پر اصرار کرتے تھے۔ ایک نکتہ طراز نقاد کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف ادب کی اہمیت اور افادیت کو نہایت خلوص کے ساتھ اجاگر کیا بلکہ ادیب کی عزت نفس، اور قدر و منزلت اور معاشرتی حیثیت کو تسلیم کرنے کی جانب توجہ دلائی۔ جذبہ انسانیت نوازی کا جو بلند معیار ان کی شخصیت میں موجود تھا موجودہ زمانے میں عنقا ہے۔ وطن، اہل وطن، اور بنی نوع انساں کے ساتھ والہانہ محبت اور قلبی وابستگی ان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف تھا۔ اپنی تحریروں میں وہ ارتباط و تنظیم کی ایک مسحور کن دلکش فضا پیدا کر لیتے تھے۔ جب وہ اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کو پیرایہ اظہار عطا کرتے تو قاری ان کے اسلوب کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ تو پہلے سے اس کے دل میں موجود تھا۔ فکر و نظر کی صحیح سمت، حق گوئی و بے باکی کی تخیلات کی تونگری، مشاہدات کی ندرت، اسلوب کی انفرادیت اور مقاصد کی حکمت کے حسین امتزاج سے وہ ید بیضا کا معجزہ دکھاتے۔ اس طرح ان کی تحریریں روح کی تفسیریں بن کر سامنے آتیں اور پتھروں کو بھی موم کر دیتیں۔ ان کے تمام معمولات، قول و فعل اور گفتار و کردار میں ان کی شخصیت کے دھنک رنگ پہلو صاف دکھائی دیتے تھے۔

عادات اور ارادی اعمال کی تنظیم وہ اس انداز میں کرتے کہ سیرت اور کردار میں نکھار پیدا ہو جاتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تمام عادات و افعال جو آغاز کار کے وقت شعوری اور اختیاری صورت میں روبہ عمل لائے جاتے ہیں بالآخر وہی انسان کی سیرت اور کردار کے روپ میں جلوہ گر ہو کر اس کی شناخت کا وسیلہ بن جاتے ہیں سیرت کو وہ کردار کے باطنی پہلو کا نام دیتے تھے۔ سیرت او رکردار کی تعمیر میں وہ معاشرے اور سماج کو بہت اہم خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حلقۂ احباب کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان کی پہچان ان کی صحبت سے کی جاسکتی ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں دنیا کے ممتاز ادیب، دانشور، نقاد، محقق اور فلسفی شامل تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ثبوت اور ناقدانہ بصیرت کے ذریعے فرد کی عدم شناخت کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے زمانہ حال اور ماضی کے اہم واقعات اور نشانیوں کو بہت اہم گردانتے ہوئے ان کے تحفظ کی تلقین کی۔ ان کی تحریریں جہاں تک مواد کا تعلق ہے اجتماعی نوعیت کی ہیں مگر تخلیقی اسلوب کے لحاظ سے ان کی انفرادیت مسلمہ ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک واضح پرتو ان کے اسلوب میں پرتو فگن ہے جو انہیں اپنے معاصر اہل قلم سے ممیز کرتا ہے۔ وہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔ الفاظ کو فرغلوں میں لپیٹ کر پیش کرنا اور کسی مصلحت کے تحت کلمۂ حق ادا کرنے سے گریز کرنا ان کے نزدیک منافقت اور ریاکاری کی قبیح مثال ہے۔ ظلم کو برداشت کرنا اور اس کے خلاف احتجاج نہ کرنا ان کے نزدیک بہت اہانت آمیز رویہ ہے۔ اپنی تمام زندگی میں انہوں نے کبھی کسی باب رعایت سے داخل ہونے کی کوشش نہ کی۔ وہ میرٹ کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے تعلیمی زندگی میں میرٹ کی بالادستی کو یقینی بنانے کی مقدور بھر کوشش کی اور کبھی کسی سفارش یا پرچی پر دھیان نہیں دیا۔ اب دنیا میں ایسی ہستیاں کہاں؟

موت کے جانکاہ صدمے اور اس کے ناقابل اندمال چرکے ازل سے انسان کے مقدر میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ موت سے بھلا کس کو رستگاری ہے آج وہ تو اس کے بعد کل ہماری باری ہے۔ یہاں تو سب یار کمر باندھے ہوئے چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ رخش عمر مسلسل رو میں ہے، کسی کو کیا معلوم کہ یہ کہاں تھمے گا؟ انسان کا نہ تو ہاتھ باگ پر ہے اور نہ ہی پا رکاب میں ہے۔ بنی نوع انساں کے مقدر میں یہ روح فرسا المیہ لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا ہے کہ تمام نفوس فنا کی زد میں آکر رہیں گے اور

بجا صرف اللہ کریم کی ذات کو ہے۔ یہ معمہ ایسا ہے جو نہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی کوئی دانائے راز اس کی گرہ کشائی کر سکا ہے کہ وہ لوگ جو سفاک ظلمتوں میں ستارہ سحر کے مانند ضوفشاں رہتے ہیں، جن کا وجود انسانیت کی فلاح، مسرت اور وقار کے لیے عطیہ خداوندی ہوتا ہے، جن کی زندگی کا مقصد درمندوں اور ضعیفوں سے محبت کرنا ہوتا ہے، جو ایک شجر سایہ دار کے مانند ہوتے ہیں کہ خود سورج کی جھلسا دینے والی گرمی برداشت کرتے ہیں مگر وہی انسانیت کو خنک چھاؤں فراہم کرتے ہیں اچانک اور وقت سے پہلے ہم ان کی رفاقت سے کیوں محروم ہو جاتے ہیں۔ اجل کے ہاتھ ایسے عطر بیز گلستانوں کو ویران کیوں کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کی اچانک وفات نے دل دہلا دیا، مایوسی اور محرومی کی جان لیوا کیفیت میں کوئی امید بر نہیں آتی اور نہ ہی جانگسل تنہائی کی عقوبت سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ زندگی اور موت کے رازہائے سربستہ کی تفہیم پر کون قادر ہے۔ فرشتہ اجل ان چارہ گروں اور مسیحا صفت لوگوں کو ہم سے مستقل طور پر جدا کر دیتا ہے جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے وہ ہمیں دائمی مفارقت دے کر ہمیں اس دھوپ بھری دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد گل چین ازل ہمیں ان کی دائمی مفارقت دے کر آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس وقت جب کہ ہم اپنے ایک عظیم استاد سے محروم ہو چکے ہیں ہماری بے بسی اور بے چارگی کا احساس کون کرے گا اور کون یہ کیفیت دیکھے گا۔
مجید امجد کے یہ اشعار حقیقی صورت حال کے غماز ہیں:

کون دیکھے گا

جو دن کبھی نہیں بیتا وہ دن کب آئے گا
انہی دنوں میں اس اک دن کو کون دیکھے گا

اس ایک دن کو جو سورج کی راکھ میں غلطاں
انہی دنوں کی تہوں میں ہے کون دیکھے گا

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

بقیہ ص ۱۹۲ پر

محمد راشد شیخ

ندوہ کا ایک درخشاں ستارہ

مولانا محمد ناظم ندوی

عربی زبان وادب کے جید عالم، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم، سابق شیخ الجامعہ عباسیہ، بہاولپور، استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ مولانا محمد ناظم ندوی مختصر علالت کے بعد ۹ جون ۲۰۰۰ء کو علی الصبح کراچی میں وفات پا گئے، حسب معمول اور حسب توقع ہمارے اخبار ورسائل نے اس عظیم شخصیت کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اہل علم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی محض چند سطریں خبر، تادم تحریر نا تو مولانا کے بارے میں کوئی مضمون نظر سے گزرا اور نہ ہی ان کی خدمات کا کہیں ذکر پڑھا، یہ بات اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء) کے انتقال کے بعد برصغیر پاک وہند میں مولانا ناظم ندوی ہی کی ذات تھی جنہیں عربی زبان وادب، خصوصاً صرف ونحو میں سند کا درجہ حاصل تھا، نیز آپ عربی زبان کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ آپ کو نہ صرف عربی زبان کے پورے پورے قصائد زبانی یاد تھے بلکہ کئی کتب بھی تقریباً حفظ تھیں، خصوصاً الفیہ ابن مالک اور فقہ اللغۃ از ثعالبی

افسوس کہ مولانا علی میاں کے انتقال کے محض پانچ ماہ اور نو دن بعد مولانا ناظم صاحب بھی ہم سے جدا ہو گئے، مولانا علی میاں اور مولانا ناظم ندوی کی دوستی تقریباً ستر سالہ طویل تھی، ان نامور عربی دان حضرات کے تیسرے عزیز ترین دوست مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ جن کا ۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء کو دورے کے ایک سخت دورے کے بعد اسی شہر کراچی میں انتقال ہوا، اور یہیں آسودہ خاک ہوئے۔ ان سطور کے عاجز راقم پر مولانا ناظم صاحب کی شفقتیں اور عنایتیں بے شمار ہیں، تقریباً چودہ برس قبل مولانا سے باقاعدہ تعارف ہوا، قرب مکانی کی وجہ سے (تقریباً ہر جمعہ) مولانا سے عربی زبان کے دروس بھی لیے، ان سے تاریخی واقعات بھی سنے نیز عربی زبان وادب

کے نکات بھی سنے، اور قرآن وحدیث سے متعلق مولانا کی تحقیقات کے نتائج سے بھی آگاہی ہوئی۔

مولانا محمد ناظم ندوی وسط دسمبر ۱۹۱۳ء میں قصبہ علی نگر (بہار شریف) میں پیدا ہوئے۔ بہار شریف کی وجہ تسمیہ مشہور صوفی بزرگ اور مکتوبات دوصدی کے مصنف حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی جائے تدفین ہے۔ مولانا ناظم صاحب نے اس دور کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اس تعلیم کے بنیادی اجزا قرآن مجید اور آسان اردو تھے۔ اس کے بعد آپ نے کچھ عرصہ ہندو پاٹھ شالا میں بھی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا ناظم صاحب کا داخلہ مدرسہ عزیزیہ بہار میں ہوگیا۔ یہیں مولانا کے ادبی ذوق اور عربی زبان سے تعلق کا آغاز ہوا۔ برسہا برس قبل مولانا نے اپنے مضمون 'میرا مطالعہ' میں اس بارے میں لکھا تھا:

"غالباً میری عمر ۱۳-۱۵ برس ہوگی جب پہلی مرتبہ اخبارات ورسائل کی شکل دیکھی۔ مصر کا 'المصور' اور 'کل شئی' نامی دو چودہ روزہ یا ہفتہ وار اخباروں کو جب پہلی مرتبہ نہایت عمدہ کاغذ اور ٹائپ میں چھپا دیکھا تو مجھے یہ دونوں اخبارات بہت پسند آئے خصوصاً ان میں طرح طرح کی رنگین تصویریں دیکھ کر جی چاہتا کہ پورا اخبار ایک آن میں پڑھ ڈالوں۔ رنگین تصویروں کے نیچے دی ہوئی تشریحات کو خوب جی لگا کر پڑھتا، کچھ سمجھتا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کیونکہ میری عربی زبان کی استعداد خصوصاً اخبارات ورسائل کی زبان سمجھنے کے معاملے میں بہت کم تھی، مگر میں اسے پڑھتا رہتا۔ میرے ادبی ذوق کا آغاز مصر کے انہی دونوں اخبارات کے مطالعہ سے ہوا۔ جرجی زیدان کے چند ناول 'عروس فرغانہ، غادۃ کربلا، سکینہ بنت حسین' کا اس زمانہ میں مطالعہ کیا، ان ناولوں کے مطالعے سے عربی زبان سے والہانہ محبت پیدا ہوگئی، نئے نئے الفاظ، نئی ترکیبیں جاننے کا ذوق وولولہ پیدا ہوا، مشکل الفاظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے اکثر وبیشتر لغت کی کوئی کتاب سامنے رکھتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لفظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے بہت سے نئے الفاظ معلوم ہو جاتے اور مجھے لغت کی کتاب کا مطالعہ کرنے میں ایک لذت محسوس ہونے لگی اور میرے لیے نئے مادہ کے الفاظ کے معنی کا علم ایک نامعلوم جزیرہ کی دریافت سے کم لطف اندوز نہ تھا۔"

مدرسہ عزیزیہ میں ہی مولانا ناظم صاحب کی مولانا مسعود عالم ندوی سے دوستی و رفاقت کا آغاز ہوا جو مولانا ناظم ندوی سے ایک سال سینئر تھے۔

مدرسہ عزیزیہ کے نصاب میں صرف، نحو، منطق، فلسفہ، گلستان و بوستان، و دیگر مضامین درس نظامی میں شامل تھے، یہاں مولانا نے انگریزی زبان بھی پڑھی، مولانا کو اس دور میں پڑھی انگریزی نظمیں زبانی یاد تھیں اور وہ نجی محافل میں مکمل نظمیں سناتے بھی تھے۔

۱۹۲۸ء میں مولانا ناظم ندوی کا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فضیلت کے دوسرے سال میں ہوا، ندوہ آنے کا باعث مولانا مسعود عالم بنے، جو مولانا ناظم صاحب سے ایک سال قبل ۱۹۲۸ء میں وہاں پہنچ چکے تھے، ندوۃ العلماء آمد اور وہاں مولانا کے زیر مطالعہ کتب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۲۸ء میں جب میں اپنے مرحوم دوست مولانا مسعود عالم ندوی کی تحریک و ترغیب پر مدرسہ عزیزیہ چھوڑ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آیا، تو اس درس گاہ کا ماحول بالکل مختلف پایا، طلبا کی اپنی انجمن 'الاصلاح' تھی، جس کا ایک وسیع کتب خانہ تھا، اس کی شان نرالی دیکھی، اپنی مختصر سی تعلیمی زندگی میں پہلی مرتبہ طلبا کی اس قدر اچھی لائبریری کے دیکھنے کا موقع ملا۔ جس کا سارا نظم و نسق طلبا کے ہاتھ میں تھا، بچوں کا شعبہ علیحدہ تھا اور بڑے طلبا کا شعبہ علیحدہ تھا، بڑے طلبا اپنے چھوٹے بھائیوں کی مطالعہ میں مدد کرتے، ان کے علم، استعداد اور ذوق کے لحاظ سے ان کی رہنمائی کرتے، وہاں پہنچ کر 'آب حیات' کے علاوہ 'گل رعنا' مولفہ مولانا عبدالحئی حسنی تاریخ ادب اردو (از رام بابو سکسینہ) ترجمہ حسن عسکری اور دوسری ادبی کتابیں اور بہت سے اردو دواوین کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پریم چند کے بہت سے مختصر افسانوں کے مجموعے 'پریم پچیسی'، 'پریم بتیسی' وغیرہ اور عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول پڑھنے کا موقع ملا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ادبی و علمی ذوق بہت بلند تھا۔ وہاں جا کر محسوس ہوا کہ جب تک اردو کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ نہ کیا جائے کسی ادبی و علمی مجلس میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔"

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے اسی عہد میں مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک قلمی رسالہ جاری کیا، جس کے قلم کاروں میں مولانا ناظم صاحب بھی شامل تھے۔

خوش قسمتی سے ۱۹۳۱ء میں علامہ تقی الدین ہلالی استاد ادب کی حیثیت سے دارالعلوم ندوہ تشریف لائے، ان کی آمد سے دارالعلوم کی فضا میں بہار آ گئی اور فضا صحیح عربیت سے متاثر ہوئی۔ نیز صحیح عربی بولنے اور لکھنے کا طلبا میں ذوق پیدا ہوا، ہلالی صاحب کی فصیح گفتگو ایک ادبی درس کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس دوران ہلالی صاحب سے جن طلبا نے بھرپور فائدہ اٹھایا ان میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی شامل ہیں۔

مولانا ناظم صاحب اپنی محافل میں ہلالی صاحب کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کرتے تھے، شیخ تقی الدین ہلالی جب مراکش واپس پہنچے تو وہاں کے رسالے 'دعوت' میں ایک مضمون لکھا جس میں اپنے ان تین عزیز ترین شاگردوں مولانا مسعود عالم مولانا ابوالحسن ندوی اور مولانا ناظم ندوی کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔

محرم ۱۳۵۱ھ سے شیخ تقی الدین ہلالی کی نگرانی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عربی رسالہ 'الضیاء' جاری ہوا، اس رسالے کے خاص مضمون نگاروں میں مولانا ناظم ندوی بھی شامل تھے، 'الضیاء' صرف چار سال تک جاری رہا، مولانا ناظم صاحب کا اس رسالے سے قلمی تعاون برابر جاری رہا۔ 'اخبار عالم' کالم پر تبصرہ مولانا ناظم ہی لکھتے۔ اس کے علاوہ کتابوں پر تبصرے بھی لکھتے تھے، ندوۃ العلماء سے مولانا ۱۹۳۲ء میں فارغ ہوئے اور ۱۹۳۳ء کے آغاز میں علامہ سید سلیمان ندوی کے مشورے سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) تشریف لے گئے، یہاں آپ کا تقرر بحیثیت استاد ادب عربی ہوا۔ ڈابھیل جانے کے باوجود مولانا کا ندوۃ العلماء اور ندوی برادری سے تعلق منقطع نہیں ہوا، بلکہ 'الضیاء' سے بھی تعلق باقی رہا اور آپ اخبار عالم کے کالم پر تبصرے ڈاک سے بھیجتے رہے۔

ڈابھیل میں مولانا کا قیام شوال ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۸ء تک رہا۔ اس زمانے میں وہاں جو دیگر معروف اساتذہ موجود تھے، ان میں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا یوسف بنوری شامل ہیں۔

۱۹۳۸ء کے آغاز میں مولانا اپنی مادر علمی دارلعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد ادب عربی

تشریف لائے، یہاں انہیں علامہ سید سلیمان ندوی ہی نے طلب کیا تھا وہ اپنی مادر علمی میں دس سال مقیم رہے، اس دور میں آپ نے عربی ادب کی مشکل ترین کتابوں کا درس دیا اور اونچے درجے کے طلبا کو پڑھایا' آپ کی زیر درس کتابوں میں 'مقدمہ ابن خلدون'، 'حجۃ اللہ البالغۃ'، 'دلائل الاعجاز' اور 'اسرار البلاغۃ' وغیرہ شامل ہیں۔

اس دور میں مولانا ناظم صاحب نے بحیثیت مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء بھی خدمت انجام دیں، اس بارے میں تاریخ ندوۃ العلماء میں مذکورہ ہے:

> "عربی کے ادیب مولانا محمد ناظم صاحب ندوی مولانا محمد عمران خان صاحب کی غیر موجودگی میں قائم مقام مہتمم ہوتے جس کا سلسلہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک ان کے سفر پاکستان تک جاری رہا"۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر تقسیم ہوا، اور پاکستان آزاد ہوا، اس وقت مولانا محمد ناظم ندوی بحیثیت مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء خدمات انجام دے رہے تھے۔ ندوۃ العلماء میں مہتمم کے لیے اس زمانہ میں 'عمید' کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔

مولانا ناظم صاحب نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان تین مرتبہ پاکستان کا سفر کیا۔ آخری سفر آپ نے ۱۹۵۰ء میں کیا، اور اپنے اہل وعیال کے ہمراہ مستقلاً پاکستان کے اس وقت کے دار الخلافہ کراچی تشریف لائے۔

ابتدا میں آپ نے تقریباً ایک سال تک سعودی سفیر کی خواہش پر سعودی سفارتخانے میں خدمات انجام دیں انہیں دنوں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کی جگہ خالی ہوئی، اس اہم عہدے کے انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی، اس میں سب سے اہم شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی، علامہ سید سلیمان ندوی مولانا ناظم صاحب کی علمی اور انتظامی صلاحیت سے واقف تھے، اس سے قبل علامہ کی خواہش پر مولانا ناظم صاحب ان کی کتاب خطبات مدراس کا عربی میں نہایت کامیاب ترجمہ بعنوان 'الرسالۃ المحمدیۃ' کر چکے تھے۔ اس ترجمے کو علامہ صاحب نے نہ صرف خود پسند کیا، بلکہ ایک محفل میں علمائے ندوہ کے سامنے اس کی تحسین بھی کی تھی۔

مولانا ناظم صاحب کا تقرر بحیثیت 'شیخ الجامعہ عباسیہ' دسمبر ۱۹۵۱ء میں ہوا، اس عہدے پر

آپ نومبر ۱۹۶۳ء تک فائز رہے، مولانا ناظم صاحب کا دور جامعہ عباسیہ کا زریں دور کہا جا سکتا ہے، اس دور میں عرب ممالک کے سفراء کراچی سے بہاولپور کا سفر مولانا سے ملاقات کی غرض سے کرتے تھے، آپ نے جامعہ عباسیہ کی ترقی، علمی فضا کے قیام اور طلبا میں دینی اور علمی ذوق کے اضافے کے لیے بے انتہا کوششیں کیں، جامعہ عباسیہ سے ملحقہ مدارس جو دور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، مولانا ان کا اکثر دورہ کرتے اور ان کی بہتری کے لیے کوشاں رہتے۔ جامعہ عباسیہ میں خدمات انجام دینے کے علاوہ مولانا شہر کے بچوں میں درس قرآن وحدیث بھی دیتے تھے، اس دور میں مولانا نے جامعہ عباسیہ کے بعض طلبا کو جامعہ ازہر اعلی تعلیم کی غرض سے بھی بھیجا۔ ان طلبا کے لیے وظیفے کا انتظام پاکستان میں سفیر مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے تعاون سے کیا گیا، قیام بہاولپور کے دنوں میں مولانا کئی علمی مجالس اور کانفرنسوں میں شریک بھی ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں جامعہ پنجاب (لاہور) کے زیر انتظام علمی مذاکرہ اسلامی کا انعقاد ہوا، جس میں مولانا ناظم صاحب بھی شریک ہوئے، ہندوستان سے اس مذاکرے میں مولانا عبدالماجد دریابادی خصوصی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ واپسی پر مولانا دریابادی نے صدق جدید میں اس مذاکرے کی روداد لکھی اور ناظم ندوی سے ملاقات کا احوال اپنے مخصوص انداز میں کیا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کو کراچی میں ادارہ معارف اسلامی (Islamic Research Academy) کا افتتاح ادارے کے بانی مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے کیا، ادارے کے نائب صدر کا عہدہ مولانا ناظم ندوی کو دیا گیا۔ اس موقع پر مولانا مودودی نے ایک فکر انگیز مقالہ "تہذیبی کشمکش میں علم وتحقیق کا کردار" پڑھا، جس میں ادارے کے قیام کی وجوہات اور اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی، مولانا ناظم ندوی تا وقت آخر اس ادارے کے نائب صدر رہے۔

نومبر ۱۹۶۳ء کو مولانا ناظم صاحب ایک سال کی رخصت پر 'جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ' بحیثیت استاد تشریف لے گئے۔ جب ایک سال بعد آپ بہاولپور واپس تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ جامعہ عباسیہ سے شیخ الجامعہ کا عہدہ ختم کر کے اس ادارے کو (جس کی ترقی کے لیے مولانا نے دن رات محنت کی تھی) اوقاف کے ماتحت کر دیا گیا ہے، ساتھ ہی مولانا کی ملازمت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا، بہاولپور میں قیام کا بقیہ عرصہ مولانا نے درس وتدریس کے مشاغل میں ہی گزارا۔

۱۹۷۰ء میں مولانا ناظم صاحب بہاولپور سے کراچی منتقل ہو گئے اور تقریباً تیس برس تک ملیر کی ایک رہائشی بستی 'درخشاں سوسائٹی' میں مقیم رہے، یہیں مولانا درس قرآن دیتے، طلباء و اساتذہ سے ملاقات کرتے، ان کی علمی رہنمائی کرتے اور ہر آنے والے سے انتہائی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن بڑے پیمانے پر منایا گیا، جس میں بحیثیت مہمان خصوصی 'شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود' تشریف لائے، اس موقع پر مولانا ناظم صاحب شدید خواہش کے باوجود علالت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔

۱۹۸۶ء میں مولانا ناظم صاحب اپنے اعزا و اقربا سے ملاقات کی خاطر ہندوستان تشریف لے گئے، اس دوران برس ہا برس کے بعد اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی زیارت کی، اپنے قدیم دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور شاگردوں سے ملاقات کی، مولانا ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی ترقی اور معیار تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے اور نجی محافل میں اس پر اظہار مسرت فرماتے تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۸ جون ۱۹۸۶ء کو استنبول سے دہلی جاتے ہوئے کراچی میں مختصر قیام کیا، اس موقع پر سابق صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم مولانا علی میاں سے ملنے خاص طور پر اسلام آباد سے کراچی تشریف لائے، اس ملاقات کے دوران مولانا ناظم صاحب بھی موجود تھے، مولانا ناظم صاحب ہر محفل میں ندوۃ العلماء اور اپنے صدیق حمیم مولانا علی میاں کا ذکر انتہائی محبت سے کرتے، مولانا علی میاں بھی اپنی ہر نئی تصنیف کا نسخہ مولانا ناظم صاحب کو ضرور بھیجتے۔ مولانا ناظم صاحب مولانا علی میاں سے ملاقات کی خواہش کا بھی بار بار اظہار فرماتے، ۱۹۹۳ء میں مولانا کی یہ خواہش پوری ہوئی، اگست ۱۹۹۳ء میں 'رابطہ ادب اسلامی' کی کانفرنس استنبول میں منعقد ہوئی، گو کہ مولانا ناظم صاحب ضعیف ہو چکے تھے، اور تنہا سفر کرنا مشکل تھا مگر مولانا علی میاں کی محبت میں آپ استنبول پہنچے اور کانفرنس میں شرکت کی۔ استنبول کے ائرپورٹ پر مولانا علی میاں، مولانا ناظم صاحب کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ مولانا ناظم صاحب نے واپسی پر راقم سے فرمایا کہ جب برسہا برس کے بعد بظاہر ملاقات ہوئی تو مولانا علی میاں کی آنکھیں نم تھیں۔ اس موقع پر مولانا ناظم صاحب نے کہا 'مولانا! میں سمجھتا تھا کہ میں آپ سے زیادہ محبت کرتا ہوں مگر آج ایسا

لگتا ہے کہ آپ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں"۔

تین سال قبل غسل خانے میں گرنے سے آپ کے Hip Joint کا فریکچر ہوا، جس کا آپریشن کیا گیا۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں مولانا خرابی صحت کی بنا پر صاحب فراش ہو گئے، البتہ گفتگو اور یادداشت کا وہی عالم تھا، بالآخر حیات مستعار کی گھڑیاں ۹ جون ۲۰۰۰ء کی صبح ساڑھے سات بجے پوری ہو گئیں، اور مولانا ناظم ندوی صاحب نے بڑے سکون اور اطمینان سے داعی اجل کو لبیک کہا، اس روز ماہ مبارک ربیع الاول کی ۵ تاریخ اور جمعہ کا مبارک دن تھا، تدفین بعد نماز جمعہ ماڈل کالونی کے قبرستان (نزد کراچی ایئرپورٹ) میں ہوئی۔

مولانا ناظم صاحب کے تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں حیات ہیں، آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی (اہلیہ ڈاکٹر ظفر انصاری) کا انتقال اسلام آباد میں ہوا۔

مولانا کے معروف تلامذہ میں مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنو) ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء) مولانا واضح رشید ندوی، مولانا وصی مظہر ندوی (حیدرآباد) مولانا سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد) ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی (جامعہ ملیہ) اور مولانا جلیل احسن ندوی (مرحوم) شامل ہیں۔

مولانا ناظم ندوی صاحب پاکستان میں ندوۃ العلماء اور ندوی برادری کے حقیقی نمائندے تھے۔ ندوی حضرات کا طرۂ امتیاز صحیح عربی دانی، تاریخ اسلام، قرآن و حدیث نیز حالات زمانہ سے مکمل آگاہی ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت ان تمام خوبیوں کی جامع تھی، خصوصاً قرآن مجید اور عربی زبان و ادب کے ذکر سے آپ کی کوئی محفل خالی نہ ہوتی، مولانا کئی کئی دن بلکہ ہفتوں قرآن کی ایک ایک آیت پر غور کرتے اور پھر اپنی تحقیق کے نتائج معاصرین کے سامنے پیش کرتے، قرآنیات کے حوالے سے آپ کے مقالات میں بھی نئی نئی تحقیقات و نکات ملتے ہیں۔ اسی طرح آپ کو بے شمار قصائد زبانی یاد تھے نجی گفتگو میں عربی زبان کے شعر سناتے اور ان اشعار کی لغوی، صرفی نحوی تفصیلات بیان کرتے اور تشریح فرماتے، مولانا کو علم جغرافیہ سے بھی خاص شغف تھا، اس موضوع پر آپ برابر مطالعہ کرتے اور نئی نئی کتب اور جغرافیہ کے نقشوں کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے، اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار فرماتے کہ جغرافیہ جیسے مفید علم کو جس میں مسلمانوں کی

خدمات بیش بہا ہیں، عربی مدارس نے انہیں نصاب سے خارج کر دیا ہے، اس حوالے سے بعض افسوس ناک واقعات سناتے۔

مولانا ناظم صاحب ندوی زندگی بھر تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے، اس دوران آپ نے مفید علمی کام بھی سرانجام دیئے جن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) 'خطبات مدراس' کا عربی ترجمہ بعنوان 'الرسالۃ المحمدیہ' یہ ترجمہ مولانا نے علامہ سید سلیمان ندوی کے کہنے پر کیا تھا۔

(۲) عربی دیوان 'باقۃ الازہار'

(۳) 'قصیدۃ رائیہ'

(۴) ۱۹۹۳ء میں استنبول سے واپسی کے بعد ترکوں کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا، اس قصیدے کے آخری اشعار میں اپنے صدیق حمیم مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کا ذکر انتہائی محبت سے کیا ہے۔

(۵) 'الترجمۃ العربیہ' از مولانا مسعود عالم ندوی کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مولانا ناظم صاحب نے بھی مدد دی۔

(۶) 'اسلام کا اقتصادی نظام' از مولانا مودودی کا عربی ترجمہ

(۷) مولانا مسعود عالم کی کتاب 'حاضر مسلمی الھند وغابرھم' کے آخری دو ابواب مولانا ناظم صاحب کے قلم سے ہیں۔

(۸) 'عورت مرد کے برابر کیوں نہیں؟'

یہ مختصر کتاب چند برس قبل کراچی سے شائع ہوئی۔

(۹) ایک معروف فرقے پر مولانا کتاب لکھ چکے تھے مگر شائع نہ ہو سکی۔

(۱۰) ان کتب کے علاوہ مولانا کے مقالات و مقدمات کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے، مولانا نے پاک و ہند کے معروف رسائل معارف (اعظم گڑھ)، ندیم (گیا) فاران کراچی چراغ راہ (لاہور) الزبیر) بہاولپور) جامعہ (دہلی) وغیرہ میں مختلف علمی مقالات و مضامین لکھے تھے۔ اسی طرح مختلف کتابوں پر آپ کے مقدمات معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں۔

تاجدار عادل

محبت پرانی نہیں ہوتی

مجھ سے میرے والد صبا اکبر آبادی نے یہ جملہ اس وقت کہا جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء کے کہے ہوئے اپنے ایسے اشعار کیسے لگتے ہیں۔

مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے تو ایسی کیا قیامت ہوگئی ہے

محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی

یہ جواب جہاں ان کی فکر کا ترجمان تھا وہیں ہمیشہ کے لیے میرا رہنما بھی ہوگیا اور پھر بہت دن کے بعد اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ جب میں نے حضرت صبا اکبر آبادی کا غزلوں کا مجموعہ اوراق گل پڑھنے کے لیے اٹھایا اور پھر خیال کی کسی رو کے تحت فال کے انداز میں بیچ سے کتاب کھولی پھر جو شعر منتخب ہو کر سامنے آیا وہ تھا:

سوچنے سے خود یقیں آتا نہیں　　　　واقعات عشق ہیں اتنے عجیب

میں جیسے اس شعر کی معنویت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ خیالات لہروں کی تیزی کی طرح تصویر بن کر نگاہوں میں آنے لگے اور پھر اچانک مجھے صبا صاحب کی غزلوں کی دوسری کتاب ثبات کا ایک شعر یاد آیا جو یوں تھا۔

میں دل کی لو کو پردہ جاں میں لیے رہا
کہتی رہی ہوا کہ مخالف نہیں ہوں میں

جب میری شاعری کی پہلی کتاب 'مات ہونے تک' پہلی بار شائع ہوئی تو اس کی اشاعت کے موقع پر بقول مشفق خواجہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو مات ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ زندگی سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جناب صبا اکبر

آبادی کے نئے گھر اور نئی دنیا میں چلے جانے کے بعد مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک ایسا واقعہ، سانحہ اور حادثہ یکا یک رونما ہوگیا، جو اب ہر روز میری روح میں دوبارہ ویسے ہی قیامت برپا کردیتا ہے۔ دل کی لو کو پردہ جاں میں چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی کتابوں کے چاند سورج روشن ہیں لیکن چراغ حیات بجھ گیا ہے۔

یہ سب کیوں ہوا۔ اور کیا ہوگیا، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھے اپنی کتابوں کے درمیان مسکرا رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں، عینک کے پیچھے سے ان کی بڑی بڑی فکر انگیز آنکھیں کسی انجانے خیال کی روشنی سے چمک رہی ہیں، وہ مجھے دیکھتے تو ہیں لیکن...... بس...... مجھ سے باتیں نہیں کرتے..... اپنے گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے شام کے ٹھیک چھ بجے تھے کراچی ٹیلی ویژن اسٹیشن پر میرا حسب معمول دیر تک کام کرنے کا ارادہ تھا کہ اچانک ساتھ رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو آپریٹر نے کہا آپ کے گھر سے فون ہے۔

فون ملا تو دوسری طرف سے گفتگو کرنے والی باجی تھیں۔

"سنو پاپا کی طبیعت اچانک کچھ خراب سی ہوگئی ہے۔ تم ذرا جلدی گھر آجاؤ"

پھر مجھے کچھ یاد نہیں کہ کس طرح راستہ گزرا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں خوفزدہ اور جلد از جلد گھر پہنچنے کے خیال سے کمرے سے نکلا تھا اور ۶ بج کر ے منٹ پر تمام بھیڑ سے گزر کر اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں ایک ناقابل بیان کیفیت میں تھا۔ پر اُمید لیکن سہما ہوا۔

جتنی تیزی سے میں گھر تک آیا تھا اتنا ہی آہستہ آہستہ بغیر آواز کیے شدید دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے پاپا کے کمرے میں جھانکا اور ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ میں سجدے میں گر پڑوں۔ پاپا حسب سابق اپنے کمرے میں اپنی مسہری پر بیٹھے تھے اور سامنے بھائی جان بیٹھے ان سے باتیں کررہے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا، مجھے دیکھ کر پاپا مسکرائے اور زندگی بھر کا مخصوص جملہ دہرایا۔

"آگئے؟"

اس آ گئے میں ہمیشہ ایک سوال چھپا ہوتا تھا کہ کتنی دیر کے لیے؟ آ گئے۔
اور میرے جواب میں یا تو آئندہ کا پروگرام ہوتا یا اس بات کا اظہار کہ اب میں گھر رہوں گا۔لہذا میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں آج کا کام مکمل ہو گیا"۔

اور اچانک میری نظر ایک تولیہ پر پڑی جو خون سے بھری ہوئی تھی اور پھر میری نگاہ دوسرے تولیہ پر پڑی جو مختلف جگہوں سے سرخ ہو رہی تھی اور اچانک پاپا کی ناک سے پھر خون بہنے لگا۔
یہ بیماری ہمارے گھر کی پہلی بیماری تھی۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر میں بیماری کیسی ہوتی ہے۔ یہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے ہمارے گھر میں کوئی بیماری نہیں ہوا تھا۔
سب ہی بیمار ہوئے تھے کئی بار ہوئے تھے لیکن کسی موقع پر ہم میں سے کوئی گھبرایا نہیں تھا کسی کی بیماری کو بیماری ہی نہیں سمجھا گیا تھا لیکن آج ہم سب گھبرا رہے تھے۔
ہمارے گھر کے آنگن میں لگا برگد کا درخت آندھی کی زد پر آیا ہوا تھا۔ یہ برگد جس کا سایہ صرف ہم پر ہی نہیں پورے معاشرے پر پڑ رہا تھا۔
گھر بھر میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بلڈ پریشر کی ایک شدید کیفیت ہے پھر شہر کے دو تین ڈاکٹر صاحبان آئے۔ پاپا اسپتال گئے دو تین دن قیام کیا۔ ٹھیک ہو گئے اور واپس آ گئے لیکن روزدو تین ٹیبلٹ استعمال کرنے کی ہدایت کے ساتھ اور پھر بیماری کے معاملات نارمل اور پاپا جسمانی طور پر کمزور ہوتے چلے گئے۔

اس بیماری کے بعد پاپا محترم ڈاکٹر محمد نسیم خان، ڈاکٹر رضا اور ڈاکٹر عبدالحق جیسے عظیم مسیحاؤں کے زیر علاج رہتے تھے چنانچہ جب کوئی ایک ڈاکٹر کسی موقع پر ایک دوا لکھتا تو میں پاپا کو وہ دوا شروع کرانے سے پہلے کی کیفیت باقی دونوں ڈاکٹروں کے پاس باری باری تنہا جا کر بیان کرتا اور حیرت انگیز بات یہ کہ ان تینوں کے نسخوں میں کبھی کوئی فرق نہ ہوتا۔ یہ تینوں عظیم ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم انسان بھی ہیں اور مزاج شناس بھی لہذا علاج کے لیے کم سے کم دواؤں کے سہارے ڈھونڈتے۔ دوسری طرف پاپا ایک با اصول انسان کی حیثیت سے جس کی زندگی میں نظم وضبط، اقدار و روایت، جزو ایمان کی طرح ہوتا ہے ڈاکٹر کی ہدایت پر باقاعدگی سے عمل کرتے۔

ان تینوں ڈاکٹروں نے رات کو سوتے وقت پاپا کے لیے ایک خواب آور دوا مقرر کی ہوئی تھی جس کے کھانے کے آدھے گھنٹے بعد انہیں نیند آ جاتی، پھر وہ صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی بیدار ہوتے، چہل قدمی کرتے، پڑھتے لکھتے اور یہاں تک کہ وہ وقت آ جاتا کہ میری بھی صبح ہو جاتی اور ہم دونوں باپ بیٹے مزے مزے کی چائے پیتے، میز پر گرم گرم چائے کی بکھری ہوئی بھاپ کے درمیان کبھی میں کوئی سوال پوچھ لیتا یا کبھی کوئی اپنا ذاتی واقعہ یا واردات قلبی و روحانی اپنے کسی دوست کے نام سے بیان کر دیتا یا پھر پاپا صبح کے مطالعے کے بعد کسی بات کے حوالے سے کوئی ذکر کر دیتے۔ سعدی، بیدل، غالب، اور خیام کے اشعار کی تشریح کرتے۔ اس شعر کی حکمت، خوبی، اور انداز بیان بتاتے، اسی مضمون اور خیال کو دیگر فارسی شاعروں کے ہاں بیان کرنے کا طریقہ بتاتے، کوئی واقعہ سناتے، اردو شاعری میں یہ خیال کس طرح سے اور کس شاعر نے لکھا ہے یہ بتاتے اور اس آدھے ایک گھنٹے میں میرا ایک تعلیمی سیشن مکمل ہو جاتا۔ غرضیکہ زنان خانے سے خواتین کی آمد اور اس کے بعد کیفیت اور بات کا تسلسل بکھرنے تک سورج کی روشنی میں مزید چمک آ جاتی اور دن کی خوبصورتی میں ایک خوبصورت دن کا آغاز ہو جاتا۔

میں تیار ہو کر ٹیلی ویژن اسٹیشن چلا جاتا اور پاپا بہت سارے شاعروں اور ادیبوں کے کام کرنے یعنی لکھنے اور مختلف لوگوں کے نام کے لفافوں میں چھپانے میں مصروف ہو جاتے۔ چلیے......اس مصروفیت کی ذرا سی وضاحت کر دوں۔

بہت سارے دن پہلے کی بات ہے ہمارا گھر بن رہا تھا اور سارے افراد خانہ ایک بے پایاں خوشی کے عالم میں یہ سوچ رہے تھے کہ اس گھر کا کیا نام رکھیں۔ پاپا کہیں گئے ہوئے تھے اور گفتگو میں شریک تمام لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے تو اس وقت میری دادی نے جو جائے نماز پر ہی زندگی بسر کرتی تھیں۔ مصلے سے بیٹھے بیٹھے کہا کہ اس گھر کا نام تو خانقاہ رکھ دو کیونکہ محمد امیر تو مانگنے والوں کو اپنے جسم کے کپڑے تک دینے سے باز نہیں آئے گا۔ پاپا کا خاندانی نام خواجہ محمد امیر ہے اور ہماری دادی انہیں ہمیشہ محمد امیر یا گھر کے پیار کے نام سے بلاتی تھیں۔

پاپا کے لفافے بھرنے کے عمل کو دیکھ کر میں سوچتا کہ گو ہم نے گھر کا کوئی نام نہیں رکھا لیکن واقعی خانقاہ درست ہی نام تھا۔ ہر شخص کو اس کے حسب ضرورت جیسی تحریر چاہیے ملتی رہتی۔ نظمیں،

غزلیں، رباعیاں، مضامین وغیرہ......

میں غصہ کے عالم میں بار بار پاپا سے کہتا کہ مجھے ان لوگوں کے نام بیان کرنے دیں اور ہر بار وہ مجھے بے انتہا سختی سے ڈانٹ کر منع کر دیتے بلکہ یہ بات کہہ دینے کی خواہش پیدا ہونے کی سزا کے طور پر شدت ناراضی سے گفتگو بند کر دیتے لہذا مجبوراً خاموش ہو جانا پڑتا۔

مجھے یاد ہے کہ اگر بچپن میں مجھے پاپا سے کسی بات پر مار پڑی ہے تو صرف اسی بات پر کہ میں نے کسی کو دیا جانے والا مضمون یا نظم یا غزل غائب کر دی اور تقریباً ہر روز جاری رہنے والے اس سلسلے کا اختتام ان کی تمام زندگی میں نہ ہوا۔

گزشتہ دس سال سے میں ہمیشہ پاپا کے کمرے میں ان کے سامنے والے بستر پر سوتا تھا اور رات کو اگر وہ اچانک جاگ جاتے اور ٹوائلٹ جا رہے ہوتے جو باہر برآمدے کے ساتھ تھا تو میں ان کے گر جانے کے خوف سے انہیں اس بات کا احساس ہوئے بغیر کہ کوئی ان کے پیچھے آ رہا ہے ہوا میں دونوں ہاتھ پھیلائے ان کے پیچھے چلتا رہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بھرپور نیند میں اندازے سے راستہ چلتے تھے اور زمین گیلی بھی ہو سکتی تھی اور کسی بھی لمحہ پھسلنے کا احتمال بھی ہوتا تھا۔

جب ٹیلی ویژن اسٹیشن پر میری رات کی ریکارڈنگ یا ایڈیٹنگ ہوتی تو میرے چھوٹے بھائی شاہد سلمان یہی سارا کام بغیر کسی کو بتائے ہوئے کر رہے ہوتے تھے اور اگر کسی موقع پر ہم دونوں کو رات کی نوکری کرنی ہوتی تو کوئی ایک چھٹی کر لیتا اور کبھی اگر چھٹی کرنا ممکن نہ ہوتا تو ہم لوگ رات بھر اپنی اپنی نوکریاں کرتے ہوئے کسی انجانے خوف سے لرزتے رہتے۔ ہم سب لوگ اپنے خیالوں میں پاپا کی اس طرح حفاظت کرتے تھے جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ طویل گھاٹیوں کے درمیان کسی باریک تار پر چل رہا ہو اور ہماری نگاہیں دعائیں کر کے اس کے گرد حصار کرتی ہوں۔

لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی شاہد سلمان صاحب شادی کے بعد سیر و تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گھر خالی ہو چکا تھا اور گھر میں صرف پاپا، میں، امی اور چھوٹی بہن رہ گئے تھے۔

یہ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۰ء کی ایک نرم گرم دوپہر کی بات ہے کہ میں اچانک اپنے گھر کے زینے سے اس طرح گرا کہ میری کمر میں شدید چوٹ آئی۔ میں اٹھ نہیں سکتا تھا، چل نہیں سکتا تھا، ہل نہیں سکتا تھا۔ گرنے والی رات میں اپنے بستر پر ہی سویا لیکن مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ درد کی

شدت دور کرنے والی دواؤں کے اثر کے ساتھ ساتھ نیند کی دوا کا بھی بھرپور اثر تھا اور یہ تو وہ راتیں تھیں جب کہا گیا تھا کہ کراچی میں بیسویں صدی کی شدید ترین سردی پڑی تھی۔

پھر اچانک آدھی رات کو میں جاگا۔ آدھی نیند اور بھرپور پیاس میں، میں نے پانی مانگا، میری آواز کے چند لمحوں بعد میرے پسندیدہ چاندی کے کٹورے میں ٹھنڈا میٹھا پانی آ گیا۔ میں نے گہری نیند کے عالم میں جانے کس طرح پانی پیا اور سو گیا، کچھ دیر بعد اچانک عالم خواب و بے خوابی کے درمیان مجھے خیال آیا کہ مجھے پانی کس نے پلایا گھر میں تو دو خواتین ہیں جو دوسرے حصے میں ہوں گی یہاں پاپا سو رہے ہوں گے۔

یہ کون ہے؟

ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس بھرپور سردی میں وہ نحیف اور کمزور پاپا ایک چادر اوڑھے میرے پلنگ کے سامنے کرسی ڈالے امید و بیم میں الجھی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس رات وہ اپنی دوا کھانا بھول گئے تھے اور دوا کھانا کھانے کے بعد کھائی جاتی تھی۔ جس کا مطلب ہے کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ایک اضطراب، اضطرار، خاموشی، گیان اور دعاؤں کے ساتھ وہ سامنے بیٹھے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔

غارت گر قرار وز را دل صبا کا دیکھ　　　جیسے پڑا ہو کوئی خزانہ لٹا ہوا

میرے جاگنے کے عمل میں وہ فوراً اٹھ کر آئے اور ان کے لہجے کی گرمی اور محبت کی جگمگاہٹ چاروں طرف پھیل گئی۔

کیسی طبیعت ہے۔ انہوں نے پوچھا۔

جی بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے منہ سے نکلا۔

پھر یہ بتانے کے لیے کہ میں ٹھیک ہوں چل پھر سکتا ہوں ڈاکٹروں کی ہدایتیں صرف حفاظتی ہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹوائلٹ کی طرف چل دیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے پیچھے ہے۔ میں مڑا اور میں نے دیکھا کہ جس طرح ہم خاموشی سے بغیر پاپا کو اطلاع دیئے چپکے چپکے ان کے گر جانے کے امکانی خوف سے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے ویسے ہی بھرپور سردی میں وہ کمزور اور نحیف پاپا میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

دنیا کے ہر انسان سے اسی طرح محبت کرنے والا اور میرے لاڈ اٹھانے والا یہ شخص ایک دن اپنے ماں باپ کے پاس چلا گیا۔ اس ملک میں چلا گیا جہاں اس کے بے شمار دوست، بہت سارے محبت کرنے والے، اس کے لیے دعا کرنے والے، چاہنے والے تھے، میرا خیال ہے کہ پاپا کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ میں ان کی یاد میں کس طرح رہوں گا۔ انہیں تو اس دنیا کی قید سے آزاد ہونے کی خواہش تھی۔ سو وہ پوری ہوگئی۔

پاپا کو پرندوں، آزادی اور انسانوں سے بہت محبت تھی۔ ان کا آزادی کا تصور اتنا دل فریب اتنا لطیف، خوبصورت اور نغمہ بار تھا کہ سن کر یوں لگتا جیسے آپ کسی آہستہ روندی کے قریب لہلہاتے ہوئے چمن میں ننھے ننھے پھولوں اور بلند قامت درختوں کے درمیان آسمان سے گرتی ہوئی ہلکی ہلکی پھوار میں کھڑے ہوں۔ مدہم سروں میں کسی گیت کی کوئی لے مچل رہی ہو اور زندگی کا ہر لمحہ روشن نظر آتا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس پہلے ماہنامہ کا اجراء کیا اس کا نام بھی 'آزاد' تھا۔ وہ صبا مزاج بھی تھے اور صبا کی طرح آزاد رہنا اور رکھنا بھی چاہتے تھے۔

ایک روز سردیوں کی دھند میں نہائی ہوئی سورج کی روشنی سے ذرا پہلے کی صبح اپنے بستر سے آنکھ کھول کر میں نے دیکھا کہ پاپا سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ بستر پر ہی موجود نہیں ہیں چند لمحوں تک میں انتظار کرتا رہا۔ پھر جلدی سے اٹھ کر دیکھا تو وہ گھر کے متوقع کسی حصے میں موجود نہیں تھے۔ پھر میں نے دیکھا برآمدے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہاں سے آگے بڑھا تو ہمارے گھر کے چھوٹے سے لان کی طرف رات بھر کی اوس پر پیروں کے نشان جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں ذرا اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا خوش رنگ پرندہ، پاپا کے ہاتھ میں تھا اس کا ایک طرف کا بازو اور سینہ زخمی تھا اور پاپا اس کے زخم صاف کر کے روئی سے بھرے ہوئے آئینہ پیالے سے اس پرندے کو بٹھائے اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے ہتھیلی پر ایک ایک دانہ چن کر رکھتے اور اس معصوم پرندے کو کھلا رہے تھے۔

بھرپور سردیوں میں، اپنے آپ کو صرف ایک چترالی اوور کوٹ میں چھپائے پاپا اس وقت ایک ایسے معصوم بچے کی طرح نظر آ رہے تھے جس کے لیے زندگی کا سب سے اہم مسئلہ اس پرندے کی حفاظت تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی جیسے انہوں نے نہیں دیکھا۔ اس چھوٹے سے پرندے کو آرام

پہچاننے کی کوشش میں مصروف وہ اپنے آپ سے بھی بے نیاز تھے۔ میں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ قدرت نے اس انسان کو کیسا محبت بھرا دل دیا ہے جو سمندر کی طرح ہمیشہ انسانوں کی چاہت کے جذبے سے لبریز رہتا ہے۔

تین چار دن تک مٹی کا وہ پیالہ پاپا کے کمرے میں ان کے بستر کے ساتھ میز پر رکھا رہا روز صبح اٹھ کر پاپا اس پرندے کو ایک معصوم بچے کی طرح صاف کرتے، ناشتہ کراتے اور زخموں کا معائنہ کرتے۔

میرے لیے ان کا یہ انداز ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ لہٰذا میں اپنے بستر پر پڑا بظاہر سوتا ہوا، کن انکھیوں سے یہ سارا کھیل دیکھتا رہا۔ کچھ دن کے بعد وہ ننھا پرندہ صحت مند ہو گیا اس کے بازو کے نچے ہوئے پر واپس آنے لگے اور وہ اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ پاپا اس کی ان کوششوں کو دیکھتے تو یوں لگتا جیسے انہیں اس پرندے کے اڑنے سے زیادہ دنیا کی کسی اور بات سے دلچسپی نہیں ہے۔ سورج ڈوبتا اور ابھرتا رہا، کئی دن بیت گئے اور ایک دن وہ پرندہ اڑ گیا۔

پاپا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اس دن انہوں نے مجھے پرندوں سے متعلق عربی، فارسی، انگریزی، اردو، ہندی کے نہ جانے کتنے محاورے، اشعار، فقرے اور کہاوتیں سنائیں۔ ان کے جذبے کو سراہتا ہوا اور دل ہی دل میں یادداشت کی داد دیتا ہوا میں ٹیلی ویژن اسٹیشن چلا گیا۔

شام کو جب میں واپس آ رہا تھا تو پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ آج کا دن اس مشغلے کے بغیر پاپا نے کیسے گزارا ہوگا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ حسب معمول کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔

"......آ گئے......؟"

انہوں نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"جی......!"

وہ پرندہ؟ میں نے کسی امکان بھرے لہجے میں پوچھا۔

جو جو؟ پاپا کی بھرائی ہوئی شگفتہ آواز آئی۔

جی ہاں آپ کا......جو جو......

پاپا کی ایک عادت تھی جس سے جتنا زیادہ پیار ہوتا اس کا ویسا ہی نام رکھ دیتے۔ لہٰذا ان کے سارے بچوں کے اور بچوں کے دوستوں کے کوئی نہ کوئی لاڈ کے نام رکھے ہوئے تھے۔ اب اس ہجوم میں ایک نام کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔

جوجو...... یہ اس پرندے کا محبت بھرا نام تھا۔

"بھئی محبت کرنے والے کہاں جاتے ہیں"

پاپا نے اپنی زندہ اور ہر لحہ تازہ پھول کی طرح مہکنے والی آواز میں کہا اور پھر اپنے ریشمی لحاف کا کونا ذرا سا اوپر کیا۔

جوجو...... آرام سے ان کی بغل میں چھپا...... پاپا کے جسم کی حرارت میں دبکا ہوا تھا۔ لحاف اٹھنے سے روشنی پڑی تو اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے بے نیازی سے دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں...... اور پاپا نے اس پر واپس لحاف ڈال دیا۔

"لیکن یہ تو اڑ گیا تھا" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

بھئی شام کو میں باہر برآمدے میں چائے پی رہا تھا تو یہ اڑتا ہوا آیا اور آ کر سامنے میز پر بیٹھ گیا۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا اس لیے اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور اوور کوٹ کا ایک کونا اس پر ڈال دیا۔ جب سے اب یہ کہیں جا ہی نہیں رہا ہے۔

جوجو...... ہمارے گھر میں آج بھی موجود ہے۔ بوڑھا دادا اس جوجو ایک بڑے سے پنجرے میں اپنے بہت سارے اہل خانہ پرندوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ان پرندوں کا نام اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ اب ہم انہیں جوجو خاندان کہتے ہیں۔ پاپا جب تک اس گھر میں رہے جوجو بالخصوص ان کے ساتھ ناشتہ کرتا۔ ان کے کمرے کی وسعتوں میں اڑتا اور چھت کے آسمان تک سیر کرتا اور واپس پاپا کے پاس گوشہ راحت میں پہنچ جاتا۔

پاپا کے جانے کے بعد جوجو اور اس کے ساتھیوں کو اب کسی صورت آرام نہیں آتا ہے۔ ہم کبھی کبھی ان کے بڑے پنجرے کا درواز کھول دیتے ہیں کہ وہ اڑ جائیں لیکن وہ اڑتے بھی نہیں، چیختے رہتے ہیں۔ ادھوری پرواز کرتے رہتے ہیں اور پنجرے میں لٹکے ہوئے جھولوں کو چھوڑ کر اس کی دیواروں کی جالیاں چباتے رہتے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں کہ روح کا زندان اس طرح نہیں

ٹوٹتا۔ میں نے سنا ہے اپنی روانگی کی رات سے قبل پاپا نے اپنے جسم کے گرد لگی ہوئی وہ ساری مشینیں ہٹوادی تھیں، جو انہیں اس دنیا میں روکنے کے لیے زنجیروں کا کام دے رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی روانگی کی اس طرح تیاری کی جیسے کسی محبوب کا بلاوا آیا ہو اور وہ تیار ہو کر پورے اطمینان قلب اور حضوری کے عالم میں جانا چاہتے ہوں۔ وہ جلوہ خاص جو انہیں بار بار اپنی جھلکیاں دکھارہا تھا اسے اور قریب سے اور دل کے نزدیک تر دیکھنے کے لیے، وہ بار بار ایک کیفیت میں ہوتے، اپنے چاندنی کی طرح اُجلے اور چمکدار بالوں میں کنگھا کرتے، درود شریف پڑھتے، اللھم لبیک کہتے۔ مسکراتے اور ایک شادمانی و سرشاری کے عالم میں ان کے چہرے پر ایک مخصوص مسکراہٹ آجاتی۔

بہت دن پہلے مجھے کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر منظور الدین احمد نے صبا صاحب کا ایک شعر سنایا تھا جو کچھ اس طرح تھا۔

یوں موڑ پر بقاء و عدم کے ہوں مطمئن
جیسے کہ اک مسافر منزل رسیدہ ہوں

بقول ڈاکٹر منظور احمد بقاء و عدم کے موڑ پر زندگی کے بھرپور لمحوں میں ایسے اطمینان اور سکون کی وہ کیفیت جو پوری خوبصورتی کے ساتھ شعر میں ڈھل جائے، صبا صاحب جیسے درویش کو ہی مل سکتی تھی۔

لہذا ۱۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بہت خوشی اور آرام کے ساتھ دل مطمئن لیے یہ شاعر رنگیں تو اچلا گیا۔

میں آج بھی پاپا کے کمرے میں سوتا ہوں، میرے بستر کے سامنے ان کا بستر خالی ہے۔ اب کمرے میں پاپا نہیں ہوتے ہیں یا شاید ہوتے ہوں تو مجھے نظر نہیں آتے۔ میں روتا ہوں تو وہ مجھے چپ نہیں کراتے ہیں۔ اب تو میں گر بھی پڑتا ہوں تو وہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ بالکل بدل گئے ہیں۔

اب وہ میرے والے پاپا نہیں رہے......

اب میں انہیں یاد کرتا ہوں اور بس......

کوئی بات لکھنا چاہتا ہوں تو لگتا ہے کہ نہیں لکھ سکتا

کہنا چاہتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ نہیں کہہ سکتا۔

اب ادب سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ اپنی شاعری کا اس شخص کے نام انتساب کیسے کروں جس نے ۱۹۷۰ء تک غزلوں کی پہلی کتاب 'اوراق گل' کی اشاعت تک ایک ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ غزل کے شعر کہے تھے اور اس کے بعد بیس ہزار سے زیادہ غزل کے اشعار مات ہونے تک کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے اہتمام یعنی ۱۹۸۰ء تک لکھے تھے۔

جس نے پاکستان بننے کے بعد سے طویل عرصے تک کم سے کم دو، ورنہ ہر سال چار پانچ مرثیے لکھے اور ۲۷ سے زیادہ مرثیے تو اس وقت ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ جس نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیات فارسی کو اردو رباعی میں بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے دوبارہ تخلیق کیا۔ جس نے ۱۹۳۸ء میں مکمل غزلیات غالب کی تضمین مکمل کر دی تھی اور کچھ عرصہ پہلے غالب کی تمام فارسی رباعیات کا اردو ترجمہ یوں کیا کہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اگر غالب بھی اپنی رباعیات کا ترجمہ کرتے تو ایسے ہی کرتے۔ جیسا صبا صاحب نے کیا ہے۔

امیر خسرو اور حافظ کی رباعیات کے ساتھ ساتھ غزلیات حافظ اور غزلیات غالب کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

خیر یہ فہرست تو اتنی طویل ہے کہ مجھے یاد آتا رہے گا اور میں لکھتا رہوں گا لیکن میرے لیے تو ان کا ذکر ایک حکایت لذیذ ہے۔ زندگی بھر بیان کرتا رہوں گا۔ اور سیراب نہ ہوں گا لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش آپ بھی میری اس کیفیت میں شامل ہو کر زندگی کی اقدار سے صبا اکبر آبادی کی محبت میں شریک ہوتے اور انسانیت اور زندگی کے حوالے سے روشن روایتوں اور زندہ کیفیتوں کا مشاہدہ کرتے جو صبا صاحب کے لوح لوح میں جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اب ایسی زیست کون کرے گا صبا کے بعد

جو کچھ میری تحریر میں خوبی ہے یا لطف ہے یہ سب مجھے صبا صاحب کی براہ راست تربیت سے ملی ہے۔ اس دوڑتی، جھنجلاتی اور چیختی ہوئی ناآسودہ دنیا میں، میں نے ایک ایسے شخص کو بے غرض، مطمئن اور قناعت پسند پایا جو کسی سے ناراض نہیں ہوتا تھا۔

اپنے کسی حریف سے واقف نہیں ہوں میں

اپنے سوا کسی کا مخالف نہیں ہوں میں

ان کا کوئی حریف بھی نہیں تھا، کوئی مقابل بھی نہیں تھا، شاید اس لیے کہ ان کا طریقہ ہمیشہ یہی رہا کہ......

اہل دنیا کو نہیں بھولا جا کبھی
اور ہوتی ہے خدا کی یاد کیا

انسانوں سے محبت اور ان کے کام آنے کو وہ خدا کی یاد تصور کرتے رہے۔ ذرا یہ شعر پڑھیے......

گدائی کر کے باب مصطفیٰ ﷺ پہ
صبا دنیا سے مستغنی رہا ہوں

اندازہ کیجیے جس کو در رسول سے عشق کی دولت مل گئی ہو وہ دنیا سے بے نیاز نہیں ہوگا اور اہل دنیا کے کام نہیں آئے گا تو اور کیا کرے گا۔

صبا صاحب کے پاس محبت کا ہنر تھا جسے وہ تمام عمر استعمال کرتے رہے......

وہ اقدار کی پاسداری پر یقین رکھتے تھے۔ اتنا یقین کہ اس کی سرحدیں ایمان کی سرحدوں تک پہنچ جاتی تھیں یا شاید اس سے مل جاتی تھیں جبھی تو انہوں نے کہا کہ:

بزرگوں کی روایت کو بچانے
شکستہ قلعہ کا فوجی رہا ہوں

شاعری ان کی روح میں سانس لیتی تھی اور خود انہوں نے ادب کو وہ مقدس مقام دیا ہوا تھا جو صاحبان شعور کا ہی حصہ ہوتا ہے۔

اے صبا دل میں نہ ہو کیوں احترام شاعری
شاعری نے تربیت دی ہے مجھے ماں کی طرح

شاید یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم نے زندگی بھر انہیں اپنے ہی شعر کی تفسیر دیکھا

یہ ہمیں ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

مجھے ان کی بہت سی باتیں زندگی میں سمجھ میں نہیں آئیں۔ یا شاید میرے لیے ان باتوں کے سمجھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں تو ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء تک ایک چھوٹا سا معصوم خوش رہنے والا بچہ تھا۔ لیکن بھرے میلے میں اپنے ہاتھ کو میری چھوٹی چھوٹی انگلیوں میں سے نکال کر جب پاپا چلے گئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں اچانک بڑا ہو گیا۔ بہت بڑا اور اب میری سمجھ میں کچھ باتیں آنے لگی ہیں۔

ایک بار حسب معمول سردیوں کی دھوپ میں آرام کرسی پر نیم دراز پاپا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھا انہیں پڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایک آدھ دن پہلے ایک عظیم الشان مشاعرہ اپنی توقع سے کچھ زیادہ ناکام دیکھ کر آیا تھا اور اسی الجھن میں تھا کہ ہمارے معاشرے سے شعر و ادب کا ذوق کم ہونے کی وجہ کیا ہے۔ بہت سوچ کر میں نے پاپا کی کرسی کے پاس پہنچ کر با آواز بلند اپنے خیالات کا اظہار اچانک اس طرح کیا کہ جیسے میں اپنے ذہن میں ان سے کوئی بحث پہلے ہی سے شروع کر چکا تھا۔

"میرے خیال میں ادب سے دوری کا سبب تعلیم کی کمی ہے"

پاپا نے کتاب پڑھتے پڑھتے بغیر سر اٹھائے آنکھیں اوپر کر کے اپنی پلکوں کے پیچھے سے مجھے یوں دیکھا گویا بات دہرانے کے لیے کہا ہو اس پر میں نے اپنا جملہ پھر دہرا دیا۔

"ہاں یہ بھی ایک سبب ہے......"

"لیکن اب سے ساٹھ ستر سال پہلے یا سن اٹھارہ سو کچھ میں تو تعلیم کا تناسب اس سے بھی کم تھا لیکن کیا سبب ہے کہ اس دور میں شعر و ادب زیادہ مقبول تھے......"

"تعلیم دو طرح کی ہوتی تھی" پاپا نے کتاب ایک طرف رکھی اور مجھے بتانا شروع کیا۔

"ایک کتبی تعلیم یعنی باقاعدہ تعلیمی درس گاہوں کے ذریعے ملنے والا علم۔ اور دوسرا علم مجلسی، یعنی صاحب فن اور صاحب علم حضرات کے ساتھ رہ کر جو علم حاصل کیا جائے۔ اس دور میں کتبی تعلیم کے تناسب نے بہت ترقی کی ہے لیکن معیار بہت گھٹ گیا ہے اور دوسری طرف مجلسی علم تقریباً ختم ہو گیا ہے"

"مجلسی علم کیوں ختم ہو گیا" میں نے سوال کیا۔

"کسی کو صاحبان علم سے ملنے کا اب کوئی شوق بھی نہیں رہا۔ ان کی محفل میں استعمال ہونے

والے وقت کو تفریح یا سیٹلائٹ کے پروگرام دیکھ کر گزارا جاتا ہے۔

''لیکن ادب سے بے نیازی کی وجہ تو اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

پاپا نے پھر مجھے ملائمیت بھری نظروں سے دیکھا اور بولنا شروع کیا۔

''پہلے تہذیب یافتہ معاشروں میں شرفا ء زندگی کا لطف لفظوں کے ذریعے حاصل کرتے تھے پورے معاشرے میں مکالمے کی فضا عام تھی۔ ایک آدمی کہہ کر دوسرے کی بات بھی سنتا تھا پھر دلیل یا رد دلیل کا سلسلہ چلتا تھا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص بول رہا ہے۔

پہلے شخص نے کیا کہا دوسرے فرد کو جواب میں کیا کہنا ہے نہ پہلے شخص کی خواہش ہوتی ہے اور نہ اسے معلوم ہوتا ہے......

اب یہاں زیادہ تر لوگ بول رہے ہیں سن نہیں رہے ہیں۔ اور ادب خواہ اسے قدیم ادب کہو یا جدید وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہر طرف بس آوازیں ہیں خیال نہیں ہے۔ الفاظ ہیں احساس نہیں ہے۔

صبا صاحب سے ہونے والی یہ گفتگو بیان کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ میں بھی تو یک طرفہ طور پر بس کچھ کہے جارہا ہوں اس بات سے بے نیاز کہ کوئی سن رہا ہے یا نہیں۔

اور اب پھر مجھے صبا صاحب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

سب اپنی ہی اپنی کہہ رہے ہیں
سنتا نہیں کوئی بھی کسی کی

مجھے خاک اڑاتی آنکھوں میں صبا صاحب کی بہت سی تصویریں بنتی نظر آرہی ہیں اور ان کا جو شعر یاد آرہا ہے وہ آپ کی نذر کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں۔

ملتے کہاں ہیں ایسے محبت رسیدہ لوگ
کرتے رہو ہماری زیارت کبھی کبھی

میری یہ تحریر ۱۹۹۵ء کی تھی آج بہت دنوں کے بعد مجھے خیال آرہا ہے کہ واقعی صبا صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے جس محبت رسیدہ انسان سے تربیت

حاصل کی اس کے بعد زندگی میں جو لوگ بھی ملے اچھے لگے

شکست اور فتح، جیت اور مات عارضی ہوتی ہے لیکن......

بہ قول صبا اکبرآبادی......

محبت کبھی پرانی نہیں ہوتی

بقیہ ڈاکٹر نثار...

ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا

ڈاکٹر نثار احمد قریشی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کے نہ ہونے کی ہونی دیکھنے کے لیے ان کے لاکھوں شاگرد اور کروڑوں مداح تقدیر کے لگائے ہوئے زخموں کے باوجود زندہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زندگی اب ایک مستقل محرومی کے سوا کچھ نہیں رہی۔

پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب

حسن کوزہ گر

شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے شائع ہوگئی ہے

معروف افسانہ، ڈرامہ نگار طاہر نقوی کا پانچواں افسانوی مجموعہ

کوؤں کی بستی میں ایک آدمی

ادارہ ممتاز مطبوعات کراچی سے شائع ہوگیا ہے

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (دہلی یونیورسٹی، دہلی)

سید عاشور کاظمی: اجالے یادوں کے

دن کون سا تھا؟ تاریخ کیا تھی؟ کچھ یاد نہیں لیکن 1993 میں نومبر کی ایک شام تھی۔ میں ایک تقریب میں گیا ہوا تھا۔ میں کنارے کھڑا تھا اور میری آنکھیں کسی جاننے والے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک دوست پر پڑی اور میں اس کی طرف بڑھا۔ سلام وکلام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ خوبصورت سوٹ میں ملبوس، چہرہ گورا اور چوڑا، سر کے زیادہ تر بال سفید، آنکھوں میں سونے گلاس والا چشمہ پہنے ایک صاحب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کی طرف دیکھنے لگا کہ اس دوست نے ان سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بھائی جان یہی عقیل ہے۔" بھائی جان کا لفظ سنتے ہی میں پہچان گیا کہ یہ برطانیہ کے معروف ادیب سید عاشور کاظمی ہیں۔ خوشی سے ان کا چہرہ کھلنے لگا۔ میرے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ تیزی سے وہ میری طرف اور میں ان کی طرف بڑھا۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میرے کان میں کہنے لگے لندن میں تمہاری باتیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ان سے اتنی باتیں ہوئیں کہ مجھے لگنے لگا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں اور مدتوں بعد ملے ہوں۔ حالانکہ چند مہینے پہلے ہی ہم دونوں ایک دوسرے سے غائبانہ طور پر متعارف ہوئے تھے۔

تقریب اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی سردی بھی تیز ہوگئی تھی اس لئے میں نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ کہنے لگے کل پھر آنا، اور بھی باتیں کرنی ہیں۔ میں دوسرے دن پھر ان سے ملا۔ اس ان سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ عاشور کاظمی کے متعلق پہلے سے جتنا میں جانتا یا سنا کرتا تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسے معمولی طالب علم سے وہ

اس قدر خلوص ومحبت سے ملیں گے اور اتنی باتیں کریں گے۔ عاشور کاظمی سے ملاقاتوں اور باتوں کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ وہ تقریباً ہر سال ہندوستان آتے تھے۔ یہاں جیسے ہی وہ آتے تھے تو راشٹریہ سہارا میں ذرا خبر شائع ہوتی کہ لندن کے معروف ادیب سید عاشور کاظمی دہلی میں موجود ہیں۔ بس اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان کی شان میں جلسے منعقد ہونے لگتے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کے انٹرویوز بھی لیے جاتے۔ یہاں آتے ہی خاص طور سے مجھے فون کرتے اور اپنے آنے کی خبر دیتے اور پوچھتے کہ کب مل رہے ہو۔ میں بھی ان سے ملنے کے لیے فوراً چلا جاتا۔ ان سے مل کر دہلی میں ان کے قیام و پروگرام کے متعلق باتیں ہوتیں۔ دہلی میں اپنے قیام کے دوران اکثر مقامات پر وہ میرے ساتھ جانا پسند کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ کہیں جانے میں خوشی محسوس ہوتی۔ اس طرح مجھے ان کے قریب آنے اور ان کے متعلق جاننے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو میں نے قریب سے دیکھا، پہچانا، مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ جتنے بڑے دولت مند تاجر تھے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ اپنے نجی ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا شخص زمین سے جڑا ہوا انسان تھا۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ایک روز تقریباً دو بجے وہ میرے ساتھ دہلی یونیورسٹی میں تھے اور مجھے بھوک لگی ہوئی تھی، میں چھولے اور کلچے کھانا چاہتا تھا۔ میں نے اخلاقاً ان سے چھولے اور کلچے کھانے کے لیے کہا اور وہ تیار ہو گئے۔ ہم دونوں نے وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چھولے کلچے کھائے۔ بعد میں سوچتا رہا کہ انہیں چھولے اور کلچے کھلا کر کہیں میں نے ان کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں کی۔ اس لئے دوسرے دن میں نے اس گستاخی کے لیے ان سے معذرت پیش کی تو کہنے لگے "میاں اتنی خلوص، محبت اور معصومیت کے ساتھ کوئی زہر بھی کھلائے تو میں کہیں بھی بیٹھ کر کھا لونگا۔ ان کی خاکساری کی مثالیں اور بھی ہیں۔ مثلاً وہ ہندوستان اکثر جولائی کے مہینہ میں آتے تھے۔ اس مہینہ میں اُمس بھری گرمی اپنے شباب پر رہتی ہے۔ وہ دہلی کے جس علاقہ میں رہتے تھے اس علاقہ میں اگر بارش ہوتی ہے تو وہاں کی تنگ تنگ گلیاں پانی اور کیچڑ سے بھر جاتی ہیں۔ اُوپر سے ٹھیلے والے، رکشا والے، اور کبھی کبھی گدھے اور دوسرے جانور بھی انہیں گلیوں سے گزرتے رہتے ہیں جس سے آنے جانے والے سفید پوش انسانوں کا حلیہ بدل جاتا ہے اور کئی بار انہیں پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی کئی بار

اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن عاشور کاظمی کو ان گلیوں سے گزرنے میں ذرا بھی چہرے پر شکن نہیں آتی تھی۔ میں اکثر یہ سوچتا کہ کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں عاشور کاظمی صاحب کہ لندن کی صاف شفاف اور حسین وادیوں میں رہنے کے عادی ہونے کے باوجود کس طرح ان گندی گلیوں سے گزرتے ہیں۔ انہیں تو دہلی کے کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہئے جہاں کار پارکنگ ہوتی ہے، خوشگوار موڈ میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے لیے ائیر کنڈیشن لانج ہوتی ہے۔ وہاں رہنے میں نہ انہیں کوئی پریشانی ہوتی نہ ان سے ملنے والوں کو آنے جانے میں پرانی دہلی کی گلیوں کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لئے مجھ سے رہا نہیں گیا اور ایک دن میں نے اپنے دل کی بات ان سے کہہ دی۔ وہ کہنے لگے کہ عقیل میاں پرانی دہلی اور یہاں کی گلیوں میں رہنے والوں میں جو اپنا پن، خلوص اور محبت ہے وہ پانچ ستارہ ہوٹل میں کہاں ملے گا۔ دوسری بات یہ کہ پانچ ستارہ ہوٹل میں مجھ سے ملنے کے لیے تم تو آسکتے ہو لیکن پرانی دہلی یا جمنا پار کے علاقے کی گلیوں میں رہنے والے عام انسان جو کسی نہ کسی روپ میں اردو سے جڑے ہوئے ہیں یہاں نہیں آپائیں گے۔ میں تو دراصل ان سے ملنے آتا ہوں جو اردو کے سچے سپاہی ہیں اور سپاہی تو عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ الغرض وہ ایک ایسے انسان تھے جنہیں فرانس اور پیرس کی نئی پرفیوم سے زیادہ ہندو پاک کی مٹی کی خوشبو، بڑے بڑے محلوں اور پانچ ستارہ ہوٹلوں سے زیادہ اپنوں کے گھر پسند تھے۔ تبھی تو ساری دنیا جرمن، فرنچ اور انگلش کی دیوانی ہے لیکن وہ اردو اور اردو والوں کے دیوانے تھے۔ الغرض وہ ایک ایسے انسان تھے جنہیں فرانس اور پیرس کی نئی پرفیوم سے زیادہ ہندو پاک کی مٹی کی خوشبو، بڑے بڑے محلوں اور پانچ ستارہ ہوٹلوں سے زیادہ اپنوں کے گھر پسند تھے۔ تبھی تو ساری دنیا جرمن، فرنچ اور انگلش کی دیوانی ہے لیکن وہ اردو اور اردو والوں کے دیوانے تھے۔

سید عاشور کاظمی مجھے اپنا چھوٹا بھائی مانتے تھے اور بچہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے دماغ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ میں ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی تصنیفات پر اظہار خیال بھی کرسکتا ہوں۔ اس لئے انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش نہیں کی ورنہ زیادہ تر دوسرے ملکوں کے شاعر و ادیب یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ سے مضمون لکھنے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ دہلی آئے ہوئے تھے اور ان ایک کتاب 'اردو مرثیے کا سفر (سولہویں صدی سے بیسویں صدی

تک) اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی رسم اجرا ایک ہفتہ بعد ہونے والی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے فون کیا کہ میں آچکا ہوں ،تم کب آؤ گے؟ میں نے کہا کہ ایک گھنٹہ میں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنی نئی کتاب دی اور کہا کہ اس کی رسم اجرا ایک ہفتہ بعد اردو گھر میں ہوگی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس پر کچھ لکھ کر رسم اجرا کی تقریب میں پڑھ سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں کوشش کروں گا لیکن اس موضوع پر میں نے نہ کبھی کچھ پڑھا ہے اور نہ کبھی کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں تم کوشش کرو اور ایک دو دن پہلے لکھ کر لانا میں دیکھ لونگا۔ پانچویں دن ایک مضمون "سید عاشور کاظمی اور مرثیہ کا تجدیدی سفر" کے عنوان سے لکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا یہ سوچتے ہوئے کہ اتنی جلدی میں لکھا ہے نہ جانے انہیں پسند آیگا یا نہیں۔ وہ مضمون پڑھنے لگے اور میں ان کا چہرا۔ تھوڑی دیر میں ان کے چہرے پر مرتب ہوتے ہوئے تاثرات، آنکھوں میں پیدا ہوتی ہوئی چمک اور ان کے بدن کے لسان کو دیکھ کر میں مطمئن ہوا کہ یہ مضمون نہ صرف انہیں پسند آرہا ہے بلکہ وہ کچھ خود پر اور کچھ مجھ پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ جسے میں صرف چھوٹا بھائی اور بچہ سمجھتا تھا وہ ایک مقالہ نگار نکلا۔ اس دن عاشور کاظمی صاحب نے مجھے دل سے دعائیں دیں اور کئی بار کہا کہ "بھائی مان گیا تم ایک اچھے مقالہ نگار ہو۔" کسی وجہ سے انہیں فوراً لندن واپس جانا پڑا اور اجرا کی تقریب ملتوی ہو گئی۔ اس کتاب کے سلسلے میں میں نے پاکستان کے ایک ادیب سلطان جمیل نسیم (جو صبا اکبرآبادی کے بیٹے بھی ہیں) سے ذکر کیا اور کہا کہ اس میں آپ کے والد کی مرثیہ نگاری پر عاشور کاظمی نے اچھا تبصرہ کیا ہے جسے میں نے اپنے مضمون میں بھی کوٹ کیا ہے تو انہوں نے مضمون پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اس لیے میں نے اسے ای میل کے ذریعہ پاکستان ان کے پاس بھیج دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد انہوں نے اسے شائع کرانے کی اجازت مانگی۔ اس طرح یہ مضمون پاکستان کے ایک رسالہ میں شائع ہوا۔ پاکستان کے ادیبوں نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد عاشور کاظمی کو فون کیا اس مضمون کی تعریف کی۔ اس کے بعد انہوں نے فوراً مجھے فون کیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اس کتاب کی رونمائی دوسرے سال اردو گھر میں ہوئی۔ کئی لوگوں نے اس کتاب پر اظہار خیال کیا اور مقالے بھی پڑھے۔ میرے مقالہ کے متعلق منتظمین کو کوئی جانکاری نہیں تھی اس لیے مجھے نہ مقالہ پڑھنے کے

لئے کہا گیا اور نہ میں خود پڑھنے کی پیش کش کی۔ مقالہ نہیں پڑھنے کا مجھے بھی افسوس تھا اور انہیں بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ آئندہ جب آئیں گے تو ان کی شان میں ایک چھوٹا سا جلسہ اپنے کالج میں کروں گا اور یہ مقالہ وہیں پڑھوں گا لیکن ہندوستان کا وہ سفر ان کا آخری سفر تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کے اس آخری سفر سے پہلے ان کی شان میں ایک پروگرام اپنے کالج میں کر چکا تھا۔

دراصل عاشور کاظمی کو اسکول اور کالج کے اردو پڑھنے والے طالب علموں سے اردو کے سنہرے مستقبل کی بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ اس لیے اسکول اور کالج کے طلبہ سے ملنے کا انہیں بڑا شوق تھا تاکہ انہیں اردو پڑھنے اور سیکھنے کے لئے مائل کیا جاسکے۔ اسی لئے ایک دفعہ جب وہ دہلی تشریف لائے ہوئے تھے تو اپنے کالج کے طلبہ سے ملوانے کے بہانے میں نے اپنے کالج میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا جس کی صدارت ہندی زبان کے بڑے اسکالر ڈاکٹر کرن سنگھ چوہان نے کی تھی۔ اس جلسہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر کوثر مظہری، دیال سنگھ کالج سے ڈاکٹر مولا بخش، اردو آفیسر ڈاکٹر اشفاق عارفی اور راشٹریہ سہارا کی طرف سے ڈاکٹر مشتاق صدف نے ان کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا تھا۔ آخر میں سید عاشور کاظمی نے برطانیہ میں اردو کی صورت حال پر تقریر کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود اردو کی ترقی کے لئے برطانیہ میں کیا کیا کر رہے ہیں۔ آخر میں طلبہ ان سے سوالات پوچھنے لگے اور وہ ان کے سوالوں کے جواب گھنٹوں دیتے رہے۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں طلبہ ان سے اتنے گھل مل گئے کہ کئی سالوں تک انہیں یاد کرتے رہے۔ اس جلسہ میں نجی ٹی وی چینل کے لیے فلمیں اور پروگرام بنانے والی ایجنسی کے ایک سربراہ بھی موجود تھے۔ عاشور کاظمی کی تقریر سے متاثر ہو کر مجھ سے ان کا انٹرویو لینے کے لیے کہا گیا۔ انٹرویو لینے کے لیے ایک ہفتہ تک میں نے ان کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کیا اور ایک سوال نامہ تیار کیا۔ اس کے بعد انہیں اپنے گھر لے کر آیا۔ یہیں کیمرا مین اور لائٹ مین بھی آ گئے تھے۔ کوئی تین گھنٹے تک میں نے ان کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے حالات زندگی، ادب اور زندگی کے متعلق نظریات کے سلسلے میں کافی روشنی ڈالی تھی۔ اس انٹرویو کے بعد میں ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کا مزید قائل ہوا۔ اس انٹرویو سے ملی جانکاری کے مطابق ان کی پیدائش پانی پت کے ایک بستی فرید پور میں 10 فروری 1933ء میں ہوئی تھی۔ اسی دن یوم عاشورہ بھی تھا اس لئے ان کا نام عاشور علی کاظمی رکھا گیا۔ ان کے والد

محترم سید زوار حسین کاظمی اور والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے دوران وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ جہلم، پاکستان ہجرت کر گئے لیکن جلد ہی وہاں سے لاہور چلے گئے۔ جنرل ایوب خان نے جب مارشل لا نافذ کیا تو وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور بینک کا کاروبار شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسٹائل انڈسٹری میں انہوں نے بڑا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن 1976ء میں پاکستان سے برطانیہ چلے گئے جہاں انہوں نے تجارت کا آغاز تو ایک ٹریول ایجنسی سے کیا لیکن جلد ہی ایک کارگو جہاز خرید لیا اور کارگو کے کاروبار کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے اور جلد ہی ان کا شمار بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ خود سرمایہ دار ہونے کے باوجود سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ دراصل ان کا تعلق ایک ایسے خاندان اور ماحول سے تھا جہاں انہوں نے بچپن سے حضرت امام حسینؑ اور ان کے اہل خاندان کی قربانیوں کی داستان سنی تھی جس کا اثر ان کے دل و دماغ پر گہرا تھا۔ اس لیے ظلم و ستم اور آمریت کے خلاف آواز بلند کرنا، احتجاج کرنا اور حق کی بات کرنا، مظلوموں کی حمایت کرنا ان کی فطرت میں شامل تھی۔ اسی جذبے کے تحت حقوق انسانی کی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے اور لندن میں رہ کر ایشیا، افریقہ اور یوروپ جیسے ملکوں میں مظلوموں کی حمایت کرتے رہے۔

اپنی عمر کے کل 34 سال یوروپ میں گزارنے کے بعد بھی ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی محبوب ترین زبان اردو سے محبت کرتے رہے اور یوروپ میں اردو کے علم بلند رکھنے کے لئے اپنا تن من اور دھن لٹاتے رہے۔ 1985ء میں انہوں نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس منعقد کیا جس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں نے حصہ لیا اور سبھی ان کی علمی لیاقت اور تنظیمی صلاحیت سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں اردو کے کانفرنسوں اور سیمناروں میں وہ بلائے جانے لگے جس سے ہر خاص و عام ان کی ادبی صلاحیتوں سے متعارف ہونے لگا۔ زبان و ادب اور ادیبوں سے ان کی بے پناہ محبت کے چرچے چاروں طرف ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ کارگو کے کاروبار کو ترک کر کے خود کو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ برطانیہ میں انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر قائم کیا اور اس ادارہ کے ذریعہ ادیبوں، اردو اداروں اور مختلف ادبی پرچوں کو مالی تعاون دیتے رہے۔ اس کے علاوہ اس

ادارے نے پچاس سے زیادہ کتابوں کی نشرواشاعت کی۔ انہوں نے بھی برطانیہ میں اردو یونیورسٹی کھولنے کی کوشش شروع کردی تھی لیکن وقت اور حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی پوری کی پوری توجہ برطانیہ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کی طرف تھی۔ یہ برطانیہ میں اردو کے فروغ کا بنیادی کام تھا۔ اردو کے بنیادی کاموں اور اردو والوں پر انہوں نے جتنے پیسے وقت صرف کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ایک سچے سپاہی تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ان پیسوں سے ہندوستان اور پاکستان میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں سیمنار کرا سکتے تھے اور ان سیمناروں میں پڑھے گئے مضامین کو ایڈیٹ کر کے شائع کرا سکتے تھے اور سیکڑوں کتابوں کے مصنف بن سکتے تھے لیکن انہوں نے نام نہاد صف اوّل کے دانشوروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کے بجائے اردو کا ایک سپاہی بننا بہتر سمجھا۔

سید عاشور کاظمی جب ہندوستان آتے تھے تو اردو کے نام پر پیسے ایسے لٹاتے ہوئے چلتے تھے جیسے اردو والوں کے لئے کوئی چلتے پھرتے بینک ہوں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک دن میں ان کے ساتھ اُدکھلا کے Objective Centre کے آفس سے واپس اردو گھر آ رہا تھا لیکن راستے میں انہوں نے ایرانی سفارت خانہ کی طرف گاڑی لے چلنے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا ایران کے سفارت خانہ میں انہیں سفیر سے ملنا ہوگا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اسی بہانے ایرانی سفارت خانہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ سفارت خانہ کے دروازہ پر پہنچ کر انہوں نے فون کیا اور ایک نوجوان جو شکل اور لباس سے سیکوریٹی کا آدمی لگ رہا تھا، سکنڈوں میں باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر کھڑے کھڑے پانچ منٹ تک باتیں کیں، اس کے بعد عاشور کاظمی صاحب نے دس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر انہیں دے دیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ان سے میں نے پوچھا کہ وہ کون تھا تو کہنے لگے کہ میں بھی اسے نہیں جانتا ہوں لیکن اس نے مجھے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ سیلم پور کے علاقہ میں کوئی ادارہ چلاتے ہیں جس میں مسلم بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی لئے میں ان سے یہاں ملنے آیا گیا۔ ایسے نہ جانے کتنے ضرورت مندوں کی مدد انہوں نے کی ہوگی۔ ہندوستان کے بڑے اداروں اور معزز شخصیتوں کو بھی انہوں نے ہر طرح سے نوازا تھا۔ ان پر لاکھوں روپے خرچ کیے تھے لیکن ان میں بعض حضرات نے انہیں نقصان پہنچایا تھا لیکن جب بھی ان لوگوں سے ملتے تو

ایسے ملتے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ وہ عاشقانِ اہلِ بیعت میں سے تھے اور وہ حضرت علیؓ کے اس قول سے بخوبی واقف تھے کہ جس کی مدد کرو اس کے شر سے بچو، لیکن وہ ایک شریف النفس انسان تھے اور امام غزالیؒ کے اس قول پر عمل کرتے تھے کہ ''دشمنوں کو معاف کر دینا انتقام لینے کا سب سے بہتر طریقہ ہے''۔ دہلی میں ان کے سچے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی لیکن میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم ان کے بے حد عزیز دوست اور مربی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت انہیں کے ساتھ اردو گھر میں گزرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں دونوں نے ایک دوسرے کو بہت یاد کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پچھلے دنوں خلیق انجم صاحب سے جب بھی میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے عاشور کاظمی صاحب کی خیریت دریافت کی اور ان کے متعلق باتیں کی۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران سید عاشور کاظمی پٹنہ ضرور جاتے تھے۔ وہاں کے ادیبوں سے بھی انہیں محبت تھی۔

سید عاشور کاظمی کی فراخ دلی نے ان کی ادبی شبیہ کو دبا دیا تھا۔ کیوں کہ ہند و پاک کے بیشتر اردو والے انہیں یا تو ATM مشین سمجھتے تھے یا یوروپ کی سیر کرانے والا کسی اساطیری داستان کا اُڑن کھٹولہ۔ اس لیے ان کی تخلیقی و تحقیقی اہمیت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ ویسے بھی بیشتر اردو والوں کی عجیب و غریب سائیکی ہوتی ہے۔ اردو والے انہیں شاعروں اور ادیبوں کو پڑھتے ہیں، واہ واہ کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں جنہوں نے نکموں کی طرح کسی دیوار کے سائے تلے پڑے پڑے زندگی گزار دی ہو یا عشق کے جنون میں محبوب روشنی کی صورت میں آسمان سے زمین کی طرف آتی ہوئی دکھائی دیتی ہو پھر مالی تنگی سے تنگ آ کر روٹی کے بجائے کپڑے چبائے ہوں یا اپنے گھر میں جوتے کھلائے ہوں۔ لیکن آج بھوکے ننگے ادیبوں اور شاعروں کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے زیادہ تر پھٹے حال اور بھکمنچر قسم کے لوگ شاعر و ادیب ہوا کرتے تھے لیکن اب Multimillionaire تاجر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز حضرات بھی اچھے شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات میں بھی دم ہے جنہیں پڑھنے اور ان پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ سید عاشور کاظمی بھی انہیں ادیبوں اور شاعروں میں سے تھے جنہیں خدا نے دولت اور علم سے نوازا تھا۔ انہوں نے اردو ادیبوں کے بھوکے ننگے شبیہ بدل دیا تھا اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ دولت مند اور Elite

Class کے لوگ بھی بڑے شاعر و ادیب ہو سکتے ہیں۔

سید عاشور کاظمی کے تعلیمی سفر پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی لیکن اسکول کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول روہتک (ہندوستان) اور اسلامیہ ہائی اسکول جہلم سے جبکہ بی۔اے کی تعلیم زمیندار کالج گجرات اور ایم اے کی تعلیم اورینٹل کالج لاہور سے حاصل کی۔ بچپن سے انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ گھر کا ماحول بھی مطالعہ کے لئے سازگار تھا۔ اسی لئے انہوں نے بچپن ہی سے تخلیق و تحقیق کا کام شروع کر دیا تھا۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا انہوں نے صرف اردو ادب کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں بلکہ مختلف علوم و فنون سے متعلق بے شمار کتابیں انہیں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے لندن تک زندگی کے سفر میں نہ جانے انہیں کتنے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ زندگی کے ان پُر پیچ راہوں نے بھی انہیں بہت کچھ سکھایا۔ ان سب کا انعکاس ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔

ان کی شعری تخلیقات میں تین کتابیں ہیں جن میں پہلی "حرف حرف جنوں" ان کا حالیہ شائع شدہ مجموعۂ کلام ہے جس میں بہترین غزلیں شامل ہیں۔ دوسری اور تیسری کتاب "چراغ منزل" اور "صراط منزل" ہیں۔ ان میں عقیدت اور محبت کے جذبے سے سرشار حمد، نعت، منقبت اور سلام کے اشعار ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات میں "راہوں کے خم" افسانوں کا مجموعہ ہے جبکہ "سخن گسترانہ" اور "چھیڑ خوباں سے" طنز و مزاح، انشائیے، خاکے اور مضامین کے مجموعے ہیں۔ "فسانہ کہیں جسے" افسانے پر تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے جس میں دو ہزار قبل مسیح سے حال تک یوروپ، جنوبی امریکہ اور روس کے عہد ساز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے حوالے سے افسانے کے عروج و زوال پر بحث اردو افسانے کی دونوں روایتوں کے تناظر میں مغرب میں مقیم اکتالیس افسانہ نگاروں کا تنقیدی تعارف ایک ایک افسانے کی روشنی میں کرایا گیا ہے۔ "مرثیہ نظم کی اصناف میں" جدید مرثیے کی تاریخ پر تحقیقی کتاب ہے جس کا مطالعہ مرثیہ پر کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں میر انیس و دبیر اور مرثیہ پر لکھے جانے والے اکثر مضامین میں انہیں کوٹ کیا جاتا ہے۔ "ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں پچھلے پچاس سالوں میں تخلیق ہونے والے ترقی پسند ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ "بیسویں صدی کے اردو نثر

نگار مغربی دنیا میں"۔ اس کتاب میں مغربی دنیا کے تمام فکشن نگار، مزاح نگار، محقق، ناقد، تاریخ گو، رپورتاژ نگار، صحافت نگار وغیرہ کا تنقیدی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ "بیسویں صدی کے اردو اخبارات ورسائل مغربی دنیا میں" اس کتاب میں مغربی دنیا کے تمام رسائل، جرائد اور اخبارات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ "اس گھر کو آگ لگ گئی" دراصل جدوجہد آزادی کے تناظر میں غداروں کے خطوط پر مشتمل دستاویز ہے۔ "راگ رنگ" میں انہوں نے موسیقی کی تاریخ اور فنی تجزیات، ملفت موسیقی اور اوزان موسیقی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ "نکات فن" اور انگریزی تالیف "committment" اس میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پیش کیے گئے انگریزی زبان میں مقالے اور کچھ اہم اردو مقالوں کا انگریزی میں ترجمے شامل ہیں۔ عاشور کاظمی کی تازہ ترین کتاب پہلی نظر میں مرثیے کی مکمل تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ مرثیے کی مکمل تاریخ سے آگے کی چیز ہے اور اس کا نام "اردو مرثیے کا سفر (سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک) اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار" کے بجائے Encyclopedia of Marsia ہونا چاہئے۔ اس کتاب کو مرثیے کی مکمل تاریخ بھی مان لیا جائے تب بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی کیوں کہ مرثیے کی تاریخ پر اب تک کوئی دوسری ایسی وقیع اور مستند کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت مرثیہ گو شاعرات، غیر مسلم مرثیہ نگار اور مغرب میں آباد اردو مرثیہ گو شعراء کی شمولیت ہے۔ آج سے پہلے مرثیہ گو شاعرات اور مغرب میں موجود مرثیہ گو شاعروں پر اس قدر جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ نہیں لکھا گیا۔ گنے چنے غیر مسلم مرثیہ نگاروں کا ذکر تو کہیں کہیں مل جاتا ہے لیکن غیر مسلم مرثیہ گو شاعروں کا مکمل تجزیہ و تعارف پہلی بار اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی تاریخ مراثی اردو ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب تحقیق و تنقید کے عروج کی مثال بھی ہے۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہندستان اور پاکستان کے یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر دو کتابیں "سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن" اور عاشور کاظمی: دانشور اور محرک" بہار سے شائع ہو چکی ہیں۔ عاشور کاظمی اپنی

بقیہ ص ۲۲۳

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

صاحب اکرام

میں ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج کی ایم اے (فارسی) کلاس میں داخل ہوا تھا۔ ستمبر میں کلاسیں شروع ہوئیں تو ہم جماعتوں میں ایک صاحب اپنے دھیمے لہجے اور مہذب اطوار کے باعث منفرد نظر آئے۔ نام تھا اشتیاق حسن خاں۔ کچھ دن بعد ان سے گفتگو کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ ان کا تعلق ریاست جے پور سے ہے۔ ٹونک اور جے پور کا تعلق گھر آنگن کا سا تھا اس لیے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے ان کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے والد اکرام حسن خاں جے پور میں ناظم (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) کے عہدے پر فائز تھے اور دادا خان بہادر اشفاق حسن خاں ریاست جے پور کے وزیر مال رہے تھے۔ مجھے یہ نام سنا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو یادداشت پر زور دیا تو اشتیاق بولے وہ سر اسرار حسن خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ سن کر تعارف مکمل ہو گیا۔ اسرار حسن خاں سول سروس کا معروف نام تھا وہ ایک عرصے تک ریاست بھوپال کے نصیر المہام (ہوم منسٹر) رہنے کے بعد آخر میں ریاست خیر پور کے وزیر اعظم ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ اس خاندان کا وطن شاہجہاں پور (روہیلکھنڈ) تھا جہاں کئی پشت پہلے ان کے ایک بزرگ جہاں دادا خاں، زمانہ شاہجہاں (۱۶۲۸۔۱۶۵۸) میں سرحد کے علاقہ یوسف زئی سے آ کر بس گئے تھے۔

لاہور میں میری حیثیت مسافر کی سی تھی۔ وولنر ہوسٹل میں قیام تھا۔ حسن (میں اختصار کی غرض سے اشتیاق حسن خاں کو اسی نام سے یاد کروں گا) اپنے والدین کے ساتھ فیروز پور روڈ پر مقیم تھے۔ تعارف کو کچھ دن گزرے تو انہوں نے اپنے جذبہ دوست نوازی (اور شاید مسافر نوازی بھی) کے تحت اپنے گھر چلنے کا تقاضا شروع کیا۔ میں پہلے تو اپنی عادت کے مطابق ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن پھر ان کے پر خلوص اصرار کے آگے سپر انداز ہونا پڑا۔ طے یہ پایا کہ میں اتوار کے دن صبح نو

اور دس بجے کے درمیان ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جاؤں گا۔ مقصد یہ تھا کہ اتوار کو تعطیل کے باعث حسن کے دوسرے بھائی بھی گھر پر موجود ہوں گے اور ان سب سے بھی تعارف ہو جائے گا۔

میں حسب وعدہ فیروز پور روڈ کے ٹھیر والے اسٹاپ پر اترا جو ایف سی کالج اسٹاپ کہلاتا تھا۔ ذرا آگے چل کر بائیں جانب ایک راستہ سڑک سے نیچے اترتا تھا۔ اس پر چند کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر جس کا نمبر ۱۷ تھا الحاج محمد اکرام حسن خاں کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ حسن اور ان کے تین بڑے اور تین چھوٹے بھائیوں سے ملاقات ہوئی ماسوائے سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر افضال حسن خان صاحب کے جو لاہور سے باہر تھے۔ سب بھائیوں کے نام کا دوسرا جزو 'حسن' تھا اور بھی تہذیب و شائستگی سے آراستہ تھے۔ ان 'حسنات' سے دلچسپ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ان کے والد محترم تشریف لے آئے۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ میں انہیں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ وہ کسی انداز سے بھی ریٹائرڈ کمشنر معلوم نہ ہوتے تھے۔ اکہرا جسم، درمیانہ قد، نورانی چہرے پر شرعی ڈاڑھی، چہرے پر زہد و تقویٰ کی علامات، کرتے پاجامے اور ململ کی ٹوپی میں ملبوس، ان کی شخصیت میں وقار اور انکسار کا انوکھا امتزاج تھا۔ اگر آپ نے علی میاں (مولانا سید ابوالحسن ندوی) کو ان کی عمر کے آخری برسوں میں دیکھا ہے یا اس دور کی تصویر دیکھی ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ نے الحاج اکرام حسن خاں کو دیکھ لیا۔ وہ میرے ساتھ نہایت شفقت اور کمال مہربانی سے پیش آئے۔ ٹونک سے پاکستان منتقلی، والد کے انتقال اور میری تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کچھ دیر بعد دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم سب نے کھانے کے کمرے کا رخ کیا جو دوسری منزل پر تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور حسن دیوان خانے میں باتیں کرتے رہے۔ عصر کی چائے پی کر مغرب سے قبل میں واپس ہوسٹل پہنچ گیا۔

میں اکثر اتوار کی چھٹی گاؤں میں گزارتا تھا۔ اگر کسی اتوار کو گاؤں جانا نہ ہوتا تو حسن کے ہاں چلا جاتا۔ وقفہ طویل ہونے کی صورت میں حسن بتاتے کہ 'پاپا' آپ کو یاد کر رہے تھے اور خیریت پوچھ رہے تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں میرا تقرر بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ ہو گیا۔ وہاں سے جب کبھی

سلسلے میں لاہور آنا ہوتا تو میں حسن کے پاس ٹھہرتا اور یوں ان کے والد صاحب کی زیارت اور بھائیوں سے تجدید ملاقات کا موقع مل جاتا۔ اس طرح اس بزرگ شخصیت کے اوصاف حمیدہ مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے بارے میں کبھی کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے لیکن میں اپنی دلچسپی کے باعث ان کے سوانحی حالات اور گزشتہ واقعات کے بارے میں حسن بھائی اور ان کے برادران بالخصوص عزیزی احمد حسن خاں سے دریافت کرتا رہتا تھا۔

اکرام حسن خاں کی ولادت ۱۹ جون ۱۸۹۵ء (۲۵ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ) کو ہوئی۔ ان سے دو سال بعد ان کے برادر خورد سلطان حسان خاں اور پھر دو سال بعد ان کی ہمشیرہ سلطان جہاں بیگم متولد ہوئیں۔ ابھی سات برس کے تھے کہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء کو ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ اس وقت بہن صرف تین سال کی تھیں اس لیے انہیں ان کے ننھیال والوں نے اپنی آغوش شفقت میں لے لیا اور ہمیشہ اپنی کفالت میں رکھا (۴)۔ والد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا قیام اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہتا تھا اس لیے اکرام حسن خاں کی تعلیم مراد آباد، آگرہ، بھرت پور، اور علی گڑھ میں ہوئی۔ علی گڑھ سے انٹر کیا تھا کہ تحریک خلافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ یہ سرگرمی ان کی تعلیم کی تکمیل میں رکاوٹ بنی اور پھر سرکاری ملازمت میں بھی مزاحم ہوئی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء کو پھوپھی زاد سے ان کی شادی انجام پائی۔ شاہجہاں پور میں تجارت کا سلسلہ شروع کیا جو پانچ سال تک جاری رہا لیکن مزاج کاروباری نہ تھا اس لیے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس اثناء میں تین فرزند متولد ہوئے۔ سب سے بڑے افضال حسن خاں کو ان کے نانا نے گود لے لیا کیونکہ وہ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ۱۹۲۲ء میں اکرام حسن خاں جے پور پہنچے جہاں ان کے والد وزارت کے عہدے پر فائز اور نہایت نیک نام تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو ملازمت دلوانے میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن اپنی اصول پسندی کی بنا پر بیٹے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ بالآخر سر گوپی ناتھ (مسٹر پی ڈبلیو ڈی) نے ریاست کی ریجنسی کونسل (۸) کے صدر آئی آر گلینسی (۹) سے کہہ کر محکمہ کسٹم اینڈ ایکسائز میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رکھوا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ریاست کی سول سروس کے لیے منتخب ہوئے۔ ٹریننگ کے لیے مراد آباد بھجوائے گئے اور ۱۹۳۰ء کے آغاز میں بحیثیت ناظم سانبھر پہلا تقرر ہوا۔ اگلے ہی سال ۷ اگست ۱۹۳۱ء کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

سانبھر سے خان صاحب کا تبادلہ بطور ناظم شیخاوائی ہوا جس کا صدر مقام جھنجھنوں تھا۔ یہ جگہ اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ سر پھرے راجپوت سرداروں کے ساتھ ساتھ برعظیم کے متعدد بڑے بڑے صنعت کار مثلاً برلا، ڈالمیا وغیرہ یہیں کے باشندے تھے۔ ایک طرف ٹھاکروں کی مونچھ کا سوال دوسری طرف سیٹھوں کے سرمائے کی ریل پیل۔ کھل کھیلنے والے افسروں کے لیے پسندیدہ جگہ تھی لیکن خان صاحب نے بڑی دیانت داری اور غیر جانب داری سے وقت گزارا اور بہت سی آزمائشوں کے باوجود ثابت قدم رہے۔ تین برس بعد پھر سانبھر تبادلہ ہوا۔ اس مرتبہ یہاں ساڑھے چھ سال تک صحیح معنوں میں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے (۸)۔

فروری ۱۹۴۰ء میں گنگاپور تبادلے کے احکام ملے۔ جس جذباتی انداز میں سانبھر کے عوام و خواص نے انہیں رخصت کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ سرکاری افسر کی مقبولیت کا پتہ اس کے تبادلے یا سبکدوشی کے وقت چلتا ہے ورنہ چڑھتے سورج کی پوجا کے مصداق ملنے آنے والے افسروں کی راہ میں تو سب آنکھیں بچھاتے ہیں۔ سانبھر کے نزدیک پھلیرہ جنکشن سے انہیں (اجمیر سے آگرہ براستہ جے پور جانے والی) ایکسپریس ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ جس کا وقت مغرب کا تھا۔ اتفاق سے رمضان کا مہینہ تھا۔ خان صاحب نے افطار میں زحمت کے خیال سے مسلمانوں کو پھلیرہ پہنچنے سے منع کیا لیکن کون سنتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص کے بغیر وہ اژدحام تھا کہ اسٹیشن میں داخل ہونے کی گنجائش نہ رہی۔

گنگاپور میں تین برس قیام کے بعد مہاراجہ نے بذات خود خان صاحب کا انٹرویو لے کر ان کی ترقی کا حکم صادر کیا چنانچہ ریونیو کمشنر ہو کر جے پور میں تقرر ہوا۔ گنگاپور سے روانگی کا منظر بھی نرالا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے والے جم غفیر کا والہانہ انداز اور خان صاحب کا انکسار قابل دید تھا۔ فرنٹیئر میل کو خاصا لیٹ ہونا پڑا۔ بمشکل پولیس نے دورویہ کھڑے ہو کر ٹرین تک راستہ بنایا۔ سچ ہے ع: جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

موصوف کا آئندہ تبادلہ ۱۹۴۳ء کی آخری سہ ماہی میں محکمہ کسٹم و ایکسائز میں ہوا۔ اس کا سربراہ ایک بااثر شخص تھا جو رشوت کا رسیا بھی تھا اور بدزبان بھی۔ وہ خان صاحب سے 'تعاون' کی توقع رکھتا تھا اور یہاں یہ خانہ ہی خالی تھا۔ چنانچہ ابتدا میں کئی بار تلخ کلامی ہوئی لیکن وہ ان کی بے

غرضی اور اصول پرستی کی بنا پر کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ بالآخر اسے یقین ہو گیا کہ اس شخص سے کوئی ناجائز کام لینا ممکن نہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی کی منزل نصیب ہوئی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ خان صاحب کے دو فرزند افضال حسن خاں اور اقبال حسن خاں آگرہ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آگرہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ دونوں بھائی جے پور آنے کے لیے روانہ ہوئے۔ بھرت پور کے اسٹیشن پر بلوائیوں نے ٹرین پر حملہ کیا۔ بمشکل جانیں بچیں۔ اب آگرہ میں تعلیم جاری رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ دونوں کو لاہور بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ جے پور کے کسی ہندو سیٹھ نے ملتان سے اپنے رشتہ داروں کو لانے کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا تھا۔ یہ دونوں اسی جہاز پر ملتان آئے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور کے پرنسپل کرنل الٰہی بخش تھے۔ آئی یو خاں مرحوم کی اعانت سے مائیگریشن کا مسئلہ حل ہوا۔

ادھر جے پور میں خان صاحب کی ملازمت کو چوبیس سال ہو رہے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے لیے ۲۵ سالہ مدت درکار تھی۔ چنانچہ انہوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں تین ماہ کی رخصت لی اور اہل خانہ کو لے کر لاہور آ گئے۔ جون میں رخصت کے اختتام پر واپس گئے اور پچیس سالہ ملازمت کی تکمیل پر ریٹائرمنٹ کی درخواست کر دی۔ ان کے بلند کردار اور اچھی شہرت کے باعث متعلقہ وزیر نے ان کو بلوا کر ملازمت جاری رکھنے پر اصرار کیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے اور جولائی ۱۹۴۹ء میں سبکدوش ہو کر مستقل طور پر لاہور چلے آئے۔ یہاں آ کر کسی مناسب ملازمت کے لیے درخواست دی لیکن دو سال تک کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ یہ دو برس کا عرصہ خان صاحب کے لیے ایک امتحان تھا صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کا۔ ماشاء اللہ بھرے گھر کا خرچ، آٹھ فرزندوں کی تعلیم کے اخراجات۔ جے پور والی پنشن تو کوئی آٹھ برس بعد جاری ہو سکی۔ متروکہ املاک کے دعاوی کی منظوری اور اس کے عوض اراضی کی الاٹمنٹ کی منزل بھی دور تھی۔ بہر حال انہوں نے یہ کڑا وقت بڑی بردباری سے گزارا۔

ان دنوں سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے۔ خان صاحب نے بغیر کسی سابقہ تعارف کے ان کو خط لکھا۔ انہوں نے ملاقات کا وقت دیا۔ ملازمت کے لیے درخواست دلوائی۔

حافظ عبدالمجید چیف سیکریٹری پنجاب نے انٹرویو لیا اور مئی ۱۹۵۱ء میں ان کا تقرر بطور لینڈ ایکویزیشن کلکٹر ہوا جو ابتدا میں صرف چھ ماہ کے لیے تھا تاہم اس ملازمت کا سلسلہ ساڑھے چھ برس تک جاری رہا۔ ان دنوں بی آر بی نہر کی کھدائی ہو رہی تھی اور اس مصرف میں کام آنے والی اراضی کے معاوضوں کی تعیین اور ادائیگی کا فریضہ خان صاحب کے سپرد تھا۔ انہوں نے یہ کام نہایت احسن طریقے پر مثالی دیانت داری سے انجام دیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت تک ان کے فرزندوں میں سے بعض تعلیم سے فارغ ہو کر برسر روزگار ہو چکے تھے۔ کچھ زرعی اراضی بھی الاٹ ہو چکی تھی۔ اس طرح ان کی مالی پریشانی دور ہو گئی لیکن جلد ہی مکان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فیروز پور روڈ والی کوٹھی انہیں معاوضے میں منتقل ہوئی تھی۔ جب پی سی ایس آئی آر کا ادارہ قائم ہوا تو اس کے لیے نئی تعمیرات کی ضرورت پیش آئی۔ بعض دوسری عمارتوں کے ساتھ خان صاحب کی قیام گاہ بھی اس اسکیم میں آ گئی۔ محکمہ سیٹلمنٹ نے خالی کرنے کا نوٹس دیا تو ان سے متبادل مکان کی درخواست کی گئی لیکن کون سنتا ہے فغان درویش۔ آخر تھک ہار کر ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرنا پڑی۔ وہ زمانہ بھی غنیمت تھا۔ عدالت عالیہ نے سیٹلمنٹ والوں کے لتے لیے تو محکمہ مصالحت پر آمادہ ہوا۔ متبادل کے طور پر ۱۹۶۰ء میں اپر مال کی ایک وسیع و عریض کوٹھی انہیں دی گئی۔ اس میں ۱۹۵۸ء تک ہندوستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر مقیم رہ چکا تھا۔ لاہور میں اس کا دفتر بند ہوا تو اس کوٹھی میں رینجرز ہیڈ کوارٹرز قائم ہو گیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ مکین نہ کرایہ دیتے تھے نہ خالی کرتے تھے۔ مجبوراً پھر عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ خدا خدا کر کے آٹھ نو برس کی مقدمہ بازی کے بعد زبردست کرایہ دار ادائیگی پر رضامند ہوئے۔ اس طویل عرصے کا کرایہ یک مشت وصول ہوا تو اس رقم سے ۱۹۷۰ء میں ماڈل ٹاؤن کے ڈی بلاک میں کوٹھی نمبر ۳۵۔۳۶ خریدی گئی۔ اور یہ خاندان اس میں منتقل ہو گیا۔ کوٹھی کا نام باذوق فرزندوں نے 'بیت الاکرام' تجویز کیا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ تھا۔

میں نے زندگی میں بہت با اخلاق لوگ دیکھے ہیں لیکن خان صاحب موصوف با اخلاق نہیں مجسم اخلاق تھے۔ عزیزوں، دوستوں، واقف کاروں حتیٰ کہ گھر کے ملازموں تک سے اس ملائمت اور شفقت سے گفتگو کرتے تھے کہ بایدو شاید۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے فرزندوں اور ان کے بچوں سے

بھی بڑے احترام سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان کے اس رویے کو دیکھ کر مصرع: جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم، یاد آجاتا تھا۔ زیادہ تعجب یوں ہوتا تھا کہ ان کا خاندان پشتوں سے سول سروس میں تھا اور وہ خود نیز ان کے اعزہ بڑے بڑے انتظامی عہدوں پر متمکن رہے تھے لیکن جس رعونت اور تکبر کا تصور سول سروس سے وابستہ ہے یہاں اس کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو شخص بھی ایک بار کسی تقریب سے انہیں مل لیتا بندہ بے دام ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملنے والوں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے ہاں آنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قاسم رضوی (حیدرآباد۔ دکن) سے لے کر فلمی اداکار نذیر اور نذر رنگ شامل تھے۔ مخیر بھی بہت تھے۔ ضرورت مندوں، بیواؤں اور مساکین کی امداد بڑی خاموشی اور رازداری سے کرتے تھے۔

میں جب بھی جاتا (یہ عموماً عصر کا وقت ہوتا تھا) اور دیوان خانے میں یا باہر چمن میں حسن بھائی وغیرہ سے باتیں کر رہا ہوتا تو خان صاحب، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، ضرور تشریف لاتے تھے۔ چائے آتی تو اس میں شریک ہوتے۔ میں واپسی کے لیے اجازت لیتا تو دیگر حاضرین کے ساتھ خود بھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے جس سے مجھے شرمندگی کا احساس ہوتا۔ وضع داری انہیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی چنانچہ میری پہلی ملاقات سے لے کر ان کے حین حیات تک میرے ساتھ ان کے رویہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

زمانہ ماضی میں مسلمان سلاطین کے اقتدار کی اہم ترین علامات دو تھیں یعنی سکوں پر ان کا نام کندہ ہوتا تھا اور جمعہ وعیدین کے خطبات کے آخر میں ان کا نام لیا جاتا تھا۔ جب تک ترکی میں خلافت کا ادارہ قائم رہا برعظیم کے مسلمان خطبات میں عثمانی خلیفہ کا نام لیتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ سلسلہ ختم ہونے کے بعد اس رسم کو ترک کرنا پڑا۔ اس مقام پر خطبے میں کلام پاک کی یہ آیت رکھ دی گئی: ان اللہ یامرو بالعدل والاحسان وایتائی ذی القربیٰ و ینھا عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (اللہ حکم کرتا ہے انصاف کو اور بھلائی کو اور دینے کو ناتے والے کے اور منع کرتا ہے بے حیائی کو اور نامعقول کام کو اور سرکشی کو، تم کو سمجھاتا ہے، شاید تم یاد رکھو)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بلیغ آیت انسان کے معاشرتی معاملات کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ میں جب غور کرتا ہوں تو اکرام حسن خاں مرحوم کی زندگی اس آیت میں پیش کردہ احکام کی عملی

تغیر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں نقش و منکر یا راہ حق سے سرتابی کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ رشتہ داروں سے سلوک کے معاملے میں ان کا معیار بہت بلند تھا۔ بچپن سے والدہ کی وفات کے بعد ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کے والد کا رویہ خاصا درشت رہا جس کا اعتراف والد نے ۱۹۳۱ء میں اپنی وفات کے موقع پر خود کیا تھا۔ شاید اسی سختی کے ردعمل میں بہن بھائیوں کے مابین ایسی محبت تھی کہ باید و شاید۔ اور بہن بھائی ہی کیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ بحیثیت فرزند، شوہر، داماد، اور باپ غرض ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے۔ والد کی وفات کے بعد سوتیلی والدہ سے نہایت حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کے جملہ مطالبات خندہ پیشانی سے پورے کیے۔ اپنے وسیع و عریض خاندان کے جن گھروں میں کوئی شکر رنجی یا نا چاقی تھی اسے پوری دلچسپی لے کر بطریق احسن دور کیا۔ قریبی اعزہ کے مالی حقوق کی ادائیگی میں بھی ان کا رویہ قابل رشک تھا۔

جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق ہے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اصول عدل سے کسی جگہ اور کسی وقت سر مو انحراف نہیں کیا۔ وہ دوران ملازمت ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے لیکن کسی قسم کی ترغیب و تحریص یا مخالفت و مخاصمت انہیں جادہ اعتدال سے منحرف نہ کر سکی۔ اس قسم کے بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں لیکن یہاں اُن کے بیان کی گنجائش نہیں لہٰذا میں بعض دلچسپ اور سبق آموز حکایات مختصراً عرض کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ ۳۹۔۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے یعنی جے پور کی ملازمت کے آخری سال کا، جب سکھوں کے ہاتھوں مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ گزر چکی تھی۔ ان دنوں بناسپتی گھی کا رواج ہو چلا تھا تاہم اس کے خلاف تعصب موجود تھا۔ چنانچہ ریاست جے پور میں یہ گھی لانے پر سخت پابندی تھی۔ ایک سکھ نوجوان اجمیر شریف سے بناسپتی گھی کے دو کنستر لے کر ٹرین پر سوار ہوا اور جے پور اسٹیشن پر پکڑا گیا۔ اس کا مقدمہ اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا جہاں سے اسے پانچ ہزار روپیہ جرمانہ (یہ ان دنوں بڑی رقم تھی) اور گھی بحق سرکار ضبطی کی سزا ہوئی۔ اس کی اپیل خان صاحب کے پاس آئی۔ جب انہوں نے گھی کا معائنہ کیا تو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ معاملہ بالکل صاف ہے کیوں نہ ہندو اسسٹنٹ کمشنر کا فیصلہ برقرار رکھا جائے۔ فوراً ہی ضمیر نے احتجاج کیا کہ یہ وسوسہ تمہارے تعصب کی دلیل ہے چنانچہ لاحول پڑھی، استغفار کی۔ سکھ کو خصوصی

موقع دے کر عدالت میں بلایا اور اس کا موقف سنا تو یہ انکشاف ہوا کہ دراصل سردار جی اجمیر سے آگرہ جا رہے تھے۔ راستے میں کسی معمولی سی بات پر محکمہ ایکسائز (جے پور) کے کسی اہلکار سے الجھ پڑے۔ اس نے انہیں جے پور اسٹیشن پر اتار لیا اور گھی کا کیس بنا دیا۔ اتفاق سے سکھ کے پاس اس تاریخ کا اجمیر تا آگرہ ریلوے ٹکٹ محفوظ تھا جس نے بڑا کام دیا اور خان صاحب نے اسے باعزت بری کر دیا۔ کچھ دن بعد وہ سکھ اپنے والدین کو ساتھ لے کر خان صاحب کا شکریہ ادا کرنے آیا اور بتایا کہ جب ہمیں پتہ چلا کہ اپیل ایک مسلمان افسر کی عدالت میں دائر ہوئی ہے تو ہم سزا میں تخفیف سے بھی مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن آپ نے انصاف کا حق ادا کر دیا۔

اپنی ذات اور اختیارات کی حد تک اصول عدل کو ملحوظ رکھنے سے آگے ایک اور مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسروں کو بھی انصاف پر آمادہ کیا جائے۔ خان صاحب اس دائرے میں بھی بڑے مستعد تھے۔ اعتدال سے انحراف کرنے والا شخص کتنی ہی بڑی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہوتا وہ متاثرہ شخص کو اس کا حق دلانے میں ساعی ہو جاتے تھے۔ نظامت شہنشاہی میں خان صاحب کے عملے میں ایک ہندو کلرک تھا۔ بڑا محنتی اور دیانت دار۔ ایک دن اتفاقاً اس کے ہاتھ سے عجلت میں ایک مقدمہ کی مسل پر، جو اپیل کے سلسلے میں چیف کورٹ جے پور جا رہی تھی، دوات الٹ گئی اور بعض اہم نکات پڑھنے کے قابل نہ رہے۔ چیف جسٹس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اہل کار نے یہ سیاہی کسی بدنیتی سے جان بوجھ کر گرائی ہے چنانچہ متعلقہ کلرک کو معطل کر دیا گیا۔ خان صاحب کو حقیقت کا علم تھا۔ انہوں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ بطور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وہ خود براہ راست چیف جسٹس کے ماتحت ہیں، اپنی طرف سے اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی مسلسل اور پرزور کوشش کی اور بالآخر اس کلرک کی ملازمت بحال ہونے پر دم لیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سانبھر سے گنگا پور تبادلے کے وقت پھلیرہ جنکشن پر ہزاروں کا مجمع خان صاحب کو الوداع کہنے کی غرض سے موجود تھا۔ اس موقع پر بڑے جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے۔ سانبھر کے ایک معزز ہندو وکیل جن کا نام جیون بخش تھا بار بار ان کے پاؤں پر سر رکھنے کی کوشش کرتے اور خان صاحب ہر بار پیچھے ہٹ جاتے۔ وکیل صاحب دیوانہ وار پکارتے "میں تو یہیں رکھوں گا! میں تو یہیں سر رکھوں گا"۔ جب گاڑی چلی تو اہل خانہ نے استفسار کیا کہ ان صاحب

کو کیا ہو گیا تھا۔ اس پر خان صاحب نے مختصر اً صراحت کی۔ قصہ یہ تھا کہ وکیل صاحب کا ایک بھائی چیف کورٹ بے پور میں ملازم تھا۔ ایک بار چھٹی لے کر سانجر آیا اور پھر جعلی میڈیکل سرٹیفکٹ کے ساتھ چھٹی میں اضافے کی درخواست بھجوا دی۔ چیف جسٹس ستیلا پرشاد باجپائی نہایت ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سخت گیر بھی تھا۔ اس نے تحقیق کی تو اصل صورت حال کا علم ہو گیا۔ اس پر نہ صرف اصل ملزم کو معطل کیا گیا بلکہ ساتھ ہی اس کے بڑے بھائی کی وکالت کا لائسنس بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اس پر خان صاحب خاموش نہ رہ سکے اور بطور ناظم سانجر چیف جسٹس کو لکھا کہ اس معاملے میں سارا قصور آپ کے اہل کار کا ہے۔ اس کا بھائی بالکل بے قصور ہے اس کو ناکردہ گناہ کی سزا دینا مناسب نہیں۔ بعد ازاں یاد دہانی کی نیم سرکاری چٹھیاں روانہ کرتے رہے۔ اتفاق سے کچھ عرصے بعد جسٹس باجپائی کو سر کا خطاب ملا۔ موقع مناسب جان کر خان صاحب کو اسے مبارکباد کا خط لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ 'کتنا اچھا ہو اگر آپ اس خوشی کے موقع پر جیون بخش کی وکالت کا لائسنس بحال کر دیں'۔ چنانچہ پتھر میں جونک لگی اور وکیل صاحب کا لائسنس بحال ہو گیا۔ لطف یہ ہے کہ وکیل موصوف کو اپنے اس بہی خواہ کی مساعی کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو خان صاحب کے تبادلے کے موقع پر وکیل صاحب نے ہیڈ کلرک کے پاس ان چٹھیوں کی نقول کی فائل دیکھ لی اور اس کے نتیجے میں ریلوے اسٹیشن پر عقیدت کا یہ والہانہ مظاہرہ ہوا۔

انصاف کی طرح احسان کے معاملے میں بھی خان صاحب بڑے اونچے مقام پر فائز تھے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا جذبہ احسان بھی اپنی حدود پار کر کے ایثار کے دائرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ جب لینڈ ایکوزیشن کلکٹر مقرر ہوئے تو پورا لاہور ڈویژن ان کے حیطہ اختیار میں تھا۔ دفتر پہلے سے گوجرانوالہ میں تھا۔ چنانچہ پیر کی صبح لاہور سے گوجرانوالہ جاتے اور سنیچر کی شام کو واپس لاہور آ جاتے۔ دو سال کی آمد و رفت کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دینے کی ٹھانی۔ درخواست لکھ کر افسر اعلیٰ سے ملے تو اس نے کہا کہ آپ مستعفی ہونے کی بجائے اپنا دفتر لاہور کیوں نہیں لے آتے جب کہ آپ کو اس کا پورا استحقاق ہے۔ خان صاحب مان گئے اور نئی درخواست تیار کی۔ ان کے دفتر کا عملہ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ ان لوگوں کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو ان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ان میں سے کسی نے اس کیفیت کی اطلاع خان صاحب کو کر دی۔ انہوں نے اپنے عملے

کی زحمت کی پیش نظر اپنی درخواست چاک کر دی اور بدستور گوجرانوالہ میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

خود میرے ساتھ انہوں نے احسان وایثار کا سلوک مرعی رکھا۔ ہوا یہ کہ دادا جان نے ٹونک میں دریائے بناس کے کنارے کچھ زرعی اراضی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں خریدی تھی۔ اس کا کلیم تو منظور ہو گیا تھا لیکن وہ ایک عرصے تک یونہی پڑا رہا اور میں نے کچھ تو اپنی تعلیمی مصروفیات اور کچھ لڑکپن کی بے نیازی کے باعث اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب ایوب خاں کا دور آیا اور اعلان ہوا کہ جن لوگوں کی زرعی اراضی کے دعاوی باقی ہیں وہ ان پر اراضی الاٹ کروالیں کیونکہ کچھ عرصے بعد محکمہ آبادکاری توڑ دیا جائے گا تو میرے ایک مہربان نے اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان کی کوششوں اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروزوالہ کے موضع چک نمبر ۱۰ میں یہ اراضی الاٹ ہو گئی۔ پٹواری حضرات بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ موضع مذکور کے پٹواری نے یہ حرکت کی کہ منتشر اور بنجر قطعات تو میرے نام الاٹ کر دیئے اور بیچ میں زرخیز اراضی کے ٹکڑے بدستور متروکہ حیثیت میں رہنے دیئے کہ وہ یہ قطعات مقامی بے زمین کسانوں کو کاشت کی غرض سے دے کر اور ان سے فصل پر بٹائی لے کر ہضم کر لیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ پریشانی یہ تھی کہ اگر کسی وقت یہ باقی ماندہ خسرہ نمبر کسی جھگڑالو شخص کو الاٹ ہو گئے تو آئے دن نہری پانی اور حد بندی کے جھگڑوں کا سامنا ہو گا۔ میرے انہی مہربان نے مشورہ دیا کہ اس کا ایک ہی حل ہے کہ کہیں سے زرعی اراضی کے یونٹ خرید کر یہ قطعات بھی حاصل کر لیے جائیں۔ اس میں ایک قباحت تھی۔ جعل سازوں نے متعلقہ محکمے کے اہل کاروں کی ملی بھگت سے بہت بڑی تعداد میں جعلی یونٹ تیار کر لیے تھے جو نہایت سستے داموں مل جاتے تھے۔ بالخصوص غیر طے شدہ علاقوں کے یونٹ تو پانچ روپے فی یونٹ تک گر گئے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان یونٹوں کو خریدنے اور ان پر زمین حاصل کرنے والے لوگ محکمہ مال کے کارندوں کے لیے دودھ دینے والی گائے بن کر رہ جاتے تھے اور یہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔

ایک دن حسن بھائی سے ملاقات پر میں نے انہیں اپنی مشکل بتائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے والد ماجد سے بات کریں اور کسی بااعتبار شخص کے کلیم سے مجھے کچھ یونٹ دلوا دیں۔ کچھ

دن بعد دوبارہ ملنے پر انہوں نے بتایا کہ آپ کو جتنے یونٹ درکار ہیں مل جائیں گے اور قیمت بھی جو آپ مناسب سمجھیں دے دیں۔ میں نے کہا ایک ہزار یونٹ کافی ہوں گے اور اپنی تسلی کے لیے بار بار پوچھتا رہا کہ یونٹ ہیں تو اصلی نا؟ حسن ہر بار کہتے کہ آپ مطمئن رہیے۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی ضرورت مند فروخت کر رہا ہوگا، نیز اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے کم سے کم قیمت لگائی اور کہا کہ میں پانچ روپے فی یونٹ کے حساب سے پانچ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ حسن نے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی دو ہفتے بعد برادرم احمد حسن خاں (ایڈووکیٹ) نے ایک ہزار یونٹ کی موضع چک نمبر ۱۰ میں منتقلی کا سرٹیفکیٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے گھر پہنچ کر اسے اطمینان سے دیکھا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ یہ یونٹ کسی اور کے نہیں خود خان صاحب کے سب سے بڑے فرزند ڈاکٹر افضال حسن خاں کے تھے۔ تعجب کے ساتھ ساتھ مجھے شرمندگی ہوئی اس کا احساس آج بھی میرے دل میں باقی ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو میرا حسن بھائی سے بار بار پوچھنا کہ یونٹ اصلی تو ہیں نا؟ اور دوسرے کم سے کم قیمت لگانا۔ چنانچہ اس کے بعد جب حسن بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے دبی زبان سے شکوہ کیا کہ آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟ تب انہوں نے کہا کہ 'جب میں نے آپ کا مسئلہ والد صاحب کے گوش گزار کیا تو وہ فرمانے لگے کہ آج کل یونٹوں کا معاملہ بڑا مشکوک ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اپنے ہی یونٹوں میں سے شیرانی صاحب کو مطلوبہ یونٹ دے دیے جائیں۔ اتفاق سے افضال بی کو ننھیال سے (متبنیٰ ہونے کے سبب) جو زرعی اراضی ورثہ میں ملی تھی اس کی جزوی الاٹمنٹ تحصیل فیروز والہ ہی میں ہوئی تھی اور بہت سے یونٹ ابھی باقی تھے۔ اس میں ایک سہولت یہ تھی کہ آپ کا گاؤں بھی اسی تحصیل میں واقع ہے اس لیے منتقلی میں دقت بھی نہیں ہوئی اور وقت بھی کم لگا۔ والد صاحب نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ فی الحال شیرانی صاحب کو یہ بات نہ بتائی جائے۔

لیکن یہ قصہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ کچھ عرصے بعد ایک مارشل لا ریگولیشن کا اجراء ہوا جس کی رو سے غیر طے شدہ علاقے کے مہاجرین کے لیے حکم صادر کیا گیا کہ وہ اپنے زرعی اراضی کے یونٹوں کی ایک مقررہ حد سے زیادہ تعداد پر حکومت پاکستان کو دس روپے فی یونٹ جرمانہ ادا کریں بصورت دیگر ان کے زائد یونٹ ضبط کر لیے جائیں گے۔ میں مظفر گڑھ میں تھا اس لیے اس ایوب خانی حکم

سے لاعلم رہا۔ کئی ماہ بعد شیخوپورہ کا چکر لگا تو اس بارے میں پتہ چلا۔ میری آبائی اراضی تو اتنی تھی ہی نہیں کہ اس حکم کی زد میں آتی۔ البتہ خان صاحب کے عطا کردہ یونٹوں پر دس ہزار روپیہ حکومت کو ادا کرنا تھا۔ غالباً ادائیگی کی مقررہ تاریخ بھی گزر چکی تھی۔ میں گھبرا کر لاہور پہنچا اور احمد حسن خاں صاحب سے ملا۔ وہ میری پریشانی دیکھ کر حسب عادت مسکرائے اور بولے "آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟" پاپا کی ہدایت پر افضال بھائی کی طرف سے اس ضمن میں جمع کرائے جانے والے گوشوارے میں لکھ دیا گیا تھا کہ مقررہ حد کے اندر والے یونٹوں میں ہمیں سب سے پہلے وہ ایک ہزار یونٹ رکھنے ہیں جو چک نمبر ۱۰ منتقل کیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کرم فرمائی کی زد میں ان کی اپنی اراضی پڑتی تھی یعنی جو یونٹ انہوں نے مجھے صرف پانچ ہزار روپے میں عنایت کیے تھے ان پر انہیں حکومت کو دس ہزار روپے ادا کرنے پڑے۔ یقینی امر ہے کہ اگر میں اس سلسلے میں خود جا کر احمد حسن خاں صاحب سے دریافت نہ کرتا تو اس کرم بالائے کرم کا مجھے کبھی علم ہی نہ ہوتا اس خودغرضی اور زر پرستی کے زمانے میں ایسی مثالیں کہاں ملتی ہیں۔

خان صاحب کی غریب پروری بھی قابل داد تھی۔ گھر میں کئی ملازم تھے جو مع اہل و عیال سرونٹ کوارٹرز میں مقیم رہتے۔ جو ایک بار ملازم ہو گیا پھر اسے جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں وہ خود کسی مجبوری سے جانا چاہے تو اور بات ہے۔ ان میں سے بیشتر فارغ ہی رہتے تھے۔ بعض بعض نے تو اس فراغت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے موٹے کام بھی شروع کر دیے تھے۔ دو ایک کو میں نے خود ماڈل ٹاؤن میں سبزی پھل وغیرہ بیچتے دیکھا۔ میں سمجھا شاید نوکری سے جواب مل گیا ہے۔ لیکن حسن بھائی سے ذکر کیا تو پتہ چلا کہ یہ سب خان صاحب کے علم میں ہے اور ان کی اجازت سے ہو رہا ہے۔ اپنی وفات سے تقریباً ایک سال قبل جب انہوں نے اپنا اثاثہ ورثا میں تقسیم کیا تو اس موقع پر بیواؤں وغیرہ کے وظائف کے ساتھ اپنے پرانے خدمت گاروں کو بھی فراموش نہیں کیا۔

خان صاحب کو مولانا رسول خاں سے خاص انس تھا۔ معمول کی نمازیں قریبی مساجد میں اور جمعہ کی نماز التزام کے ساتھ جامعہ اشرفیہ (فیروز پور روڈ) میں مولانا کی اقتدا میں ادا کرتے۔ یہ سلسلہ مولانا کی وفات کے بعد بھی جاری رہا لیکن وہ باقاعدگی نہ رہی۔ رمضان میں تراویح کی

نماز ایک حافظ صاحب کی امامت میں کوٹھی کے وسیع لان میں ادا کرتے تھے۔ اہل خانہ، ملازمین، اور مہمانوں سے خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ بعد میں جب ان کے پوتوں میں سے بعض نے کلام پاک حفظ کر لیا تو وہ بھی وہیں اسے تازہ کرنے لگے۔ خان صاحب، صاحب نسبت تھے اور ایک عرصہ قبل بدایوں کے ایک نقشبندی بزرگ مولانا اعجاز احمد سے بیعت ہو چکے تھے سلسلے کی مناسبت سے لاہور میں ایک بار مولانا رسول خاں سے تجدید بیعت کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے جواب دیا کہ 'اس کی ضرورت نہیں' آپ تلاوت ہی پر توجہ مرکوز رکھیں'۔ ایک عرصے بعد کا ذکر ہے کہ احمد حسن خاں صاحب نے کسی صاحب بصیرت شخصیت سے پوچھا کہ 'لاہور میں کسی ایسے شخص کا پتہ بتایئے جن کی صحبت میں اطمینان قلب حاصل ہو سکے'۔ انہوں نے جواب میں کہا 'ہاں! ایک صاحب ہیں جو پیرانہ سالی اور عوارض کے باعث گھر سے نہیں نکلتے'۔ لیکن نام نہیں بتایا۔ اگلی ملاقات پر احمد حسن خاں صاحب نے ان سے نام دریافت کیا تو وہ بزرگ مسکرائے اور بولے 'میاں! ہر روز اور ہر وقت تو ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہو اور نام پتہ مجھ سے پوچھ رہے ہو'۔ اتفاق سے خان صاحب نے اپنی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل جمعہ کے دن (۱۶ ستمبر ۱۹۹۴ء) احمد حسن خاں سے مخاطب ہو کر کہا 'افسوس اب کوئی بزرگ نظر نہیں آتا۔ سب اللہ کو پیارے ہو گئے'۔ اس پر احمد نے ان صاحب سے اپنی محولہ بالا گفتگو کا ذکر کیا تو ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے باصرار فرمایا کہ 'ایسی بات مت کیا کرو' اور پھر آئندہ جمعہ کے روز واصل بحق ہو گئے:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
صحبت از پس پردہ گفتگوی من وتو
چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

خان صاحب کے قریبی اعزہ سب ہندوستان کے مختلف شہروں میں تھے۔ مجھ پر وفور شفقت کے سبب کیونکہ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے اس لیے ہندوستان سے جب کوئی عزیز ملنے آتا تو بڑی محبت سے میرا تعارف کراتے۔ ۱۹۸۱ء میں ان کے ہم زلف ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل ملنے آئے اور کئی ماہ ان کے پاس مقیم رہے۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے بطور صدر شعبہ اردو و فارسی ریٹائر

ہوئے تھے۔کیا خوش وضع، جامہ زیب اور نستعلیق آدمی تھے۔ میں ان سے مل کر بڑا متاثر ہوا۔

اللہ کے مقبول بندوں کی آزمائش بھی بہت ہوتی ہیں۔خان صاحب کی بھی ہوئیں۔ان کا آغاز ان کے سب سے چھوٹے فرزند امداد حسن خاں کی وفات سے ہوا۔مرحوم نے انگلستان سے آٹوموبائل انجینئرنگ کا کورس کیا تھا اور 'کارساز' کے نام سے فیروز پور روڈ پر ایک جدید موٹر ورکشاپ قائم کی تھی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو عین عالم جوانی میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے بوڑھے والدین کو داغ مفارقت دیا۔

ایں ماتم سخت است کہ فرزند جواں مرد

خان صاحب نے بڑے حوصلہ کا مظاہرہ کیا لیکن دل کا کام تمام ہوگیا۔اس واقعہ کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ۹ جنوری ۱۹۸۰ء کو میرا چھوٹا بھائی عزیزی تاثیر محمود بھی اسی طرح آناً فاناً حرکت قلب بند ہونے سے چل بسا تو خان صاحب نے اس موقع پر مجھے اپنے ہاتھ سے جو تعزیت نامہ لکھا وہ میں یہاں درج کرتا ہوں:

"عزیزی شیرانی صاحب۔السلام علیکم

عزیزی اشتیاق حسن سلمہ نے آپ کا خط دکھلایا جس سے جانکاہ حادثہ کا علم ہو کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔امداد کی دائمی جدائی سے دل دکھا ہوا ہے اس لیے اس واقعہ کا خاص طور پر دل پر اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور جملہ پسماندگان کو صبر کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام سے مستفیض فرمائے۔آپ کو جس قدر بھی صدمہ ہو کم ہے مگر بجز صبر چارہ نہیں۔میں خود حاضر ہوتا مگر میں اب تقریباً معذور ہو گیا ہوں۔کہیں جانے آنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔میں آپ کے اس غم میں شریک ہوں۔

والسلام خیر طلب محمد اکرام حسن عفی عنہ"

۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو خان صاحب کے سب سے بڑے فرزند ڈاکٹر افضال حسن خاں بھی چل بسے۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل نے لکھنؤ میں وفات پائی۔ ۵ جنوری ۱۹۸۳ء کو خان صاحب کی اہلیہ محترمہ دو بیٹوں کا داغ دل پر لیے رخصت ہوئیں۔خان صاحب نے کمال تسلیم و رضا سے کام لیا اور اپنے معمولات اور رویوں میں کوئی فرق نہ آنے دیا لیکن پے در پے صدموں

سے نڈھال ہو چکے تھے۔ اسی سال ۱۳ اکتوبر کو جب ان کے برادر حقیقی سلطان حسن خاں (ریٹائرڈ ایڈیشنل کمشنر) نے علی گڑھ میں وفات پائی اور صرف ایک ہفتے بعد ان کی اہلیہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں تو ان سے یہ امور مخفی رکھے گئے لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

رہ چمن نتوان بست تا صبا انجا ست

چند روز بعد فرمانے لگے "میں نے خواب میں دیکھا کہ مسجد سے سلطان حسن کے انتقال کا اعلان ہو رہا ہے"۔ سب نے تردید کی اور کہا کہ ان کی بینائی بہت کم ہو گئی ہے اس لیے خط نہیں لکھ سکتے۔ پھر کسی صاحب نے کہہ کر علی گڑھ سے ایک مجہول خط لکھوایا کہ 'بینائی خراب ہونے کے باعث میں خود لکھ نہیں سکتا اس لیے ایک عزیز سے یہ مکتوب لکھوا کر روانہ کر رہا ہوں'۔ غرض ان کی اپنی وفات تک یہ حقیقت ان پر افشا نہ کی گئی۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو خان صاحب کے صاحبزادے انعام حسن خاں (خان میڈیکوز، بیڈن روڈ، لاہور) کے نوجوان بیٹے مع اپنے کم سن بچے کے سڑک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان تازہ صدمات سے خان صاحب بالکل ٹوٹ کر رہ گئے اور صاحب فراش ہو گئے۔ بظاہر کوئی بیماری نہ تھی لیکن نقاہت بہت بڑھ چکی تھی۔ بایں ہمہ انہوں نے اپنے اخلاق عالیہ میں آخر دم تک سر مو فرق نہ آنے دیا۔ اس کی ایک اعلیٰ مثال میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

خان صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ قبل برادرم احمد حسن خاں اپنے والد کے کمرے میں ان کی بڑی مسہری کے قریب سوتے تھے کہ رات کو کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔ ملحقہ غسل خانہ احمد بھائی کی جانب تھا۔ ایک شام انہوں نے عرض کیا کہ آپ غسل خانے کی سمت سویا کیجئے تا کہ عند الحاجت کم فاصلہ طے کرنا پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ رات کو جب خان صاحب کی آنکھ کھلی تو ان کے ذہن میں نہیں آ رہا کہ آج دوسری طرف سوئے ہیں۔ لہٰذا معمول کے مطابق جب سابقہ سمت سے اترنا چاہا تو احمد بھائی پر ہاتھ پڑا جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے صورت حال سمجھ کر عرض کی کہ 'ابا! غسل خانہ آپ ہی کی طرف ہے، ادھر سے اترنا سہل ہوگا'۔ اس پر بیٹے سے معذرت کرتے ہوئے یہ فقرہ دوبارہ کہا 'معاف کیجئے گا، آپ کو زحمت ہوئی'۔

مرض الموت کا آغاز وفات سے چند روز قبل ہوا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ

آٹھ بجے کے قریب فالج کا حملہ ہوا۔ اسلام حسن خاں (ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائریکٹر انڈسٹریز) اور احمد حسن خاں ان کے پاس تھے۔ اطلاع ملتے ہی دونوں ڈاکٹر بیٹے اقبال حسن خاں اور ارشاد حسن خاں اپنے اپنے مطب چھوڑ کر پہنچ گئے۔ اتفاق ہسپتال لے جایا گیا۔ تین روز انتہائی نگہداشت کے کمرے میں بے ہوشی کے عالم میں رہے اور پھر ہوش آنے پر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ تین روز اس حالت میں گزرے کہ ہوش و حواس قائم تھے لیکن گفتگو کے قابل نہ تھے۔ بالآخر جمعہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء (۱۷ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ) کو قبل از نماز جمعہ تقریباً ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ کی عمر نناوے سال تین ماہ اور چار دن تھی البتہ سنہ ہجری کے اعتبار سے وہ ایک سو ایک برس سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ اسی روز عصر و مغرب کے درمیان انہیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد لحد کر دیا گیا اور یوں بہت سے لوگ ایک مجسم الاحسان شخصیت کی فیض رسانی اور خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔

اخلاق میں بے مثل تھے الطاف میں یکتا
تھا جن کا کرم عام، وہ اکرام حسن خاں
یاد ان کی فراموش نہ ہوگی مرے دل سے
'وہ صاحب اکرام، وہ اکرام حسن خاں'

۱۴۱۵ھ

حواشی:

۱۔ ریاست جے پور راجپوتانہ کے قلب میں واقع تھی۔ آزادی کے بعد جب ریاستیں ختم کر کے راجستھان کا قیام عمل میں آیا تو یہی شہر صوبے کا دارالحکومت بنایا گیا۔

۲۔ اشفاق حسن خاں اپنی سابقہ سروس سے سبکدوش ہو کر ۱۹۲۳ء میں جے پور آئے تھے۔

۳۔ دیوان سنگھ مفتون نے اپنی کتاب 'ناقابل فراموش' میں اسرار حسن خاں کی وضعداری کو سراہا ہے۔

۴۔ آگے چل کر ان کی شادی خان بہادر خادم حسین خاں سے ہوئی جو شاہجہانپور کے رئیس اعظم تھے۔

۵۔ مہاراجہ مان سنگھ ثانی (۷۰۔۱۹۲۲ء) کے نابالغ ہونے کی وجہ سے ریاست کے انتظام کی خاطر یہ کونسل قائم کی گئی تھی۔

۶۔ سر آرتھر ایڈورڈ رابرٹ گلینسی آئی سی ایس۔

۷۔ سانبھر نہایت قدیم شہر ہے اور برّاعظم میں سب سے بڑی نمک کی جھیل کے باعث معروف ہے۔

۸۔ محمد شاہی دور میں سانبھر کے فوجدار کالے خاں کی ہجو میں مرزا احمد یار نامی ایک غیر معروف شاعر نے اس وقت رائج اردو زبان میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس پر راقم کا مضمون رسالہ 'مخزن' (لاہور۔ شمارہ) میں چھپا ہے۔

۹۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ترقی اور تبادلے سے کئی ماہ قبل ایک ہندو جیوتشی نے خان صاحب کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ آپ ملازمت میں ترقی پا کر ۱۱ فروری ۱۹۴۳ء کو گنگا پور چھوڑیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۱۰۔ کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش (۱۹۰۳-۶۰ء) قائداعظم کے معالج جنہوں نے 'قائداعظم کے آخری ایام' نامی کتاب لکھی ہے۔

۱۱۔ عنایت اللہ خاں آئی سی ایس پاکستان میں مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۵۸ء میں ستارہ پاکستان ملا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر ۲ اگست ۱۹۴۹ء سے ۲۶ نومبر ۱۹۵۱ء تک پنجاب کے گورنر رہے تھے۔

۱۲۔ اس کوٹھی میں سردار سکندر حیات، وزیراعظم پنجاب نے ایک عرصے تک قیام کیا تھا۔

۱۳۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں نذیر اور ان کی بیوی سورن لتا، لاہور میں بننے والی فلموں میں مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔

۱۵۔ اس زمانے کے معروف مزاحیہ اداکار۔

۱۶۔ سورۃ النحل، آیت ۹۰۔

۱۷۔ سر گرجا شنکر باجپائی جو ۱۹۳۵ء میں وائسرائے ہند کی کونسل کا رکن ہوا، اسی ستیلا پرشاد باجپائی کا بیٹا تھا۔

۱۸۔ طے شدہ اور غیر طے شدہ علاقوں کی تقسیم کے ذریعہ مہاجرین کو دو خانوں میں بانٹا گیا تھا۔ طے شدہ علاقوں میں مشرقی پنجاب، دہلی اور الور و بھرت پور کی ریاستیں تھیں۔ باقی ماندہ بھارت کو غیر طے شدہ قرار دیا گیا تھا۔

۱۹۔ مولانا رسول خاں تندھار (ضلع ہزارہ) کے رہنے والے تھے۔ انہیں ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے اورینٹل کالج کے شعبہ عربی میں لایا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر جامعہ اشرفیہ (لاہور) میں شیخ التفسیر ہو گئے تھے۔ صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ اہل دل بھی تھے اور سلسلہ نقشبندیہ میں صاحب اجازت بھی۔ خاصی طویل عمر پا کر ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو موضع اچھریاں (نزد بفہ ضلع ہزارہ) میں وفات پائی۔ 'رفعنا لک ذکرک' سے سال رحلت ۱۳۹۱ھ نکلتا ہے۔ ان کے شاگردوں میں پاکستان کے مشاہیر علما شامل ہیں۔ اور مریدوں میں بھی بڑے نامور اشخاص داخل ہیں۔

۲۰۔ یہ نام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا تجویز کردہ تھا۔

پروفیسر خادم علی ہاشمی (ملتان)

آہ! پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

موت العالم موت العالم

میری جب عاصی صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ ریٹائر ہونے کے قریب تھے۔ ملت کالج میں پرنسپل تھے۔ میں نے انہیں اپنے سے بھاری ویسپا اسکوٹر چلا کر ہر محفل میں ہر مشاعرے میں پہنچتے دیکھا۔ دراز قد، دبلا پتلا جسم، چہرے پر مسکراہٹ اور متانت کا دلآ ویز امتزاج، خوش گفتار، خوش مزاج، خوش کردار، یہ تھے عاصی کرنالی! پہلی ملاقات میں بھی ایسے ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ محمد شریف نام، عاصی تخلص، وطن کی نسبت سے کرنالی کہلاتے۔ اکثر مشاعروں میں میاں بیوی دونوں کو شعر پڑھتے دیکھ کر اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی جوڑی یاد آ جاتی کہ دونوں چوٹی کے افسانہ نگار تھے۔ یہی حال عاصی صاحب اور ثریا نوہاشمی کا تھا کہ دونوں قادرالکلام شاعر ہیں!

عاصی صاحب فقط ایک شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک دبستان تھے۔ نظم، نثر، غزل، رباعی، قصیدہ، سلام، مرثیہ، ہر صنف سخن میں مہارت کے انداز سے سامنے آتے۔ میں ایک شاعر دوست پر مضمون لکھ رہا تھا، ان دوست کا جو کلام میرے پاس تھا، اس میں کچھ شعری خامیاں نظر آ گئیں، عاصی صاحب کے پاس اپنی مشکل لے کر پہنچا، انہوں نے بلا تکلف پورے مضمون کو پڑھا، اس میں زبان و بیان کی خامیوں کی جانب نشان دہی کی، اور ان کے کلام کو بھی معنوی اور شعری لحاظ سے موزوں کر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ میرے پاس چھوڑ جاؤ بعد میں دیکھ لوں گا، یا ابھی میری کچھ مصروفیت ہے!

میرے نزدیک عاصی صاحب اس عہد کے بہت بڑے نعت گو تھے اور نعت گوئی کے فن پر اتھارٹی بھی تھے۔ انہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد فن نعت گوئی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ مرتب کیا جو علمیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جس عمر میں لوگ کام کرنے سے جان چھڑاتے ہیں اس عمر میں

انہوں نے تحقیق کی پر خار وادی میں قدم رکھا اور بحمد اللہ سرخ رو ہوئے۔ وہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تھے بلکہ بہت عمدہ نثر نگار اور محقق بھی تھے۔

ہر طبقہ فکر، ہر سطح کے لوگ ان سے محبت کرتے۔ عیسائی مشنری ادارے میں ملازمت شروع کی تو وہاں کا مسلمان اور غیر مسلم طبقہ آپ کا برابر کا گرویدہ تھا۔ گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں جب سے میری ان سے ملاقات ہے، ہر کسی سے ان کی تعریف ہی سنی، حالانکہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بے مثال شیریں گفتار تھے۔

عاصی صاحب کے ایک شاگرد کے مطابق: "محترم جناب عاصی کرنالی مرحوم ہماری کلاس میں اردو کے استاد تھے۔ جب ان کا پیریڈ ہوتا تو مڈل سٹینڈرڈ کی تمام کلاسوں کے طالب علم اسکول کے باہر گراؤنڈ میں بیٹھ جاتے اور ان کے درس کو انتہائی انہماک سے ذہن نشین کرتے۔ وہ انتہائی دھیمے، دلنشین، خوبصورت اور دل پذیر انداز میں درس دیتے..... آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہمیشہ دلوں میں تابندہ رہیں گی۔ وہ ایک عظیم شخصیت تھے۔ بحیثیت استاد بھی ان کا عظیم نام تھا۔ اپنے پیشے سے انتہائی مخلص تھے"۔ میں نے انہیں پڑھاتے ہوئے تو نہیں دیکھا لیکن جس انداز میں وہ عام گفتگو کرتے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی کامیاب معلم تھے۔

عاصی صاحب شاعروں میں شاعر، ادیبوں میں ادیب، معلموں میں استاد اور دوستوں میں ایک غم گسار ساتھی تھے۔ ان کے ملنے والے ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے مگر ان میں سے ہر کسی کو یہ یقین ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ دوسروں سے زیادہ پر خلوص ہیں! ہر شخص کے ساتھ محبت اور خلوص سے پیش آنا ان کا طرز حیات تھا۔ وہ کسی پر اپنی علمیت کا رعب جمانے کی کوشش نہ کرتے۔ عمر بھر طالب علمانہ انداز اپنائے رکھا اور انکساری سے کام لیتے ان میں ایک معلم کا وقار، شاعر و ادیب کی شوخی، عالم کا انکسار تھا۔

وفات سے ایک دن پیشتر کالج پڑھانے گئے، وہیں علیل ہو گئے۔ ہسپتال لے جایا گیا، جہاں پہلے حالت کچھ سنبھلی لیکن دوبارہ بگڑ گئی اور کرنال میں طلوع ہونے والا علم و ادب کا یہ درخشاں ماہتاب ۲۰ جنوری ۲۰۱۱ کو ملتان میں غروب ہو کر خالق حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی نماز جنازہ ملتان کی عیدگاہ میں علامہ حامد سعید کاظمی کی اقتدا میں ادا کی گئی جس میں

ہزاروں سوگوار شاگرد، دوست، ساتھی اور ملنے والے شریک ہوئے۔

وہ آخردم تک مصروف رہے، علم اور محبت بانٹتے رہے۔ کسی کی محتاجی نہیں ہوئی، چند ماہ پہلے تک اپنی قدیم ویسپا اسکوٹر کو چلا کر آتے جاتے رہے۔ پھر دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب وہ خود اسکوٹر نہ چلایا کریں، تو انہیں بیٹا لے جایا کرتا۔ ملتان میں پاکستان کا ایک مایہ ناز اہلِ علم و دانش اب ابدی نیند سو رہا ہے۔ اس کے بغیر ملتان کی ادبی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ملتان کی تعلیمی زندگی سوگوار ہے، اور احباب کی محفل سونی ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ عاصی صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا ہو۔ آمین

بقیہ عاشور کاظمی...

ذات میں ایک انجمن تھے، ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ آج کے بحرانی حالات میں عاشور کاظمی جیسے صاحب جنوں تحقیق کار اور مجذوب ناقد کی وجہ سے برطانیہ میں اردو کی شمع نہ صرف روشن تھی بلکہ اس شمع سے پوری ادبی کائنات بھی ضیا بار ہو رہی تھی اور آج کے اس اردو کش ماحول میں یہ ضیا باری بھی بہت بڑی بات تھی۔ سید عاشور کاظمی اردو کے سچے عاشق اور جاں نثار تھے۔ دنیا کے شاید وہ ایسے مجاہدِ اردو تھے جنہوں نے اردو کی خدمت کے لیے کارگو کا کاروبار ترک کر دیا تھا اور فروغِ اردو کے لیے اپنی زندگی اور دولت وقف کر دی تھی لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ پروسٹریٹ کے کینسر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک ہفتہ گھر میں رہتے تھے دوسرے ہفتے ہوسپٹل میں گزارتے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں سے ان کی زندگی کا یہی معمول بن گیا تھا۔

6 / جون 2010 کو 11 بجے دن میں جب مجھے یہ منحوس خبر ملی کہ سید عاشور کاظمی آج صبح چار بج کر ایک منٹ (ہندوستان کے وقت کے مطابق) پر دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے تو میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ چاروں طرف صفِ ماتم بچھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ برطانیہ میں اردو کا سورج غروب ہو گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں، باتیں اور ملاقاتیں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

حیدر قریشی (جرمنی)

سلطان جمیل نسیم قصہ قدیم و جدید

سلطان جمیل نسیم ۱۹۳۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ء میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ انہیں لکھتے ہوئے لگ بھگ ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔ میری پیدائش ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ گویا میری کل عمر سے بھی سلطان جمیل نسیم کی قلمی عمر زیادہ ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت اردو ادب میں دو تین بڑی توانا لہریں چل رہی تھیں۔ ایک طرف تقسیم برصغیر کے بعد کے انسانی المیے کو دونوں طرف کے شاعر اور ادیب اپنے اپنے انداز سے بیان کر رہے تھے اور اس حوالے سے کئی بڑی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک کی گھن گرج نے انقلابی اقدار کو متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ پھر اسی ترقی پسند تحریک کے دوش بدوش اور کہیں اسی کے اندر سے جنم لیتی ہوئی منٹو جیسی حقیقت پسندی تھی جس نے پرانی اقدار والے ماحول میں ایک کہرام برپا کر رکھا تھا۔ ایک اور طرف سے ادب میں پاکستانیت کے خدوخال کی بات شروع ہو رہی تھی۔ سو اس لحاظ سے بڑی ادبی گہما گہمی کا ماحول تھا جس میں سلطان جمیل نسیم کے لکھنے کی ابتدا ہو رہی تھی۔

ایسے پُر شور، پرزور ادبی ماحول کے باوجود سلطان جمیل نسیم نے جب لکھنا شروع کیا تو اپنا ایک دھیما لہجہ اختیار کیا۔ وہ ملک کی ادلتی بدلتی سیاسی صورتحال سے بھی باخبر رہے، مزدور، کسان اور غریب سے بھی انہیں ہمدردی رہی، انسانی اقدار ان کے پیش نظر رہیں، جنس کو انہوں نے شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھا لیکن جنسی چٹخارے سے کہانی کو مقبول بنانے کی کاوش نہیں کی۔ وہ ادبی تحریکوں اور ادبی مباحث سے پوری طرح باخبر رہ کر کسی خاص نظریاتی راہ پر چلنے کی بجائے ان راہوں کے ساتھ ساتھ یا آس پاس اپنی راہ خود تراشنے اور اس پر گامزن رہنے میں بہتر محسوس کرتے اور اسی طرح انہوں نے ساٹھ برس اردو ادب کی خدمت میں گزار دیے۔ مذکورہ بالا تمام ادبی رویوں اور

تحریکوں کے دوران جب جدید افسانے کا دور آیا اور اس میں علامتی کے ساتھ تجریدی افسانے کی بڑے پیمانے پر پذیرائی کی جانے لگی، سلطان جمیل نسیم تب بھی اپنے آپ میں مگن رہے۔ مقبول ہونے کے کسی کارگر شارٹ کٹ کی چکا چوند نے بھی انہیں مرعوب نہیں کیا اور وہ مزے مزے سے اپنی راہوں پر چلتے رہے۔

سلطان جمیل نسیم کے ساتھ قصۂ جدید وقدیم لکھتے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ تو اپنے عصر کے سارے ادبی رویوں سے باخبر ہو کر اور ان کے مثبت پہلوؤں سے متاثر ہو کر بھی کسی ایک طے کردہ نظریاتی لائن پر نہیں چلے تو انہیں قدیم اور جدید کے کس خانے میں رکھا جائے۔ میں جو آج کے دور سے کافی حد تک قدم بقدم ہو کر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں، زمانے کی برق رفتاری کے سامنے میری اپنی بھی یہ حالت ہے کہ: ہم رہ گئے ہمارا زمانہ گزر گیا...... تو سلطان جمیل نسیم کو قدیم اور جدید کے کس فریم میں رکھا جانا چاہیے۔ اس دور کو مابعد جدید کہنا مشکل ہے۔ اردو میں 'مابعد جدید' کہنا تو مشکل بھی ہے اور مذاق بھی۔ سو قدیم وجدید کی کوئی نشان دہی کرنے کی بجائے کہہ سکتا ہوں کہ سلطان جمیل نسیم کی تحریروں میں ان کی زندگی کے سارے زمانے یکجا ہو گئے ہیں۔

سلطان جمیل نسیم کی مجموعی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے ایک ادبی شخصیت کی یاد ضرور آتی ہے۔ اور وہ ہیں میرزا ادیب۔ میرزا ادیب بہت ہی بھلے مانس ادیب تھے۔ ادبی مدیر کی حیثیت سے اردو ادب کی کئی نامور شخصیات کو متعارف کرانے میں ان کا بہت سارا حصہ شامل ہے۔ صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان ان کے اپنے دور کی سحر انگیز نگارشات تھیں۔ میرزا ادیب اور سلطان جمیل نسیم میں سب سے بڑی قدر مشترک بھل منسئی ہے۔ ذاتی زندگی سے لے کر اپنی تحریروں تک ایک خاص شائستگی، تہذیب اور وقار کو دونوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ دونوں نے افسانے بھی لکھے اور ڈرامے بھی اور دوسری ریڈیائی تحریریں بھی۔ دونوں نے بچوں کے ادب کے لیے قابلِ ذکر کام کیا۔ اس ساری ہم آہنگی کے ساتھ دونوں کو لاہور اور کراچی کی اُن مقامی تہذیبوں کا نمائندہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جو ہمارا سرمایۂ افتخار تھیں اور جو اب ان دونوں شہروں سے مٹتی جا رہی ہے۔

ابھی تک سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کے چار مجموعے اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع

ہوا ہے۔ بچوں کے لیے دو ناول بھی چھپ چکے ہیں۔ ان پر ایم اے کی سطح کے دو مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اکرام بریلوی نے 'سلطان جمیل نسیم کے افسانے تنقید اور تجزیہ' کتاب لکھ کر چھاپ دی ہے۔ "جدید ادب' نے ان کا ایک گوشہ شائع کیا ہے۔ جس میں میرزا ادیب، انتظار حسین، مشفق خواجہ، اسلم فرخی، ڈاکٹر انور سدید، خالد سہیل کے مضامین اور وزیر آغا، جوگندر پال، شوکت صدیقی، محمد خالد اختر، ممتاز مفتی، عرش صدیقی، منشا یاد، محمد علی صدیقی، نسیم درانی، حسن منظر، آغا سہیل، احمد ہمدانی، جیحمدر بلو، غلام عباس، شفیق الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی، رشید امجد، قیصر تمکین، محافظ حیدر کے تاثرات شامل ہیں۔ یہ ایک بھرپور خراج تحسین ہے۔ جو سلطان جمیل نسیم کے ادبی کام کا اعتراف ہے۔

جہاں تک سلطان جمیل نسیم کے ادبی مزاج کو سمجھ سکا ہوں، وہ اپنے کام کی تحسین کیے جانے پر خوش تو ہوتے ہیں لیکن دوسروں سے ایسا کچھ لکھوانے میں بھاگ دوڑ نہیں کرتے۔ البتہ ایک معاملہ میں انہیں دوسروں سے کہتے سنا ہے۔ وہ معاملہ بھی اپنی جگہ ایک خوبصورت خوبی بن گیا ہے۔ جو رسالہ بھی ان سے ان کی تخلیقات کی فرمائش کرتا ہے، اسے اپنی تخلیق بھیجیں یا نہ بھیجیں لیکن اپنے والد گرامی صبا اکبر آبادی کا کلام ضرور بھیجیں گے۔ مجھے ان کا یہ انداز اتنا بھایا ہے کہ ہمیشہ ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ شاید اپنے والد صاحب کو یاد رکھنے کی ایسی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ انہیں کسی تقاضے کے بغیر اردو کی ادبی دنیا سے بھرپور پذیرائی مل رہی ہے۔ ماں کی دعا کی تو ساری دنیا معترف ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے باپ کی دعا کا جلوہ بھی دکھایا ہے۔

سلطان جمیل نسیم کی شخصیت اور تحریروں میں قدیم ادبی و تہذیبی روایات کی بہت ساری مثبت قدریں بھی موجود ہیں اور وہ جدید دور کے عصری رجحانات سے بھی پوری طرح واقف ہیں اور مقدور بھر ان سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا سارا ادبی کام گم ہوتی ہوئی اقدار اور ایک نیا جنم لیتی ہوئی اقدار کے زمانی سنگم پر معرض وجود میں آیا ہے، تخلیق و تحریر ہوا ہے۔ سو ان کے ہاں ان کی زندگی میں آئے ہوئے سارے زمانوں کی پرچھائیاں دیکھی جا سکتی ہیں اور سرگوشیاں سنی جا سکتی ہیں۔ سلطان جمیل نسیم کے ایک قاری کی حیثیت سے ان کے بارے میں یہ تاثرات لکھ کر مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے۔

عرفان ستار

عزم بہزاد کچھ یادیں...... کچھ باتیں

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر میں نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹر نے کہا کہ سر آپ کے لیے عزم بہزاد صاحب کا فون ہے۔

میرے ہیلو کہنے پر آواز آئی۔ پیارے بھائی خیریت...... جی عزم بھائی...... دعا ہے آپ کی۔ آپ ٹھیک ہیں۔

اللہ کا کرم ہے...... ساڑھے پانچ بجے تک اٹھ جاؤں گا دفتر سے۔ پھر جیسے آپ فرمائیں۔

پیارے بھائی آج کچھ کام ہے۔ سوچ رہا تھا اگر آپ زحمت کر سکیں تو ہم جون بھائی سے ملنے چلیں۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔

ضرور عزم بھائی۔ میں چھ بجے تک حاضر ہو جاؤں گا۔

شام چھ بجے میں ان کے دفتر کے باہر پہنچا۔ تو وہ گیٹ پر منتظر تھے۔ ان دنوں عزم بھائی .... پاکستان میں ملازمت کیا کرتے تھے جس کا دفتر کراچی کی پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی میں تھا۔

جب ہم جون بھائی کے گھر پہنچے تو وہ حسب معمول لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے۔

ارے جانی خوب آئے اہاہ...... بہزاد میاں خوش کر دیا۔ عرفان تجھے معلوم ہے یہ کون ہے بہزاد لکھنوی کا پوتا...... بہزاد لکھنوی...... توبہ...... جون بھائی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

ہم دونوں تین گھنٹے جون بھائی کے پاس بیٹھے رہے اور وہ فرمائش کر کر کے عزم بھائی سے ترنم سے غزلیں سنتے رہے اور اپنے مخصوص انداز میں داد دیتے رہے اس کے بعد ہمیں اپنی دو تازہ غزلوں سے نوازا اور رات ساڑھے نو بجے کے قریب ہم جون صاحب سے اجازت لے کر وہاں سے چلے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی عزم بھائی کہنے لگے۔ پیارے بھائی مرغابی کا سالن کھائیں گے۔

بہت ہی اعلیٰ چیز ہے سردیوں کے موسم میں"۔

میں نے کہا میں نے کبھی کھایا نہیں ہے مگر ضرور کھاؤں گا۔ کہنے لگے آج تمہاری بھاوج نے مرغابی کا سالن پکایا ہے۔ اگر آغا کو بھی فون کردو تو اور لطف آجائے۔ آغا سے مراد کراچی کے بے حد با صلاحیت مزاح کے شاعر سعید آغا تھے جو عزم بھائی کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ میں نے آغا بھائی کو فون کیا اور جب ہم عزم بھائی کے گھر پہنچے تو آغا پہلے سے وہاں پہنچے منتظر تھے۔ خوب مزے مزے لے کر ہم تینوں نے مرغابی کا سالن کھایا۔ جس کے دوران مطلوب (عزم بھائی کا بیٹا) گرم گرم روٹیاں لاتا رہا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر تا دیر شعر و ادب پر گفتگو رہی۔ عزم بھائی کی صحبت میں فضول گفتگو کی گنجائش بہت کم ہوتی تھی۔ کوئی نہ کوئی سوال اٹھا کر عزم بھائی کو ذہنی مشق میں شریک کر لیا کرتے تھے اور ہمیشہ شرکاء محفل اپنی معلومات میں اضافہ کر کے اٹھتے تھے۔

عزم بھائی سے میری پہلی ملاقات اس دن سے تقریباً ایک برس پہلے ہوئی تھی جس کی روداد میں نے اوپر بیان کی ہے۔ انیق احمد کے توسط سے میں ان سے ملا تھا۔ طارق روڈ پر لبرٹی چوک کے نزدیک ایک ایرانی ریسٹورنٹ ہوتا تھا جہاں اب بن کباب اور چاٹ کی دکان کھل گئی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں ہر منگل کی شام انیق احمد، عزم بہزاد، لیاقت علی عاصم، اور سعید آغا بیٹھتے تھے۔ انیق کی دعوت پر جب میں پہلی بار اس محفل میں شریک ہوا تو عزم بھائی، عاصم بھائی، اور آغا بھائی کی گرم جوشی سے بے حد متاثر ہوا۔ گفتگو کا موضوع اس دن بھی شعر و ادب رہا۔ اگلے منگل کو میں دوبارہ شریک ہوا اور رخصت ہوتے ہوتے ہوئے عزم بھائی نے مجھ سے کہا۔

"پیارے بھائی بہت اچھا لگتا ہے آپ سے مل کر۔ اگر زحمت نہ ہو تو ہفتے کی رات کو میرے غریب خانے پر ہم سب احباب جمع ہوتے ہیں آپ بھی تشریف لائیے"۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا فوراً حامی بھر لی۔

ہفتے کی رات جب میں عزم بھائی کے گھر پہنچا تو لیاقت علی عاصم، سعید آغا اور انیق احمد کے علاوہ دو اور صاحبان سے تعارف ہوا۔ معراج صاحب اور انور جاوید ہاشمی، معراج صاحب بزرگ تھے اور عزم نے تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ معراج سب سے زیادہ اعلیٰ شعری ذوق کا مالک آپ کو مشکل ہی سے ملے گی۔ ہاشمی صاحب کے متعلق فرمایا کہ میرے دیرینہ دوست ہیں اور عمدہ شاعر

ہیں۔

اس پہلی نشست میں ہی عزم صاحب کے جوہر مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ گفتگو کا موضوع میر انیس کی مرثیہ نگاری تھی اور عزم بھائی کو بند کے بند یاد تھے اور وہ انہیں دہراتے ہوئے شاندار گفتگو کر رہے تھے اور حاضرین ہمہ تن گوش تھے۔ ان کا بیٹا مسعود ان کے پاس بیٹھا تھا اور عزم بھائی شفقت سے اس کے سر پر تھوڑی دیر بعد ہاتھ پھیر رہے تھے (یہ مجھے بعد میں علم ہوا کہ مسعود پیدائشی طور پر ایک لاعلاج مرض میں مبتلا تھا) نشست کا اختتام شاعری کے دور پر ہوا میں بہت سرشار اور بہت خوش گھر لوٹا۔ اس کے بعد ہر سنیچر کی رات کو اس نشست میں شرکت میرا معمول بن گیا۔ چار پانچ ملاقاتوں کے بعد عزم اچانک کہنے لگے 'پیارے صاحب آپ میں شاعری نظر آتی ہے کچھ سنائیں گے' میں نے عرض کیا عزم بھائی آپ کے سامنے میں نوآموز کیا شعر سناؤں۔ کہنے لگے 'بھائی! ابتدا میں سب نوآموز ہوتے ہیں۔ آپ شعر سنائیں'۔ میں نے ایک غزل سنائی۔ جب نشست ختم ہوئی تو عزم بھائی کہنے لگے 'پیارے صاحب آپ شاعر ہیں۔ مشق اور فنی معلومات کی کمی ہے اس پر محنت کیجئے' اور پھر میں بھی ہر ہفتے غزل سنانے لگا۔

ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے عزم بھائی سے کہا 'عزم بھائی فنی تربیت کی کمی کو کس طرح دور کیا جائے' کہنے لگے 'پیارے صاحب مطالعہ تو آپ کا خوب ہے اب کوئی استاد چاہیے جو آپ کی رہنمائی کرے'۔ میں نے عرض کیا 'تو وہ کون ہو سکتا ہے' جواب ملا 'پیارے صاحب۔ سکہ بند استادوں کے پاس تو میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ مجھے سوچنے دیں۔ جلد کچھ عرض کروں گا'۔ یہ واضح رہے کہ نشست میں پڑھی جانے والی غزل کے کسی لفظ یا مصرعے کی بندش میں کمزوری ہوتی تو عزم بھائی نشست کے اختتام پر میری گاڑی کے پاس مجھے رخصت کرتے ہوئے پیار سے بتایا کرتے تھے مگر اسے باقاعدہ اصلاح نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مشورہ کہہ لیجئے۔

دو ہفتے بعد میں نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

یوں ہی بے یقیں یوں ہی بے نشاں مری آدھی عمر گزر گئی
کہیں ہو نہ جاؤں میں رائیگاں مری آدھی عمر گزر گئی

ساری محفل داد و تحسین سے گونج اٹھی۔ سب احباب نے مجھے اٹھ کر گلے لگایا۔ عزم بھائی

کہنے لگے' پیارے بھائی اب آپ کے سفر کا آغاز ہو گیا ہے۔ مبارک ہو۔ خدا بہت ترقی دے۔ پیر کی شام کو تشریف لائیے میرے دفتر۔ ایک کام ہے'۔

پیر کے دن میں ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی میں بیٹھ کر کہنے لگے۔ جون بھائی کے گھر جائیں گے۔

گارڈن ایسٹ میں واقع جون بھائی کے گھر پہنچے تو انہیں حسب معمول فکر سخن اور شغل مے نوشی میں مگن پایا۔ ہمیشہ کی طرح پیار سے ملے۔ بیٹھتے ہی عزم بھائی کہنے لگے' جون بھائی آج ایک درخواست لے کر آیا ہوں آپ کے پاس'۔ جون بھائی نے کہا' ہاں ہاں جانی بتا'۔ عزم بھائی نے کہا 'پہلے آپ عرفان سے غزل سنیں' جون بھائی کہنے لگے' ضرور سنیں گے کس کی غزل ہے' عزم بھائی کہنے لگے' عرفان اپنی غزل سنائے گا' جون صاحب نے جواب دیا' عرفان غزل سنائے گا یہ تو ہمیشہ کہتا ہے کہ یہ شعر نہیں کہتا۔ ارے جانی جھوٹ کہتا رہا مجھ سے؟ چل سنا غزل'۔ میں نے غزل سنائی آخری شعر پر جون صاحب لپک کر میرے پاس آئے اور میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔

کہاں کائنات میں گھر کروں میں یہ جان لوں تو سفر کروں
اسی سوچ میں تھا کہ ناگہاں میری آدھی عمر گزر گئی

'ناگہاں؟ ناگہاں؟ بہزاد...... ناگہاں...... ہائے ہائے...... مار ڈالا جانی'

جب جون بھائی دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو عزم بھائی نے کہا' جون بھائی عرفان آپ سے کتنی محبت کرتا ہے یہ آپ جانتے ہیں' جون بھائی نے جواب دیا' ارے عرفان میرا بیٹا ہے عرفان۔ میں بھی بہت محبت کرتا ہوں اس سے' عزم بھائی کہنے لگے جون بھائی پھر آپ سے درخواست ہے کہ عرفان کی رہنمائی کیجئے۔ اسے اپنی شاگردی میں لیجئے۔ جون بھائی چند لمحوں کے لیے خاموش رہے پھر بولے' بہزاد تو جانتا ہے کہ اس طرح کی استادی شاگردی کا میں آدمی نہیں۔ میں تو محبت کا آدمی ہوں۔ جو جانتا ہوں وہ بتا دیا کروں گا باقی اس کی محنت' عزم بھائی نے کہا' اتنا کافی ہے جون بھائی'۔ جب وہاں سے چلے تو عزم بھائی نے کہا کہ جون بھائی کی مجھ سے قربت کے پیش نظر انہیں یہ خیال آیا کہ ان سے بہتر استاد اور کون ہو سکتا ہے۔

اس دن کے بعد سے مجھ پر اس دریائے علم کا فیضان عام ہوا جسے آپ سب جون ایلیا کے

نام سے جانتے ہیں۔ آج میرے مصرعوں میں اگر ذرا سی بھی چمک کہیں آپ کو نظر آتی ہے تو وہ جون بھائی کی دین ہے اور کوتاہیاں تمام میری اپنی ہیں۔ عزم بھائی کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کا بدلہ میں کبھی بھی نہ چکا سکوں گا۔ میں خود تو شاید جون صاحب کو بھی بتا ہی نہ پاتا کہ میں شعر کہتا ہوں۔

عزم بھائی کی رہائش کچھ عرصے بعد حضرت بہزاد لکھنوی کے مزار کے احاطے میں تعمیر شدہ کوارٹر میں منتقل ہوگئی اور ہماری نشست مزار کے چبوترے پر منعقد ہونے لگی۔ اس کے بعد میر حامد علی کانپوری کے گھر اور بالآخر عزم بھائی کے ایک اور گھر منتقلی کے بعد دوبارہ محفل ان کے ہاں جمنے لگی۔ اس دوران جاذب ضیائی، صابر وسیم اور نگار صہبائی اس نشست کے مستقل شرکاء میں شامل ہو گئے تھے اور ان کے علاوہ بقول عزم بھائی، درویش جہاندیدہ خواجہ رضی حیدر اور مرشد نیم کامل احسن سلیم، خواجہ رضی حیدر سے میرے مراسم اتنے گہرے ہوئے کہ آج بھی میں ان کے گھرانے کا ایک فرد ہوں اور وہ مجھے اپنا بھائی کہہ کر ہی مخاطب کرواتے ہیں۔ احسن سلیم بلا کے شاعر ہیں اور شعر کی اعلیٰ تفہیم رکھتے ہیں۔

عزم بھائی کی نشست کی شہرت سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اور بیرون کراچی اور بیرون ملک سے آنے والے شعرا اور ادیب بھی اس نشست میں بخوشی شریک ہوتے تھے۔ میں اگر وہ فہرست گنواؤں تو آپ کو یقین آ جائے کہ یہ کتنی وسیع محفل تھی۔ بھارت سے عرفان صدیقی اور شہباز ندیم ضیائی، کراچی سے سحر انصاری، مبین مرزا، جمال پانی پتی، رضی اختر شوق، انور شعور، صابر ظفر، محمد علی صدیقی، شاداب احسانی، عباس رضوی وغیرہم، حیدرآباد سے حمید جیلانی لاہور سے احمد جاوید، سعود عثمانی، واجد امیر، زاہد احمد، نجیب احمد، راولپنڈی اسلام آباد سے ناصر زیدی، احمد فراز، صاحب معراج صاحب کے بہت گہرے دوست بھی تھے) توصیف تبسم اور پشاور سے محسن احسان ۔ان تمام شعراء سے مجھے عزم بھائی کے طفیل ہی نیاز حاصل ہوئے۔ کراچی کے بیشتر لوگوں سے ذاتی تعلقات استوار ہوئے اور کراچی سے باہر خالد احمد اور نجیب احمد آج بھی مجھ سے بہت مشفقانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ احمد جاوید میرے مربی و محسن ہیں اور بھائی سعود عثمانی سے قلبی تعلق آج تک قائم ہے۔ یہ سب عزم بھائی کی نشست کا فیض ہے ورنہ کیا میں اور کیا میری بساط۔

عزم بھائی کی نشست کی شہرت پھیلنے لگی تو حاسدین نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ عزم بھائی کی دوستی کا دم بھرنے والے ایک شاعر نے اپنے کالم میں عزم بھائی کی نشست کو خانقاہ عزمیہ بہزادیہ لکھ کر تمسخر اڑایا اور ہم سب کو ان کے مجاور قرار دیا۔ ہم سب عزم بھائی سے کہتے کہ آپ ہمیں کیوں روکتے ہیں۔ جواب دینے دیں انہیں تو ہمیشہ کہتے کہ "پیارے بھائی۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟ جو یہاں آ چکا ہے وہ اس نشست کی وقعت سے واقف ہے اور جسے یہاں نہیں آنا اس کے کچھ بھی سوچنے سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟ سب ٹھیک ہے۔ ایسی باتوں پر کان نہ دھریں"۔ اور ہم سب خاموش ہو رہتے۔

اس نشست کی خوبصورتی اس کے شرکاء تھے جن میں ہر ایک کی شخصیت کا حسن مختلف تھا۔ جہاں ایک طرف عزم بھائی بے حد علم اور گفتگو کا سلیقہ رکھتے تھے وہیں خواجہ رضی حیدر ان سے اعلیٰ سطح پر گفتگو کرنے کے لیے علم اور صلاحیت دونوں کے مالک تھے۔ اور شعر بھی بہت اعلیٰ کہتے تھے۔ احسن سلیم موڈ کے بادشاہ تھے۔ چپ ہیں تو چپ ہیں اور اگر گفتگو کا موڈ بن گیا تو بس پھر وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ معراج صاحب کا شعری ذوق تمام شعراء کو خوب سے خوب ترکی جستجو میں مگن رکھتا تھا اور ان سے داد پانا سب کی خواہش ہوتی تھی۔ لیاقت علی عاصم کم گو ضرور تھے مگر شعر اس بلا کا کہتے تھے کہ کم و بیش ہر نشست میں ان کی غزل سب سے زیادہ داد پاتی تھی۔ انور جاوید ہاشمی دھیمے لہجے کے مالک اور دھیمے ہی لہجے کے شاعر تھے۔ سعید آغا بذلہ سنج اور محفل گرما دینے والے دوست تھے۔ نگار بھائی جب گیت کا مکھڑا اٹھاتے تھے تو ہم کسی اور ہی دنیا میں داخل ہو جاتے تھے۔ جاذب ضیائی بہت محبت کرنے والے اور پر تپاک دوست اور پر امکان شاعر تھے۔ صابر وسیم بہت پیارے شاعر اور بے حد محبت کرنے والے دوست تھے۔

عزم بھائی کا نشست کا معمول کچھ یوں ہوتا تھا کہ عموماً عزم بھائی کوئی مضمون یا کتاب کا حصہ منتخب کر کے رکھتے تھے اور سب احباب کو پڑھ کر سناتے تھے۔ اس کے بعد اس پر گفتگو ہوتی تھی جس میں وہ موڈریٹر کا کردار نبھاتے تھے۔ اور آخر میں چائے کے بعد تازہ شاعری کا دور چلتا تھا۔ نہ غیبت، یا ہم عصروں کی برائی نہ اور کوئی فضول بات۔ خالص ادبی اور تہذیبی ماحول ہوا کرتا تھا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ہر ہفتے تازہ غزل کی خواہش طبیعت کو کیسا رواں رکھتی تھی۔ اب مہینوں ایک

مصرع نہیں ہو پاتا۔ سچ ہے کہ ماحول کا اثر شاعری کی تخلیقی نوکنٹ پر بہت زیادہ ہوا کرتا ہے۔

بھارت کے ایک سفر کے دوران میں وہاں سے تنقید پر مبنی کتابیں اور شعری مجموعے لایا تو مہینوں ہماری نشست میں بانی، عرفان صدیقی اور شاذ تمکنت کی شاعری اور تارنگ اور وارث علوی کے مضامین پڑھے جاتے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ یہ بھی عزم بھائی کی ہی دریافت تھی کہ میں نثر لکھ سکتا ہوں۔ ہوا یوں کہ بھارت سے آئے ہوئے شاعر شہباز ندیم ضیائی کی کتاب 'وصال صنم' کی تقریب رونمائی آرٹس کونسل میں ان کے دیرینہ دوست اور استاد بھائی جاذب ضیائی منعقد کر رہے تھے۔ اس تقریب کی تفصیلات عزم بھائی کی نشست میں طے ہو رہی تھیں کہ جاذب نے تقریب کی نظامت کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ اس پر عزم بھائی نے کہا نہیں نظامت کسی اور کو سونپ دیں۔ عرفان شہباز ندیم ضیائی کی شاعری پر مضمون پڑھیں گے۔ میں نے حیران ہو کر کہا 'عزم بھائی میں کیا لکھوں گا؟' عزم بھائی نے جواب دیا جب لکھنے بیٹھیں گے تو بہت اچھا مضمون ہوگا یہ میں جانتا ہوں۔ میں نے مضمون لکھا تقریب میں پڑھا اور اس کے اختتام پر جناب شکیل عادل زادہ نے مجھ سے یہ کہہ کر تعریف کی کہ انہوں نے ایک طویل عرصے کے بعد اتنا اچھا مضمون سنا ہے۔ شکیل عادل زادہ کی نثر نگاری کا میں مداح ہوں اس لیے ان کی تعریف میرے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ یہ نگاہ تھی بھائی عزم بھائی کی۔

ناظم آباد کے اردو بازار میں کتابت کی محنت سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کاپی رائٹنگ تک عزم بھائی کا سفر بہت کٹھا اور صبر آزما رہا۔ مگر مجال ہے جو ان کے ماتھے پر شکن آئی ہو۔ اس..... بھائی کے بڑے ہونے کا حق سمجھ کر بارہا عزم بھائی نے کہا کہ ہر ہفتے اتنے لوگوں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست خاصا مہنگا سلسلہ ہے اور بہتر ہوگا کہ ہم سب اس میں حصہ ڈالیں مگر عزم بھائی ہر بار مسکرا کر ٹال جاتے۔ مسعود کا انتقال ایک ایسا سانحہ تھا جس کے بعد عزم بھائی میں خاصی تبدیلی آئی تھی، مگر منفی نہیں بلکہ مثبت۔ وہ اور زیادہ صابر اور قانع ہو گئے تھے۔ عزم بھائی کا بڑا بیٹا مطلوب سننے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے امتحانات سے گزرتے ہوئے اس خوبصورت مزاج کو برقرار رکھنا جو عزم بھائی کا خاصا تھا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

سنیچر کی نشستوں کے علاوہ بھی ہماری ملاقات ہفتے میں ایک دو بار ہو جایا کرتی تھی کیونکہ میرا دفتر ان کے دفتر سے زیادہ دور نہ تھا اور جس دن کام کا بوجھ کم ہوتا عزم بھائی مجھے فون کرتے تھے اور ہم شام ساتھ گزارتے تھے۔ ان کی کئی خوبصورت غزلوں کی آمد کا سلسلہ میری موجودگی میں ہوا اور مجھے ان کے پہلے سامع ہونے کا شرف بھی ملتا رہا۔ ایک لڑائی ہماری ہر ملاقات پر ہوا کرتی تھی اور اس کی وجہ گھر واپسی کے وقت عزم بھائی کا اصرار ہوتا تھا کہ میں انہیں بس اسٹاپ پر اتار دوں تا کہ وہ بس سے گھر چلے جائیں اور مجھے یہ بات گوارا نہ ہوتی۔ اس لڑائی کا اختتام عزم بھائی کے اس جملے پر ہوا کرتا تھا کہ "پیارے بھائی آپ ماننے والے کہاں ہیں۔ ٹھیک ہے بھائی۔ مگر چائے پی کر جائیں گے آپ" اور میں اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دیتا۔ برنس روڈ کے وحید ہوٹل کے کباب، زاہد کی نہاری، کیفے پیالہ کی چائے اور اسکے ساتھ تر تراتا ہوا پراٹھا۔ شاعری کے علاوہ یہ ہمارے مشترکہ شوق تھے۔ میری والدہ کے ہاتھ کی پکی ہوئی مچھلی عزم بھائی کو بہت پسند تھی۔ فرمائش کر کے پکواتے تھے اور بہت خوش ہو کر کھاتے تھے۔ سعید آغا اس شوق میں ہمارے ساتھ اکثر شریک رہتے تھے۔

عزم بھائی کی مسکراہٹ، ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے کا انداز، اور گفتگو کا سلیقہ ایسا تھا کہ ساری محفل میں وہ...... ہی رہتے تھے۔ ہمیشہ اپنی بات بہت نرم لہجے میں کرتے۔ سامنے والا نہ مانتا تو سمجھاتے۔ ورنہ یہ کہہ کر چپ ہو جاتے کہ "ٹھیک ہے بھائی کوئی بات نہیں۔" کج بحثی ان کے مزاج میں نہ تھی۔ تکبر ان کے قریب سے بھی نہ گزرا تھا۔ یقین کیجئے کہ ایسا علم ایسی صلاحیت اور حضرت بہزاد لکھنوی سے نسبت کسی عام شخص کے حصے میں آ ئی تو اس کا نفس غبارے کی طرح پھول جاتا۔ مگر عزم بھائی میں ان باتوں نے انکسار اور عاجزی فراوا کر دی تھی۔

چھوٹوں سے ان کا برتاؤ مثالی تھا...... مغل، علی زبیر، فیض عالم بابر، سیمان نوید، کاشف غائر، رمزی آثم، اور کتنے ہی نوجوان آج عزم بھائی کی جدائی میں جیسے تڑپ رہے ہیں وہ اس پر دلیل ہے۔ سب کو یہی تلقین کرتے کہ عجلت اور تکبر سے بچو۔ اللہ توفیقات میں اضافہ کرے گا۔ خود بھی ہمیشہ ان باتوں پر عمل پیرا رہتے تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ عزم بھائی اپنے بعد آنے والوں کی کیسی پذیرائی کرتے تھے۔ ایک دن ایک فون آیا اور میرے ہیلو کہنے پر آواز آئی۔

کرم کیا کہ رکے تم نگاہ بھر کے لیے
نظر کو اس سے زیادہ کی تاب تھی بھی نہیں

کیا خالص شعر کہہ دیا ہے پیارے صاحب۔

آواز جانی پہچانی تھی مگر میں طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس کی آواز ہے۔ میں نے پوچھا
'شکریہ جناب۔ کون صاحب؟

'علیم بول رہا ہوں پیارے صاحب۔ عبید اللہ علیم'

میری خوشی کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ میں نے کہا 'یہ غزل تو ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی۔ دو ہی اشعار ہوئے ہیں۔ آپ تک کیسے پہنچے؟' جواب ملا 'عزم بیٹھا ہے میرے پاس۔ اس نے سنایا تمہارا یہ شعر۔ تم میرے پاس آؤ عزم کے ساتھ۔ میں طے کر لیتا ہوں دن، ٹھیک ہے؟'

قسمت کا ستم دیکھیے کہ اس گفتگو کے ٹھیک تین دن بعد علیم صاحب انتقال کر گئے۔ اور ان سے ملاقات کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مگر عزم بھائی کا...... پن تھا کہ اپنے سینئرز کو اپنے بعد آنے والے شعراء سے متعارف کروانے میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

فیس بک، پر ایک آواز بار ہا ایسا ہوا کہ عزم بھائی کی غزل پر چند احباب کی شدید تنقید کا جواب میں نے اسی شدت سے دیا تو عزم بھائی نے مجھے میل کر کے ایک ہی بات کہی کہ میں ان لوگوں سے نہ الجھوں۔ وہ کہتے تھے کہ پیارے بھائی! آپ اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھیں۔ اور تنقید کرنے والوں کو اپنا کام کرنے دیں۔ یہ فیصلے اور بھی وقت کرتا ہے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ انہیں کوئی دعویٰ نہیں اور وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حرف کار کا سفر عاجزی کا سفر ہے۔ خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ تخلیق میں اثر پیدا کرے اور بس۔ اس کے بعد تخلیق کا کام...... کرتا نہیں۔ وہ کسی ایسے معاملے میں جواب نہیں دیتے تھے۔ ان کی تخلیق سے متعلق ہو۔ ...... معاملات پر اور...... مسائل پر اپنے موقف کا اظہار اسی محبت اور خلوص سے کیا کرتے تھے۔ جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

پروفیسر خادم علی ہاشمی کی مرتب کردہ کتاب

شجاع ناموس

(شخصیت اور فن)

اردو اکیڈمی بہاولپور کے زیر اہتمام شائع ہو گئی ہے

نسیم انجم

آہ! ڈاکٹر مشرف احمد

منگل ۱۳ جون کی شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہے، ٹرن ٹرن کی آواز مجھے ٹیلی فون تک پہنچا دیتی ہے، فون پر ڈاکٹر مشرف احمد کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی سعدیہ سسکیوں کے درمیان اپنے چاہنے والے باپ کے انتقال کی خبر سنا رہی ہے، میں بھی اس کے ساتھ رونے لگتی ہوں، پھر اسے صبر کی تلقین کرتی ہوں۔

بعد مغرب جب میں ان کے گھر کے راستے پر گامزن ہوتی ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقے کی لائٹ گئی ہوئی ہے، رات کے گھپ اندھیرے میں پورا ایریا جنگل بیابان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ غم اور خوف سے میرا دل لرز رہا ہے، قدم کہاں رکھتی ہوں اور پڑتا کہاں ہے۔ ڈگمگاتے قدموں سے میں ان کا گھر تلاش کر رہی ہوں جو کہ گم ہو گیا ہے، دو چار گلیوں میں بھٹکنے کے بعد ان کا گھر مل جاتا ہے۔

مشرف بھائی تکالیف و اذیت سے آزاد ہو چکے ہیں اور ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کی بیگم جنہوں نے ان کی بیماری کے دوران بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ ان کی تیمارداری کی ہے، اب ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا ہے کہ ان کا محبوب شوہر ان سے بہت دور چلا گیا ہے، وہ اور ان کی بیٹیاں میرے گلے لگ کر دھیمی آواز میں روتی ہیں۔

دو تین گھنٹے بعد انہیں نہلا دھلا کر ان کے جسدِ خاکی کو کولڈ اسٹوریج لے جایا جاتا ہے کہ ان کی دونوں بہنیں بھاولپور سے اپنے چہیتے بھائی کا آخری دیدار کرنے آ رہی ہیں۔ ۱۴ جون بروز بدھ بوقت ظہر ان کی تدفین عمل میں آتی ہے۔ اس طرح اردو ادب کا روشن سورج جو ابھی عالم افق پر

بھرپور طریقے سے طلوع بھی نہیں ہوسکا تھا کہ ڈوب گیا۔ ابھی تو اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ ڈاکٹر مشرف احمد اس دنیائے آب وگل سے یقیناً رخصت ہو گئے لیکن ادبی دنیا اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر مشرف احمد کا آبائی وطن پانی پت تھا لیکن ان کے والد صاحب نے بھاولپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے والد مولانا سید عبدالکریم صاحب دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے اجداد کا ذریعہ عزت وجہ افتخار علم و دین، تقویٰ اور طہارت تھا۔ اس طرح خالص مذہبی و علمی ماحول میں مشرف صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی پھر کیوں نہ اعلیٰ اوصاف و اطوار کے مالک ہوتے۔

ڈاکٹر مشرف احمد نے بھاولپور سے انٹر پاس کیا اور پھر کراچی آ گئے اور اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان 'اردو انشائیے کی روایت اور میر ناصر علی' ابوالخیر کشفی کی نگرانی میں تحریر کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ادبی ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے چند کتابیں بھی مرتب کیں۔ جن کے نام کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ اقبال شناسی ۲۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۳۔ کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ

۴۔ راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ ۵۔ انجم اعظمی: حیات و خدمات

ڈاکٹر صاحب کی پہلی کتاب شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان ہے جس میں انہوں نے ایک ہی خاندان کے صوفیاء اور باہ شعراء، اور ناول نگاروں کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔

ڈاکٹر مشرف احمد بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'جب شہر نہیں بولتے' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر مشرف احمد نے افسانے کے ہر میدان میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے معاشرتی مسائل کو بے حد خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ افسانوی پیکر میں ڈھالا۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

"مشرف احمد کا تعلق اردو افسانے کی جدید نسل سے ہے۔ انہوں نے بیانیہ افسانے بھی لکھے ہیں اور علامتی و تمثیلی افسانے بھی لکھے۔ بہر حال جو بھی فنی تجربہ کیا اس حیثیت سے وہ کامیاب ہیں کہ افسانہ افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے"۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے ان کے افسانوں کے بارے میں کچھ اس طرح رائے دی ہے۔

شرف احمد ہمارے عہد کا افسانہ نگار ہے مگر اس نے یہ بات نعروں اور تنقیدی احتجاج کی زبان میں نہیں کہی ہے بلکہ اپنے افسانوں کی مدد سے بیان کی ہے اور یہ بات آج کے افسانے کی دنیا میں اس کی ذات کا اعلان بھی ہے اور اردو افسانے کے نئے امکانات کی بشارت بھی ہے"۔

مشرف بھائی کے استاد محترم پروفیسر انجم اعظمی بھی ان کے افسانوں کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"مشرف احمد سو فیصد افسانہ نگار ہے۔ انہوں نے پرندے اور درخت جیسے افسانے لکھے ہیں جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ جدید اردو افسانہ نگاری کی تاریخ ان کے کام اور نام کو نظر انداز نہیں کرے گی"۔

لگتا تو ایسا ہی ہے کہ انجم اعظمی کی سالہا سال پہلے کہی ہوئی بات درست نظر آرہی ہے کہ بعد مرگ لوگ جس طرح تعزیتی جلسے منعقد کر رہے ہیں اور ان کی ادبی خدمات کو سراہا جا رہا ہے تو یقیناً اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں انکا کام اور نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر مشرف احمد کو اردو ادب سے عشق تھا۔ عشق کا مرض بھی لڑکپن کے ان دنوں میں لاحق ہوا تھا جب ان کی والدہ ماجدہ لائبریری سے ناول اور افسانوں کے مجموعے اپنے بیٹے مشرف احمد سے منگوایا کرتی تھیں۔ مرض پرانا تھا اس ہی لیے جوں جوں دوا کی بڑھتا گیا اور ان کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اخبار خواتین میں 'ادب نما' کے عنوان سے دس بارہ سال کالم لکھے۔ روز نامہ ایکسپریس میں بھی چار سال سے کالم نگاری کر رہے تھے لیکن بیماری نے مزید مہلت نہیں دی۔ ماہنامہ 'دائرے' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر مشرف احمد 'ارمغان' کراچی کے بانی و ایڈیٹر بھی تھے۔ اس رسالے کے دو خاص نمبر ابراہیم جلیس نمبر اور ڈاکٹر جمیل جالبی نمبر بھی نکالے۔ ڈاکٹر صاحب نے شوکت صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر

نعیم اعظمی، کمانڈر انور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر بشارت علی کے انٹرویو بھی لیے۔ ڈاکٹر مشرف احمد نے غالب لائبریری میں جوائنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ تقریباً دو ڈھائی سال قبل مشرف بھائی نے 'مجلس افسانہ' کے عنوان سے دوبارہ ادبی نشستوں کا اہتمام کیا جس میں مشاہیر قلم کو مدعو کیا جاتا تھا۔ نظامت کی ذمہ داری انہوں نے راقم الحروف کو سونپی۔ ان کی محنت، کوشش اور لگن سے تنقیدی نشستیں کامیابی کی طرف گامزن تھیں لیکن کینسر کا موذی مرض ان پر حملہ آور ہوا اور انہیں بے جان کر گیا۔

ڈاکٹر مشرف احمد بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ خوش اخلاق و خوش گفتار، بلند کردار، تصنع بناوٹ سے دور، بہت دور تھے۔ انہیں صرف اور صرف اپنے کام سے مطلب تھا۔ وہ بیک وقت معلم بھی رہے اور متعلم بھی اور بحیثیت پروفیسر اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔

میرا مشرف بھائی سے بہت پرانا بحیثیت ایک بہن کے گہرا تعلق تھا وہ مجھے اکثر و بیشتر فون کرتے، میری خیریت دریافت کرتے، مجھے اچھے اچھے مشوروں سے نوازتے جس میں پی ایچ ڈی کرنے کا بھی مشورہ شامل ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں جب دوران علالت ان کی عیادت کو جاتی، وہ مجھے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے۔ کہتے کہ میری بہت سی غیر مطبوعہ چیزیں ہیں جن میں میرا افسانوی مجموعہ 'گم شدہ شجر' بھی شامل ہے۔ میرے بعد آپ کو ہی تعاون کرنا پڑے گا، میں نے رومی کو سب کچھ سمجھا دیا ہے (رومی ان کے بڑے صاحبزادے کا نام ہے)۔

آخری دنوں میں بقول بیگم مشرف کچھ باتیں اس طرح سے کیں جو صرف اور صرف اللہ کے نیک اور پہنچے ہوئے بندوں سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر پنج حسن قبرستان میں ان کے وصیت کے مطابق دفنانے کا قطعی ارادہ نہیں تھا، لیکن انہیں وہیں جگہ ملی اور جس کا ذکر وہ اپنی چہیتی بیگم سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نیک اور اچھے انسان تھے۔ اللہ رب العزت مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے کہ وہ بڑا نوازنے والا ہے۔

جمال نقوی

کراچی کی ایک فعال علمی وادبی شخصیت

آج کی ادبی دنیا میں ان سے کون واقف نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ایک چلتی پھرتی لائبریری اور علم وادب کے انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتنے ہی صاحبان علم ان سے فیض حاصل کرتے ہیں اور یہ بڑی محبت، خوش اخلاقی اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہر موضوع پر اور ہر لمحے گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جمالیات کی حلاوتی زیادہ ہے کہ یہ محبت، خوش اخلاقی اور مسکراہٹ خصوصی طور پر صنف نازک کے لیے بڑی فراخدلی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

استاد کی جو تعریف ہم نے پڑھی، سنی اور اپنی طالب علمی کے زمانے میں دیکھی تو وہ یوں تو اب عام طور پر عنقا ہوگئی ہے مگر ابھی بھی پچھلی شرافت اور علمیت کے جو چند نمونے پائے جاتے ہیں ان میں خصوصاً کراچی میں تو سرفہرست انہی کا نام نظر آتا ہے۔

اپنی ساری عمر درس وتدریس میں گزارنے اور عمر کی تقریباً اسی دھائیوں تک پہنچنے کے باوجود علم کی طلب ورسد میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ طلب کا عالم تو یہ ہے وہ آج بھی نئی کتابوں کی دکانوں ومیلوں اور پرانی کتابوں کے بازاروں وٹھیلوں پر کھڑے نظر آئیں گے۔ یہی نہیں کہ کتابیں صرف الٹ پلٹ کر رکھ دیں بلکہ بڑی تعداد میں خرید کرلے جاتے ہوئے۔ اسی لیے گھر کی تنگ دامنی کی وجہ سے ایک جگہ کرائے پر بھی حاصل کی ہے مگر وہاں بھی اب عالم یہ ہے کہ وہ لائبریری کے بجائے کتابوں کا گودام نظر آتا ہے جس میں بمشکل آرام سے بیٹھنے کی جگہ مل سکے گی۔

اب آپ سوچنے کہ جس ذخیرہ علم کی وسعت جگہ کی تنگی کا سبب بنتی ہے وہی سارا علم اس چھوٹے سے دماغ میں بھرتا چلا جاتا ہے، لیکن اس کی طلب باقی رہتی ہے، اور کہا گیا ہے کہ علم کو خرچ کرنے سے اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے۔ تو یہ حضرت جس طرح علم کے دلدادہ ہیں۔ چاہے اس کے لیے رقم کسی بھی طریقے سے حاصل کی جاسکے، اسی طرح اس کے خرچ میں

بھی بڑے فراخ دل ہیں۔

بیوی، بچے سب مطمئن اور خوش حال ہیں اور یہ صبح کے نکلے ہوئے رات کے کسی حصے میں شاید صرف سونے کے لیے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر سے غیر حاضری کا یہ وقت یونیورسٹیوں، کالجوں اور علمی و ادبی مراکز میں گزرتا ہے۔ جہاں یہ آپ کو کسی کی علمی پیاس بجھاتے نظر آئیں گے، کسی سے ادبی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں گے یا فروغ علم و ادب کے کسی پروجیکٹ کی پلاننگ میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہوں گے اور بہت سے ادیب و شاعر خصوصاً نوجوان ان کے گھیرے ہوئے ہوں گے۔

مذہب، اخلاق، سیاست، سرمایہ و محنت، جسم و جاں کی آمیزش اور آویزش اور دائرہ دائرہ پھیلتا ہوا معاشرتی عمل ان کی فکر اور گفتگو کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جو دعوت فکر دیتے ہیں۔

ان کی آواز میں شائستگی کے ساتھ بنی نوع انسان کے غموں پر دکھ ملتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی آواز نہیں ہے۔ یہ بے خوف اور بے لاگ آواز ہے۔ یہ جملے میرے نہیں بلکہ اردو کے ایک مستند استاد، ادیب اور نقاد کے تحریر کردہ ہیں جس نے ان کی شاعری کو مہذب، مرتب اور سوچتی ہوئی شاعری قرار دیا ہے، اور اردو کے ایک بین الاقوامی شاعر نے اسے تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق اور ادب میں ایک معتبر اضافے کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے۔ یہ مقام، یہ رتبہ بلند اور عظمت و بڑائی انہوں نے بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ جس کے بارے میں انہوں نے خود کہا ہے:

مرے لہو کو، میری خاک ناگزیر کو دیکھ
یوں ہی سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

اپنے کنبے کی کفالت کے بعد علم و ادب کے اس عاشق نے اپنا تن، من اور دھن سب کچھ علم و ادب کے فروغ کی خاطر وقف کر دیا ہے اور اپنی ذات سے بے بہرہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ آج سے تقریباً ۲۳ سال پہلے ایک شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک ان کی آواز تو ادبی دنیا میں گونج رہی ہے اور خبریں، بیانات و تصویریں تو اخبارات و خبرناموں کی زینت بن رہے ہیں مگر ان کی علمی و ادبی تحریریں خال خال ہی نظر آتی ہیں کیوں کہ اس کے لیے اپنی علمی، ادبی اور

بقیہ ص ۲۵۷ پر

مرزا عاصی اختر

زاہد راکلوی مرحوم

آسمان ادب کا ایک اور درخشندہ دور افق میں ڈوب گیا۔ زاہد راکلوی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ ذیابطیس کے مرض میں مبتلا تھے۔ اس موذی مرض کی وجہ سے ان کے داہنے پاؤں کی ایڑی کا دوبار آپریشن ہوا۔ یہ سخت پرہیزی کا اثر تھا کہ وہ دوبار اس موذی مرض کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ آخر عمر میں ان پر بیماری کا شدید حملہ ہوا جو غشی کے دوروں کی صورت اختیار کر گیا۔ بعد میں خاصا افاقہ بھی ہوا، غالباً سنبھالا لینا اسی کو کہتے ہیں۔ آخر کار ۱۶ اپریل ۲۰۰۹ء کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ جو بادہ کش ہیں پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔

کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

زاہد راکلوی نظم ونثر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی طنزیہ مزاحیہ نظمیں 'راہبر بیگم' 'ایک سیاسی دانشور' 'امریکہ کا پیغام، مسلم نوجوان کے نام' ظریفانہ شاعری میں خوبصورت اضافہ ہیں۔ راہبر بیگم میں میاں بیوی کے منظوم مکالے نظم کی جان ہیں۔ جدید تہذیب کی خرابیاں سود کے ہولناک نتائج اور حصول زر میں ناجائز ہتھکنڈوں کا استعمال دیکھنا ہو تو یہ نظم ضرور پڑھنی چاہیے۔

فروغ ادب میں ان کا کردار مستقبل کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ وہ میرپور خاص کے نمائندہ اور سینئر ترین شاعر تھے۔ میرپور خاص کو علم وادب کا مرکز بنانے میں ان کا کردار بنیادی نوعیت کا تھا۔ قاران کلب میرپور خاص کے زیر اہتمام ادبی تقاریب اور مشاعرے بھلا کون بھول سکتا ہے۔ معروف ادبی شخصیت جناب بشیر عنوان تجزیہ کرتے ہیں کہ مرحوم تمام ادبی تقاریب میں مستقل مزاجی اور پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر احمد نصیر کہتے ہیں کہ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ میرپور خاص کے کس شاعر وادیب کی شرکت ادبی تقریبات میں کتنی ہے، اعداد وشمار جمع کرنے پر

معلوم ہوا کہ مرحوم زاہد رانگوی کی سال بھر میں صرف ایک ناغہ تھا۔

زاہد رانگوی عجز و انکسار پیکر تھے۔ جونیئرز کا بہت احترام کرتے تھے۔ پروفیسر یعقوب خاور اس حوالے سے ایک واقعہ اکثر بیان کرتے ہیں۔ ان ہی کی زبان سے سنیئے۔

زاہد رانگوی نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل کا آغاز اس خوبصورت مطلع سے کیا

آپ ہے اماں تعریب اور کیا ہے زوال کی تعریف

غزل کا ہر شعر مرصع تھا زاہد رانگوی صاحب ہر شعر پر داد سمیٹ رہے تھے۔ ایک اور شعر یوں تھا۔

جب تلک ذہن میں جواب آئے کرتے رہیے..... تعریف

ہر شعر پر زبردست داد.......... جب مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ان سے کہا ''اگر مصرع اولا میں 'جواب آئے' کی جگہ 'جواب اترے' ہوتا تو میری ناقص رائے میں بہتر ہوتا''۔ زاہد رانگوی نے مسکراتے ہوئے جیب سے غزل کا پرچہ نکالا اور آئے کو کاٹ کر اترے کر دیا۔

زاہد رانگوی مثبت طرز فکر کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اصلاحی رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ محبت، حسن سلوک، حب الوطنی اور اسلام سے وابستگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہیں ہر ماہ بے شمار رسائل و جرائد موصول ہوتے تھے اور وہ بڑی پابندی سے ہر ایک کو رسید بھیجتے تھے۔ اگر کسی رسالے میں کوئی پاکستان یا اسلام مخالف تحریر دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک اس کا مدلل و مفصل جواب لکھ کر نہیں بھیجتے تھے چین کی نیند نہیں سوتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک ماہنامے 'نوائے پٹھان' میں پشتو نیشنلزم پر کوئی مضمون شائع ہوا۔ کئی دنوں تک ان کے دل آزار اقتباسات احباب کو سناتے رہے اور آخر کار شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد اس کا مدلل جواب لکھا جو ان کے جذبہ ایمانی کی مکمل تفسیر تھا۔ یہ مضمون مذکورہ ماہنامے میں قسط وار چھپا۔ اسی طرح ماہنامہ 'الانسان' کراچی میں بانی پاکستان محمد علی جناح سے کسی نے غلط سلط باتیں منسوب کیں اور نظریہ پاکستان کی غلط تاویلات پیش کیں۔ حسب عادت انہوں نے فل اسکیپ کاغذ کے دس صفحات لکھے، حالانکہ سخت گرمی اور بار بار کی لوڈ شیڈنگ نے لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا مگر وہ

دہن کے پکے تھے۔ یہ غالباً انتقال سے کچھ ہفتے پہلے کی بات ہے بیماری نے انہیں بالکل نحیف وزار کر دیا تھا مگر واورے جذبہ ایمانی اس عالم میں اپنا مسلسل ومدلل جواب لکھا جو فرائیڈے اسپیشل میں بالاقساط چھپا۔

رنگِ سخن جیسا کہ آغاز مضمون میں عرض کیا کہ زاہد رانکوی نظم ونثر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی نظم...... دانشور جیسا کے نام سے ظاہر ہے ایک سیاسی نظم ہے اور ایسے سیاسی دانشوروں کے لیے ایک آئینہ ہے جو مال وزر کو ہی دنیا کی سب سے قیمتی متاع گردانتے ہیں۔ اور ملک وملت جن کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نظم کے کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک دانشور ہے جن کے نام کی سب کو خبر
وقت کے نباض ہیں عق...... ...... کر
تبصرے حالات پہ ہوتے ہیں اکثر ان کے گھر
ملک کے اونچے سیاسی رہنما و اہلِ زر
مشورے کے واسطے آتے ہیں اپنی کار پر
گو کہ میں قلاش ہوں مفلس ہوں اور نادار ہوں
علم کا لیکن ہوں طالب جہل سے بے زار ہوں
فیض بخشِ علم ہو کوئی تو خدمت گار ہوں
چل کے پیدل ہر جگہ جانے کو میں تیار ہوں
آگہی کا شوق لے آیا تھا مجھ کو بھی وہاں
مختصر دانش صاحب موصوف رہتے تھے جہاں
رنگ پہ تھی بزم ان کی میں وہاں موجود تھا
دیکھتا آیا ہوں کہ ہے جو بھی وہاں بیٹھا ہوا
ان کے اس مضمون پہ جو اخبار میں کل تھا چھپا
دے رہا ہے داد بڑھ چڑھ کر اچھل کر برملا

واہ کیا تحریر تھی کیا خوب تھا زور دلیل
کر دیا ننگا مخالف کو ہوا کتنا ذلیل
پیش نذرانہ میں کرسکتا نہ تھا شایان شاں
کوئی تحفہ لے کے جاتا استطاعت تھی کہاں
میرا آنا جانا جب حد سے بڑھا ان کے یہاں
ایک دن جھنجھلا کے وہ کہنے لگے دیکھو میاں
مجھ سے جو بڑھ کر ہو کوئی صاحب علم و خرد
صرف میں ملتا ہوں اس سے ان کی کرتا ہوں مدد
سن کے یوں گویا ہوا پھر میں بھی اے شیریں مقال
آپ نے جو کچھ کہا میرا بھی ہے یہ ہی خیال
آپ کو سمجھا تو میں اپنے مقابل کہاں
.... میں اس لیے آیا نہیں میری زوال
پہلے جس کی تھی مری فرط حقیقت سے جبیں
اب نہ اس کبھی آؤں گا رکھیے گا یقیں
عرض کرتا ہوں یہ آخر میں بصد حسن ادب
آپ وہ ہرگز نہیں ہیں جس کی ہے مجھ کو طلب
دولت و شہرت کے چسکے میں یہ شغل روز و شب
بن گیا ہے عصمت خامہ کے لٹنے کا سبب
علم و عیاری میں کتنا فرق ہے ...... ہے آج

....

اسی طرح کشمیر پران کی معرکہ آرا نظم اب وادیٔ کشمیر میں اک حشر بپا ہے اہل کشمیر کے حق خودارادیت کی تائید کرتی ہوئی منظر کشمیر کو اجاگر کرتی ہے۔ چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

قائد کو وطن مل گیا لیکن رہے مغموم

تھی کیونکہ انہیں تنگی حالات یہ معلوم
تن پایا وطن کا رہے حلقوم سے محروم
کشمیر کو شہ رگ سے وطن کی کیا موسوم
ادنی سا اشارہ ہے معانی کا سمندر
ذی فہم مگر اس کو سمجھ سکتے ہیں بہتر
ہے کرفیو دن بھر کا یہ حیلہ تراشی
لوگوں کے ہیں ناگفتنی حالات معاشی۔
بندوق کی آواز سے ہے سمع خراشی
آنکھوں سے اڑی نیند سکوں دل کا لٹا ہے
اب وادی کشمیر میں اک حشر بپا ہے
واللہ وہ ابلیس کا ہے یار وفادار
ہوسکتا ہے سب کچھ وہ مسلماں نہیں ہتھیار
تسلیم جو کرنے کو یہ ہرگز نہیں تیار
پاؤں میں اگر مسلم غربی کے چبھے خار
ہو اس کی چبھن مسلم شرقی کے جگر میں
یہ رشتہ ایماں ہے محمد ﷺ کی نظر میں

ان کی رجزیہ نظمیں جہاد افغانستان کے زمانے میں پہاڑوں پر قائم مجاہدین کے خفیہ ریڈیو اسٹیشن 'صدائے افغانستان' سے نشر ہوتی تھیں جن پر زاہد صاحب کو بہت فخر تھا۔ ایک بند پیش خدمت ہے۔

دست عدو بڑھا تو کلائی مروڑ کے
لوٹا دیا ہے آخرش پنجے کو توڑ کے
دیکھا نظر اٹھا کے نہ رخ اپنا موڑ کے
غاصب کو بھاگتے بنی میدان چھوڑ کے

اب آتے ہیں ان کی غزلوں کی طرف۔غزل میں وہ خواجہ الطاف حسین حالی کے مقلد نظر آتے ہیں۔وہ حالی جو نظم جدید میں نظر آتے ہیں اور مقصدیت اور سادگی جس غزل کا طرز امتیاز ہے۔یہ غزل دیکھئے۔

نکتہ چیں نکتہ گیر ہے ہر شخص
ناقد بے نظیر ہے ہر شخص
مختلف ہے اگر چہ ذوق طلب
خواہشوں کا اسیر ہے ہر شخص
ڈھال لیتا خود کو حرفوں میں
کس تیقن سے بات کرتا ہے
جیسے روشن ضمیر ہے ہر شخص
قوت فیصلہ مری ہی
اور تیرا مشیر ہے ہر شخص
ہے یہ تیری کمان لب کا کمال
بزور نوک تیر ہے ہر شخص
بزم زاہد میں بیٹھنے والا
رشک اہل سریر ہے ہر شخص

زاہد راکموی کا کلام قدیم وجدید رنگ کا خوبصورت امتزاج ہے۔وہ ایک کثیر المطالعہ شخص تھے۔کلاسیکی شاعری کے بھرپور مطالعے نے ان کی غزلوں میں ایک نیا پن پیدا کر دیا تھا ان کی یہ خوبصورت غزل دیکھئے۔

وہ شہر پرفتن سے اٹھا لے گیا مجھے
صحرا میں بہر حفظ و بقا لے گیا مجھے
تلقین اعتدال جو حد سے بڑھی تری
جذبوں کا سیل تند بہا لے گیا مجھے

دیتا رہا میں حوصلہ رہبر کو بار بار
وہ سخت مرحلوں سے بچا لے گیا مجھے
کس بات پر خفا تھا یہ مطلق رہا نہ یاد
شکر خدا وہ خود ہی منا لے گیا مجھے
خوش کن تھا اس کا دھیان کہ آیا وہ دفعتہً
یادوں سے اپنی گر کے جدا لے گیا مجھے
جانا کہیں تھا راہ میں زاہد جو مل گیا
وہ بزم اہل صدق صفا لے گیا مجھے

ادبی دنیا کے اکثر اخبارات، رسائل میں زاہد صاحب کی نگارشات شامل ہوتی تھیں چند نام جو ذہن میں آرہے ہیں: قدریں، دنیائے ادب، اخبار جہاں، سفیر اردو، قاران، محمد آئین، افکار، انشا، تحریر، شاعری، روایت، عبارت جب کہ اخبار میں جسارت، نوائے وقت، جرات، امت اور دعوت دہلی شامل ہیں۔

ہم عروض کی فنی باریکیوں سے واقف تھے اور پنے جناب مجاز جدپوری مرحوم کے بعد علم عروض کے واحد رمز شناس تھے۔ اکثر بعد نماز مغرب احباب جمع ہوجاتے علمی وادبی مسائل پر گفتگو ہوتی اور ہر شخص فن کے اسرار ورموز پر اپنی اپنی آراء پیش کرتے۔ مگر زاہد راکوی کی رائے حرف آخر ہوتی تھی جس کی وجہ ان کا مدلل انداز بیان تھا۔ اب یہ محفلیں سونی سونی سی لگتی ہیں کیونکہ رشخص سخن ور کا دعویٰ ہے افسوس ان میں کوئی زاہد راکوی نہیں۔

مشہور ترین مصنف وانشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد کے صد سالہ یوم وفات کے موقع پر
دو روزہ عالمی سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ

آزاد صدی مقالات

ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی زیر نگرانی
شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے شائع ہوگیا ہے

مہ جبین قیصر

تاجدار عادل

تہذیبی اقدار کا نمائندہ

بکھرے ہوئے gray بے ترتیب بال، نطشے کٹ مونچھ، ڈھیلی ڈھالی پینٹ شرٹ، ناک پہ دھری موٹے lenses کی عینک جس سے جھانکتی سرخی مائل ذہین آنکھیں، کبھی چہرے پہ مسکراہٹ کبھی مدبرانہ سنجیدگی، اردگرد سے بے نیاز کاموں میں منہمک، کبھی حاضر کبھی غائب۔ اس پروقار شخصیت کے مالکانہ حقوق تاجدار عادل کے پاس ہیں۔ ہم نے تاجدار کے بطون میں ایک مخلص، ہمدرد، اور محبت سے بھرپور انسان کو پایا۔ ان کا تعلق اس سرزمین سے ہے جسے اکبرآباد کہتے ہیں۔ اور ہم اسے 'محبت آباد' کہتے ہیں۔ جہاں میر و غالب رہتے ہیں۔ جہاں کی فضاؤں میں محبت رقص کرتی ہے، جہاں کی ہوائیں پیار کے گیت الاپتی ہیں، جو دیوتاؤں کی سرزمین ہے، جس کی یادگار تاج محل ہے، جہاں سے علم کے سوتے پھوٹتے ہیں اسی سرزمین پر حضرت صبا اکبرآبادی کا جنم ہوا، اسی سرزمین کی مٹی کو محبت سے گوندھ کر تاجدار عادل کو مجسم کیا گیا۔ تاجدار عادل کو فن شاعری اپنے والد صبا اکبرآبادی سے ورثے میں ملا۔ تاجدار اپنے شعری مجموعے 'مات ہونے تک' میں خود اپنی محبتوں کی دلیل دیتے ہیں کہ:

> "شاعری میرا مزاج ہے، اور محبت میرا خمیر اور میرا راستہ میرے جذبے نے اس طرح تراشا ہے کہ اس کی کوئی حد میرے سامنے نہیں، میں یہ تو جانتا ہوں کہ بچپن کے ان لمحوں سے جب ساری دنیا خواب کی طرح نظر آتی ہے اور ہر بات حیرت انگیز لگتی ہے مجھے اس راستے پر چلنے کی خواہش رہی جس پر میں نے اپنے والد کو چلتے دیکھا اور میری تربیت گاہ میرا گھر ہے جہاں سے مجھے سچائی کی، خیر کی، نیکی کی، حسن سلوک کی آگ کو روشن کرنے کی، چراغ بننے کی، روشنی کی طرح پھیلنے کی اور محبت کرنے کی تلقین ہوئی"۔

تاجدار عادل میڈیا سے منسلک رہے، اور بہ یک وقت پاکستانی ٹیلی ویژن اور پاکستانی ٹیلی

ویژن نیشنل کے جنرل منیجر کی حیثیت سے بہ طریق احسن فرائض منصبی کی انجام دہی کے بعد ابھی تازہ تازہ ریٹائر ہوئے ہیں۔ آج کل وہ کس صحرا پیمائی میں مصروف ہیں معلوم نہیں کہ ابھی بلی تھیلے سے باہر نہیں آئی۔

تاجدار عادل نہ صرف اپنے دوست احباب سے مخلص ہیں بلکہ وہ اپنے ادارے سے بھی ہمیشہ مخلص رہے، اپنے فرائض منصبی کو خوش اسلوبی سے نبھانے میں سرگرداں رہے۔ 'نیلام گھر' سے 'کیفے ادب' تک ہر پروگرام کے سیٹ پر خود بہ نفس نفیس موجود رہ کر تیاریوں کی نگرانی کرتے، کاموں کے پایہ تکمیل تک ان کے چہرے پر ایک جنونی تناؤ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہی خوش اسلوبی اور ذمہ داری انسان کو کمال کی حدوں تک پہنچاتی ہے۔ ان کی اس حد درجہ مصروفیت سے اکثر ملنے والے شاکی بھی رہے۔ تاجدار باوجود شدید مصروفیت کے اپنے دوست احباب، ملنے جلنے والوں کا دل نہیں توڑتے بلکہ اگر کوئی ملنا چاہتا تو بڑی محبت وخلوص سے اسے آنے کی دعوت دیتے اور آنے والے کو انتظار کی بھٹی میں جھونک کے خود مصروف ہو رہتے، اُس دورانیے میں جونہی خیال آتا تو تالیف قلب کے لیے ایک آدھ بات کر کے پھر غائب۔ آپ اسے ان کی ادا کہیں، افسرانہ شان، یا ذمہ داری...... ہم ادائے بے نیازی کہتے ہیں۔ ہم خود بھی ان کی اس درجہ مجنونانہ اور ذمہ دارانہ کیفیت کا شکار ہو چکے ہیں مگر ہم نے برا نہیں مانا۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ بے مثال انسان اور دوست ہیں، ایک بار ہم کام سے ان کے پاس گئے، انہوں نے دیکھتے ہی والہانہ استقبالیہ جملے کہے، ہم بیٹھ گئے وہ قلم وکاغذ میں گم ہو گئے۔ انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے ہم نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا، شیلف پر رکھی تمام کتابوں کے نام یاد کیے، مگر وہ ویسے ہی مصروف رہے۔ چنانچہ ہم نے اُکتا کے ان سے اجازت چاہی انہوں نے قلم رکھا اور بڑی محبت سے بولے ارے ابھی کہاں، بیٹھئے ابھی آپ کو اچھی سی چائے پلواتا ہوں مگر ہم ان کی مجبوری سمجھ گئے چنانچہ پھر آنے کا وعدہ کر کے ہم نکل گئے۔ مجھے ایسے لوگوں سے شکایت نہیں ہوتی بلکہ ان پر رشک آتا ہے، کاش! ہمارے ملک کا ہر شہری اتنا ہی ذمہ دار اور sincere ہو جائے تو یہ خطہ ارضی کیوں نہ جنت کہلائے۔

تاجدار عادل بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ 'مات ہونے تک' بہت مقبول ہوا اس

کے اب تک دس ایڈیشن آ چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں ہمیں نہ تو کوئی فلسفیانہ نکتہ نظر آیا نہ ہی جدید حسیت کے دردناک عذاب۔ اگر نظر آیا تو ہجر و فراق کی غم اندوہ کی بیماریاں جو انہیں دوران عشق لاحق رہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے امتحان عشق اور پھر اس کے نتیجے آنے تک کے حالات جو ان پہ گزرے سادگی اور سچائی سے بیان کر دیا یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ سترہ سال کے نوجوان سے لے کر اسی سال کے بوڑھوں تک بے حد مقبول ہوا۔ یہ کتاب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر فتح محمد ملک اور محمد علی صدیقی کی آرا سے آراستہ ہے۔ ہمیں اس کتاب میں جو سب سے زیادہ پسند ہے وہ حضرت صبا اکبر آبادی کا خط بہ نام تاجدار عادل ہے اس لیے کہ یہ خط نہیں دستاویز ہے، صبا صاحب نے اس 'میثاق عشق' میں دس نکات پیش کیے ہیں کہ بیٹا!! اگر تم ان تجاویز پر عمل کرو گے تو بہتر نہیں بہترین شاعری تخلیق کر سکو گے، یہ دستاویز ہمارے نزدیک اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ صرف ایک بیٹے کے لیے نہیں بلکہ یہ ہر مبتدی کے لیے سود مند ہے۔ یہ تربیتی سبق ہے۔

'مات ہونے تک' ہم اپنی جواں سالی سے بڑھاپے تک پڑھتے آ رہے ہیں ہمیں اس میں دو لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے جو اب 'خاتون' بننے کے بعد یقیناً نانی، دادی کے مرتبے پر فائز ہو چکی ہوں گی۔ انہوں نے پہلی بار ایک چھتنار درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بساط عشق بچھائی اور وہیں سے مات کھا کے اٹھے اور کہا:

گواہ تھا جو ہماری تمہاری چاہت کا
شجر وہ اب بھی وہاں ہے اور اب نہیں کوئی
میں نے پہلے کہہ دیا تھا اور تم مانیں نہیں
میں نے جو تم سے کہی ہر بات وہ سچی ہوئی

ہمیں یقین نہیں کہ تاجدار عادل نے کچھ کہا ہوگا اگر کہا ہوتا تو وہ یوں کسی دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے کیوں چلی جاتیں، وہ دل کی نگری سے کیا وہ تو ملک ہی چھوڑ گئیں اور تاجدار عادل اس ملال اور دکھ کو دل سے لگائے صحرا صحرا جنگل جنگل پکارتے رہے۔ اور اسی مسافت کے دوران انہیں پھر کوئی چہرہ نظر آیا اور چہرہ بھی ایسا کہ پہلی کو بھول کر کہہ اٹھے:

اس کو دیکھا تو سوچتا ہی رہا
خواب نے واقعہ تراشا ہے

چھپا رکھا ہے جو دل میں وہ چل کے کہہ دو اب
بہت ہی سوچ رہے ہو اٹھو نہ سوچو اب

پتہ نہیں تاجدار نے کچھ کہا بھی یا پھر سوچتے ہی رہے حالانکہ سوچنے کے عمل سے زیادہ کہنے کا عمل تیز ہونا چاہیے اگر علامہ اقبال صرف سوچتے ہی رہتے تو آج پاکستان کا وجود نہ ہوتا۔ بہرحال اس دوسری والی کے بارے میں تاجدار جانتے ہوں گے کہ وہ کس دیس سدھاریں۔

تاجدار عادل نے مات کھانے کے بعد اتنی طویل خاموشی اختیار کی کہ ہم سمجھے کہ تاجدار نے اپنا قلم و خیال اپنی دونوں محبوباؤں میں سے کسی ایک کو آخری تحفہ کے طور پر اس کے جہیز میں رکھ دیا..... مگر چند ماہ پہلے ہم نے ان کے ایک دیرینہ دوست صفدر علی خان کے سہ ماہی 'انشا' میں ایک اشتہار دیکھا 'تاجدار عادل کا نیا مجموعہ'' اس کے نام'' جلد آ رہا ہے۔ ہم چونک اٹھے کہ دونوں میں سے کس کے نام..... اس ضمن میں ہمیں ایک سچا واقعہ یاد آ گیا، یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ہمارے میاں قاضی قیصر الاسلام ریڈیو پروگرام کرنے جایا کرتے تھے اور ہم ان کے ساتھ زندہ جاوید اداکاروں کو دیکھنے کے شوق میں جاتے تھے وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی جس میں سلطان جمیل نسیم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک دن ایک خاتون پروڈیوسر نے ہمیں ایک پرچہ دے کر کہا 'ایک شاعر نے مجھ پر غزل کہی ہے' ہم نے بہت شوق سے اسے پڑھا اور شاعر کو پہچان بھی گئے نام دینا ہم ضروری نہیں سمجھتے کہ اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں۔ بہرحال کچھ دیر بعد وہ بولیں 'تم اب تک پڑھ ہی نہیں چکیں؟' اس غزل میں سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کی تعریف تھی مگر غزل اور ان خاتون میں کہیں سے مماثلت نہیں تھی، چنانچہ وہ غصے میں پرچہ چھین کے چلی گئیں مگر جب کھانے پر کئی خواتین آرٹسٹ وغیرہ ساتھ بیٹھیں تو ہماری رگ شرارت پھڑکی اور ہم نے سب کو مخاطب کر کے کہا ان محترمہ پر ایک شاعر نے غزل کہی ہے اور اس کے دو شعر بھی سنا دیے۔ آپ یقین کریں سب نے اپنے پرس سے اسی غزل کی فوٹو نکال کے سامنے رکھ دی

اور ہر خاتون اس بات پر مصر تھی کہ یہ غزل اسی پر کہی گئی ہے۔ اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہ عورتیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں خوش ہوتی ہیں۔

تاجدار عادل کی ذہانت کے ہم ہمیشہ قائل رہے اس لیے کہ بغیر ذہانت کے مقبول اور طویل عرصے تک کسی پروگرام کو نہیں پیش کیا جاسکتا۔ تاجدار نے نہ صرف پی ٹی وی پر اپنی ذہانت کے سکے بٹھائے بلکہ اس کے نام 'کتاب' کا نام رکھ کر کے ذہانت کا ثبوت دیا ہے، جس کا دل چاہے جا پنچے اور لے جائے، اصل مسودہ تو تاجدار کے دل میں ہے۔

جب بھی صفدر علی خان سے ہماری بات ہوتی ہے ہم تاجدار کو شرارت سے مولانا کہتے ہیں، وہ اس لیے نہیں کہ عشق مجازی کی منزلیں طے کرتے ہوئے عشق حقیقی میں گم ہو کے حمد و نعت کہنے لگے ہیں بلکہ حمد و نعت بھی انہیں والد سے ورثے میں ملی ہے وہ اپنے والد صبا اکبر آبادی کے نقش قدم پر چلنے کے ہمیشہ خواہش مند رہے۔ دراصل ان سے خواتین ہمیشہ شاکی رہیں کہ وہ تو لفٹ ہی نہیں کراتے متعدد بار یہ بات ہم خود خواتین سے سن چکے چنانچہ ہم نے اسی بنا پر مولانا کا خطاب دیا تھا ورنہ ہم تو مولاناؤں سے چالیس قدم دور چلتے ہیں، مولانا ہونے کا ہمیں ایک معتبر حوالہ بھی مل گیا۔ ایک بار ہم تاجدار سے ملنے گئے موصوف کا دور دور پتہ نہیں چنانچہ ہم ان کے پی اے کے پاس بیٹھ گئے کہ اتنے میں ایک معروف اداکارہ آ گئیں ہم نے انہیں حیرت سے دیکھا ان کے کپڑے ٹیلر نے ان کے جسم پر ہی سی دیے تھے، دوپٹہ پٹی کی طرح ایک کندھے پر جھول رہا تھا، چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی کہ کمرے میں بیٹھے صاحب نے مخاطب کیا' کیا بات ہے پریشان نظر آ رہی ہو؟' وہ بولیں' یار کوئٹہ سے ایک ڈرامہ پیش کیا جانے والا ہے اور میں اس میں مرکزی رول کرنا چاہ رہی ہوں مگر پروڈیوسر نہیں مان رہا ہے'۔

صاحب نے ٹھنڈی آہ بھری، ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولے' تم اتنی خوبصورت ہو اور تمہاری فیگر......ایسی تو کسی کی نہیں ہے پتہ نہیں الو کا...... کیوں نہیں مان رہا'۔

وہ بولیں' بس اوپر کی سفارش چاہیے'۔

وہ صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے' تم تاجدار عادل سے کہلوا دو'۔ تاجدار عادل کا نام سنتے ہی لگا جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو وہ بھنا کے بولیں' تم نے بھی کس کا نام لیا ہے وہ بھی نظر اٹھا

کے دیکھتے تو ہیں نہیں۔ تم کسی اور کا نام بتاؤ۔ ہمیں تو ان سے بھی اور ان کے کمرے سے بھی ڈر لگتا ہے۔

چنانچہ اس پکے ثبوت کے بعد ہم تاجدار کو شرارت سے نہیں بلکہ محبت اور عقیدت سے مولانا کہنے لگے...... تاجدار سے ہماری دوستی کو چھتیس سال ہو گئے مگر یقین کریں کہ ان چھتیس سالوں میں ہماری ملاقات صرف چھتیس منٹ کی ہی ہوئی ہوگی اگر اسے ہم سالوں پر تقسیم کریں تو فی منٹ سال پڑا۔ مگر ہم پھر بھی کہیں گے کہ تاجدار عادل سا پیارا انسان، محبت و مروت اور خلوص کا پیکر۔ ایک بہت پیارا شاعر دوست ہے۔ ہمیں اعتراف کرنے دیں کہ اس سے بہتر دوست، ساتھی اور رفیق کوئی نہیں۔

بقیہ: کراچی کی ادب —

سماجی معروفیات میں سے وقت نکالنا ان کے لیے بہت دشوار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ظلم وہ اپنے ساتھ ہی نہیں بلکہ ادب کے ساتھ بھی کر رہے ہیں اور آنے والے محققین کے لیے کوئی بہت بڑا اثاثہ چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں۔ جس پر ان کے علاوہ ادبی دنیا کو بھی غور کرنا چاہیے۔ اور اس کا کوئی حل نکالنا چاہیے۔

بہر حال آج ان کی شخصیت ادبی دنیا میں کراچی کی ایک پہچان ہے اور ان کی موجودگی کسی ادبی [illegible]یب کی کامیابی کی ضمانت۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام تر اختلافات اور بحیثیت انسان ان کی [illegible]یوں کے باوجود کراچی والوں کو ان پر ناز ہے یہی وجہ ہے کہ کراچی کے ادبی و ثقافتی مرکز آرٹس کونسل پاکستان، کراچی کے انتخابات میں پچھلے کئی سالوں سے وہ مسلسل نمایاں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی فعال اور معروف شخصیت ہی کی وجہ سے آرٹس کونسل پچھلے دو بار سے عالمی اردو کانفرنس کامیابی سے منعقد کر رہی ہے۔

آخر میں اس نامور شخصیت کو میں سلام پیش کرتا ہوں اور ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔

محمد راشد شیخ

یاد استاد مہرباں

مولانا عبدالعلیم ندوی۔ چند یادیں چند باتیں

تاریخ پیدائش: ۷ دسمبر ۱۹۲۲ء جھپور   وفات: ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء، حیدرآباد

جو انسان اپنی تعلیمی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرتا ہے ان اساتذہ میں سے بعض کی یاد تلخ، بعض کی شیریں اور بعض کی لوح دل پر انتہائی گہری ہوتی ہے۔ عموماً تلخ یادیں ان اساتذہ سے وابستہ ہوتی ہیں جو علم کی ترویج کے بجائے محض وقت گزاری یا طلبہ کو سزا دینے سے واسطہ رکھتے ہیں جبکہ شیریں یادیں ان اساتذہ سے وابستہ ہوتی ہیں جو اپنے حسن اخلاق، اعلیٰ کردار، نظم و ضبط، صفائی پسندی اور بذلہ سنجی سے لوح دل پر پائیدار نقش قائم کرجاتے ہیں۔ راقم الحروف کو بھی اپنی پوری تعلیمی زندگی میں ایسے ہی اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان حضرات کا تعلق علامہ اقبال ہائی اسکول، لطیف آباد کے دور طالب علمی سے تھا اور دونوں ہی سے دو دو سال تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک تو استاد محترم جناب شمس الدین صاحب ہیں (اللہ تعالیٰ آپ کی عمر، صحت و تندرستی میں برکت عطا فرمائے آمین) اور دوسرے مولانا عبدالعلیم ندوی مرحوم تھے۔

مولانا عبدالعلیم ندوی سے متعلق بعض یادیں تحریر کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیارے اسکول کے بارے میں چند سطور لکھ دوں۔ یہ اسکول لطیف آباد نمبر ۹ اور لطیف آباد نمبر ۶ کی درمیانی سڑک پر واقع ہے۔ یہی سڑک بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، حیدرآباد سے لطیف آباد نمبر پونے دس (محمدی مسجد) تک جاتی ہے۔ اسکول کیا ہے یوں سمجھیں کہ ایک پرانی کوٹھی ہے جس میں مناسب ردوبدل کے بعد اسکول کی شکل دی گئی ہے۔ اس میں چند ہی کلاسیں پکی ہیں جو کسی زمانے میں کمروں کے لیے مستعمل تھے جبکہ بقیہ تمام کلاسیں کچی چھت والی

اور صرف اینٹوں کی دیواروں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ آج سے بیس سال قبل تک (جب راقم اسکول میں زیرِ تعلیم تھا) اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب سید مشتاق علی تھے۔ جو دیانت داری، فرض شناسی اور محنت کی وجہ سے پورے حیدرآباد میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس زمانے میں گوکہ اسکول سرکاری تحویل میں جا چکا تھا (یہ حادثہ ۱۹۷۳ء میں ہوا) مگر مشتاق صاحب کی وجہ سے اسکول خاصا نیک نام تھا۔ مشتاق صاحب کی پوری کوشش ہوتی کہ ہر مضمون کے لیے بہترین اساتذہ اسکول میں موجود ہوں جس سے طلبہ نہ صرف درسی تعلیم حاصل کریں بلکہ کردار کی روشنی بھی حاصل کریں۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ علامہ اقبال ہائی اسکول کی عمارت تو انتہائی سادہ ہے اور یہاں پڑھنے والے طلبہ کی اکثریت تو غریب طبقے سے تعلق رکھتی ہے مگر یہاں تعلیمی معیار اور تربیت کردار کا معیار انتہائی اعلیٰ ہے۔ اب یہ تلخ حقیقت بھی سن لیجیے کہ سیاست دوراں کے کمالات کے نتیجے میں اب لطیف آباد، حیدرآباد میں تعلیمی صورت حال کیا ہو چکی ہے۔ کچھ ہی عرصے قبل جب اس اسکول کے ایک قدیم استاد سے راقم کی ملاقات ہوئی اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں تو راقم نے گزارش کی کہ تب اور اب کے تعلیمی معیار پر تبصرہ فرمائیں۔ اس پر ان استاد محترم نے یہ بلیغ جملہ فرمایا 'جب تم لوگ ہم سے پڑھتے تھے تو ہماری خواہش ہوتی تھی کہ تم جہاں بھی جاؤ اگر کوئی پوچھے کہ کس استاد سے پڑھے ہو تو ہمارا نام لو جبکہ آج جس قسم کے طالب علم آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ اپنے اساتذہ میں ہمارا نام کبھی نہ لیں'۔ یہاں یہ حقیقت بطور تعلی یا خودستائی نہیں بلکہ بطور امرِ واقعہ اور تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کرتا ہوں کہ راقم اپنے ہائی اسکول کی تعلیم کے پانچ سالہ دور (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۱ء) مسلسل کلاس کا مانیٹر رہا اور میٹرک کے امتحان میں پورے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر بھی راقم ہی نے حاصل کیے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی رحمت کے نتیجے میں ہوا۔

یہ تو خیر چند باتیں اپنے اسکول کے بارے میں ہوئیں۔ اسکول کی حکایت لذیذ تھی اس لیے طویل ہو گئی۔ اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف یہ ۱۹۷۸ء کی ایک سہانی صبح تھی راقم بھی علامہ اقبال ہائی اسکول کے ساتویں درجے میں زیرِ تعلیم تھا۔ ابھی کچھ ہی روز قبل نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ کسی ذریعے سے علم ہوا کہ ہمیں عربی اور اسلامیات کے مضامین پڑھانے ایک

مولانا صاحب آرہے ہیں۔ جو اس سے قبل زیل پاک ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ غالباً دوسرے ہی دن مولانا عبدالعلیم ندوی صاحب تشریف لائے لیکن نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ عام مولوی حضرات اوران مولانا صاحب میں بہت فرق ہے۔ یہ سردیوں کے دن تھے مولانا کو جب دیکھا تو ایک جاذب نظر شخصیت بالکل صاف کتھئی رنگ کی شیروانی اور سفید رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس نظر آئیں۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی جسم نہ موٹاپے کی طرف مائل اور نہ ہی دبلا، مونچھیں صفائی سے کتری ہوئی، داڑھی سفید اور نہایت خوبصورتی سے شرعی حدود کے اندر تراشی ہوئی، بال پٹے دار جن میں سفید زیادہ اور سیاہ کم، سر پر صاف ستھری جناح کیپ، پاؤں میں صاف ستھرے جوتے معلوم ہوتا ابھی ابھی پالش کیا ہے۔ ہونٹ پتلے اور خوبصورت، آنکھوں پر ہلکے نیلے رنگ کا خوبصورت چشمہ جس میں سے دو ذہین اور روشن آنکھیں ہر وقت حرکت کرتی نظر آتیں۔ راقم کو پہلی ہی نظر میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا کی صفائی پسندی اور سر سے پیر تک ہر چیز سے نفاست پسندی کا مظاہرہ تھی۔ یہ تو خیر سردیوں کے دن تھے گرمیوں میں بھی مولانا کا لباس عموماً یا تو سفید کڑھا ہوا ململ کا کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامایا ہلکے نیلے رنگ کا خوبصورت شلوار قمیض ہوتا۔ پاؤں میں حسب معمول عمدہ پالش کیے ہوئے جوتے اور سر پر دو پلی ٹوپی ہوتی جو عموماً ندوی حضرات سر پر پہنتے ہیں اور جیسے مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم بھی ہمیشہ پہنتے تھے۔ یہ تو تھا مولانا سے متعلق پہلا تاثر، کیونکہ راقم کلاس کا مانیٹر تھا اس لیے پوری کلاس میں مولانا سے سب سے زیادہ تعلق میرا ہی رہا اور اسی تعلق پر مشتمل یادیں اس مضمون میں پیش کی جارہی ہیں۔

چند روز بعد ہی سید مشتاق علی صاحب نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے مولانا صبح کی دعا (جس میں تلاوت قرآن کے بعد علامہ اقبال کی مشہور نظم 'بچے کی دعا' تمام طلبہ مل کر پڑھتے تھے) کے متعلق مختصر خطاب فرمایا کریں چنانچہ مولانا کے خطاب کا آغاز ہوا۔ اس خطاب کے دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے مولانا کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کی عادت کا پہلی مرتبہ اظہار ہوا۔ اور بعد میں تقریباً روزانہ ہی مولانا کوئی نہ کوئی دلچسپ فقرہ یا کوئی دلچسپ بات کرتے جس سے کلاس میں ہنسی اور مسرت کے شگوفے کھل اٹھتے۔ ہوا یہ کہ دوران تقریر مولانا نے ایک شعر پڑھا جس پر بعض شریر طلبہ نے (جن کی سمجھ میں نہ تو تقریر آرہی

تھی اور نہ ہی شعر آیا بلکہ جو تقریر سے اکتاہٹ اور بوریت محسوس کر رہے تھے) داد دینے کے انداز میں بار بار واہ واہ کہنا شروع کیا۔ مولانا اس حرکت کو سمجھ گئے اور ان شریر طلبہ کو ایسا دلچسپ جواب دیا کہ آئندہ کبھی ان کی ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہاری اس واہ واہ پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ ایک شاعر کو غزل سنانے کے لیے کافی تلاش کے باوجود کوئی سامع نہ ملا۔ اتنے میں اس نے سامنے سے ایک گدھے کو آتے دیکھا۔ چنانچہ گدھے کے سامنے غزل سنانی شروع کر دی۔ غزل مکمل ہوتے ہی گدھے نے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالنی شروع کر دی۔ اس پر وہ شاعر بہت مسرور ہوا اور سمجھا کہ گدھے نے غزل پر داد دی ہے مگر درحقیقت گدھا غزل کے ایک شعر تو کیا ایک مصرع کو بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ تم بھی بالکل اس گدھے کی طرح واہ واہ کرتے ہو جبکہ شعر سمجھے بغیر شعر پر داد دینا بجائے خود ایک احمقانہ حرکت ہے۔ مولانا یہ الفاظ غصے سے نہیں بلکہ دلچسپ انداز سے ادا کیے جس پر تمام حاضرین ہنسنے لگے اور شریر طلبہ کی سبکی ہوئی۔ بعد کے دو سالوں کے دوران معلوم ہوا کہ یہ مولانا کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے کہ ہر محفل میں کوئی نہ کوئی دلچسپ بات ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا کے وقار اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا خراماں خراماں کلاس کی جانب آتے تو طلبہ کے دل دھک دھک کرتے۔ اب اپنی یادوں کے ذخیرے سے مولانا سے متعلق چیدہ چیدہ واقعات تحریر کرتا ہوں جن سے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ایک مرتبہ اسکول میں امتحانات کے دوران ہماری کلاس میں مولانا موجود تھے۔ پرچہ سندھی زبان کا تھا جس کے استاد عاشق صاحب تھے۔ پرچے میں کوئی ایسی مشکل چیز تھی جس کے لیے عاشق صاحب سے معلومات درکار تھیں۔ ایک طالب علم نے مولانا سے گزارش کی کہ عاشق صاحب کو بلائیے۔ اب جیسے ہی مولانا نے عاشق کا لفظ سنا تو ان کی رگ ظرافت فوراً پھڑک اٹھی اور بلند آواز میں فرمایا "عاشق صاحب جلدی آئیے یہاں آپ کے معشوق آپ کو یاد کر رہے ہیں"۔ مولانا کے اس جملے پر نہ صرف کلاس کے تمام طلبہ بلکہ خود عاشق صاحب بھی کافی دیر تک لطف لیتے رہے۔

ایک مرتبہ اساتذہ نے آپس میں رقم جمع کر کے دعوت کا پروگرام بنایا جس میں مولانا بھی

شریک ہوئے۔ ایک صاحب کی ذمہ داری مرغی کاٹنے پر لگائی گئی۔ چھری کچھ زیادہ ہی تیز تھی چنانچہ مرغی کی پوری گردن کٹ گئی۔ اب مسئلہ یہ سامنے آیا کہ پوری گردن کٹی مرغی حلال ہے یا حرام چنانچہ اس بارے میں مولانا سے رجوع کیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ مشکوۃ شریف کی حدیث کے مطابق تو یہ مرغی حلال ہے مگر تم لوگ اگر حرام سمجھ چکے ہوں تو اسے مجھے دے دو، میں اسے حلال سمجھ کے پوری خود کھالوں گا۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

عموماً کلاس میں مولانا یوں تو تمام طلبا کو ایک ہی نظر سے دیکھتے اور سب سے یکساں سلوک کرتے، اگر سزا دینی ہوتی تو سب کو سزا دیتے اور تعریف کرنی ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے لیکن پوری جماعت میں ایک طالب علم ایسا تھا جس کو مولانا نے کبھی سزا نہ دی بلکہ جب سزا پانے والے طلباء کھڑے ہوتے (باقی طلبہ بیٹھے رہتے) تو عموماً اس طالب علم کا نام بھی ان میں شامل ہوتا اور وہ بھی کھڑا ہوتا۔ اس موقع پر مولانا کے چہرے پر ایک خاص ہمدردانہ کیفیت نظر آتی اور اس طالب علم کا نام لے کر اسے بٹھا دیتے اور سزا سے بچا لیتے۔ راقم الحروف گزشتہ تین سال سے یہ سمجھتا رہا کہ یہ طالب علم جس کا نام محبوب تھا مولانا کا حقیقی بھتیجا ہے اور مولانا اس معاملے میں ڈنڈی مار کر اپنے بھتیجے کو ہمیشہ سزا سے بچا لیتے ہیں مگر ابھی چند ہی روز قبل مولانا کے برادر اصغر جناب مظفر لطیف صاحب کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہ طالب علم مولانا کے استاد حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو) کا حقیقی پوتا تھا۔ مولانا حیدر حسن خان کے صاحبزادے مولانا سعد حسن خان، پبلک اسکول حیدرآباد میں استاد تھے۔ محبوب ان ہی کا بیٹا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا عبدالعلیم ندوی کے دل میں اپنے استاد کا کس قدر احترام تھا کہ استاد کے پوتے پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا۔

ایک مرتبہ کلاس میں مولانا تشریف لائے تو بعض طلبہ انگریزی زبان کا سبق Active passive کرنے میں مصروف تھے۔ مولانا نے پوچھا کیا کر رہے ہو تو انہوں نے یہی بتایا مولانا نے ڈانٹتے ہوئے کہا بند کرو اس، اٹھو بیٹھو کو Actvie passive کو اٹھو بیٹھو بنا کر بڑا لطف آیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے گھر کے لیے کام دیا جسے ایک معروف طالب علم کسی وجہ سے نہ کر سکا۔ اگلے روز مولانا نے فرمایا جن لوگوں نے کام نہیں کیا وہ کھڑے ہو جائیں۔ ڈرتے ڈرتے وہ طالب

علم بھی کھڑا ہوا۔ مولانا نے پہلے تو غور سے مجھے دیکھا کہ آج تو یہ مانیٹر بھی کھڑا ہے پھر پر لطف انداز میں فرمایا "بلبل پھنسی، مینا پھنسی، تو کیوں پھنسی ڈوڈو" اس پر کلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

بعض اوقات مولانا کلاس میں اپنے عہد شباب اور دور طالب علمی کے قصے بڑے پر لطف انداز میں بیان کرتے۔ ایک مرتبہ ایسی ہی گفتگو کے دوران ایک طالب علم نے پوچھا "کیا سید سلیمان ندوی آپ کے استاد تھے؟" مولانا نے کڑک کر جواب دیا "سید سلیمان ندوی ہمارے استاد تھے نہیں، ہمارے استاد ہیں"۔ استاد ہیں پر خوب زور دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ فرمایا کہ رزق حلال کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں اپنے قیام دہلی کا ایک واقعہ سنایا۔ دہلی میں مولانا کے ایک دوست تاجر تھے۔ انگریزی عہد میں حکومت نے اعلان کیا کہ مقررہ تاریخ تک جن لوگوں کے پاس ہزار کے نوٹ ہیں، وہ بینک سے بدلوالیں کیونکہ ہزار کا نوٹ ختم ہونے والا تھا۔ مولانا کے یہ دوست ایماندار اور تاجر تھے۔ کسی وجہ سے وہ چند نوٹ بدلوا نہ سکے اور مقررہ تاریخ گزر گئی۔ مولانا سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے اس نقصان پر ان سے افسوس کیا مگر ان تاجر دوست پر ذرا بھی افسردگی نہیں تھی بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ رقم رزق حلال سے حاصل کی ہے، انشاء اللہ ضائع نہ ہوگی۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ رزق حلال کی برکت ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد انگریزی حکومت نے اعلان کیا کہ ہزار روپے والے نوٹ دوبارہ قابل استعمال ہیں۔ اس طرح ان دوست کی رقم ضائع ہونے سے بچ گئی۔

مولانا حافظ قرآن بھی تھے۔ اسلامیات کے پیریڈ میں انبیاء کے قصے بھی شامل تھے۔ اور متعلقہ قرآنی آیات بھی۔ ہر نبی کا قصہ شروع کرنے سے قبل مولانا کافی پہلے سے (عموماً ابتدائے سورۃ سے) تلاوت شروع کرتے اور نہایت خشوع و خضوع سے کافی دیر تک تلاوت فرماتے پھر مکمل قصہ بیان فرماتے۔ ایک مرتبہ جماعت میں ایک طالب علم اسلامیات کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس سبق میں کئی بار حضرت عمرو بن العاص کا ذکر موجود تھا۔ طالب علم ان کا نام عمرو ابن العاص پڑھتا۔ اس پر مولانا نے ڈانٹا اور فرمایا یہ کیا عمرو پھمرو پڑھتے ہو۔ صحیح تلفظ عمرو ابن عاص ہے۔ مولانا جب غصے میں آتے تو بعض اوقات ایسے کلمات بھی زبان سے نکالتے جنہیں تحریر کرنا ممکن نہیں۔

یوں تو مولانا اپنی بذلہ سنجی اور پر لطف گفتگو سے اکثر حاضرین کو محظوظ کرتے لیکن غصے کی

حالت میں مولانا کا جلال عروج پر ہوتا۔ اس موقع پر تمام طلبہ کوشش کرتے کہ خاموش رہیں البتہ جو طالب علم لپیٹے میں آ جاتا اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت بھی ہوتی اور بعض اوقات سخت باتیں بھی سننا پڑتیں۔ بعض اوقات سنجیدہ مواقع پر مولانا ایسی سنجیدہ گفتگو بھی کرتے کہ سب حیران رہ جاتے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف کی والدہ محترمہ علیل تھیں۔ گھر میں بڑے بھائی ہی تھے اس لیے گھر کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا یہاں تک کہ کھانا بھی بازار سے لانا پڑتا ایسے میں لباس اور کپڑوں کی صفائی کا کسے ہوش رہتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر مجبوراً راقم میلی قمیض پہن کر اسکول پہنچ گیا۔ کسی کام سے جب دفتر پہنچا تو مولانا کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے قریب بلایا اور فرمایا کہ تمہاری قمیض کیوں میلی ہے۔ مولانا کے پوچھنے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ گھر کی کیفیت راقم کی کے سامنے آ گئی، آنکھوں میں آنسو آ گئے دل بھر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں میں نے جواب دیا' مولانا میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے گھر پر کوئی اور کپڑے دھونے والا بھی نہیں۔ مجبوراً میلی قمیض پہن کر آ گیا ہوں۔

اس پر مولانا نے نہایت نرمی اور پیار سے فرمایا' بیٹے امی کی طبیعت خراب ہو گئی تو کیا ہوا اب تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ اپنی قمیص خود دھو سکو۔ مولانا کے یہ پیار بھرے الفاظ آج تک کانوں میں گونجتے ہیں چنانچہ مولانا کی نصیحت کے مطابق آئندہ کبھی گندی قمیص پہن کر اسکول نہ گیا۔

ممتاز مصنف اور محیط اردو املا کے خالق جناب محمد اسماعیل کے خاکوں کی کتاب

قلم: میرا دشمن

مکتبہ خوش خیال اردو بازار لاہور سے شائع ہو گئی ہے

ممتاز ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی ایک اور کتاب

علامہ اقبال۔ شخصیت اور فکر و فن

اقبال اکیڈمی پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہو گئی ہے

بیگم شاہین زیدی

خاکہ

میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ نوادر کے سلسلے میں ڈاک خاصی کم موصول ہو رہی ہے یہی نہیں بلکہ تبادلے میں آنے والے رسائل کی بھی تعداد خاصی محدود ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں جب چند مدیروں سے رابطے کیے تو پتہ چلا کہ انہیں نوادر تواتر سے مل رہا ہے جبکہ تبادلے میں رسالے بھی بھجوائے جا رہے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمام ڈاک اور موصولہ رسائل سہ ماہی نوادر کے پرانے پتے پر بھجوائے جا رہے ہیں۔ دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ جن حضرات کو سہ ماہی نوادر مل رہا تھا انہوں نے شاید رسالے پر تبدیلی پتہ یا پھر نوادر کی ویب سائٹ ای میل ایڈریس اور نئے فون نمبرز کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ گھر نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے ہی مسعود زیدی نے فروخت کر دیا تھا ویسے پرانا گھر مسعود زیدی کے جاننے والوں نے لیا تھا خیر سے ڈیڑھ دو سال سے آنے والی ڈاک اور رسائل کو حرے سے ہضم کر رہے تھے۔ جوں توں کر کے ان سے ڈاک اور رسائل وصول کیے، سب سے پہلے ہاتھ آنے والے رسالوں میں ایک 'انشا' بھی تھا۔

صبح کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج رہے تھے ہم نے انشا کے مدیر محترم صفدر علی خاں صاحب کے موبائل کا نمبر ڈائل کیا، صفدر صاحب فون پر بڑی محبت اور اپنائیت سے پیش آئے انہوں نے نیا ایڈریس نوٹ کیا ساتھ ہی ہمیں بتایا کہ وہ انشا کے تازہ شمارے میں خاکہ نمبر شائع کر رہے ہیں لہٰذا ہمیں بھی کہا کہ آپ بھی جلد اپنی تحریر بھجوائیے بس یوں سمجھیے کہ رسالہ بالکل تیار ہے۔

بس پھر کیا تھا کاغذ قلم سنبھال کر لکھنے بیٹھ گئے۔ صفدر صاحب سے بات کرتے ہوئے اچانک میرے دماغ میں جو خاکہ ابھر کر آیا وہ خاکہ میری پیاری بہن رئیس فاطمہ صاحبہ کا تھا جو ہر وقت دیکھے ہی میرے خیالوں میں سمائی رہتی ہیں جھٹ سے ہنستی مسکراتی جیسے میرے سامنے

آ کھڑی ہوئیں۔ یوں تو ہم زندگی میں بہت سے لوگوں سے ملتے رہتے ہیں۔ مگر لوگوں کی اس بھیڑ میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو آپ کو متاثر کر جاتے ہیں، جو آپ کے دل میں اپنا ایک الگ مقام بنا لیتے ہیں۔ رئیس فاطمہ بھی انہی قابل احترام ہستیوں میں سے ایک معتبر نام ہے جنہیں میں فاطمہ باجی کہتی ہوں۔ باجی سے ہماری ملاقات ایک بہت دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

میرے شوہر مسعود زیدی صاحب نے سہ ماہی نوادر کا اجرا کیا تو اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے ادیبوں سے رابطہ کیا انہیں خط لکھے، فون پر بات چیت بھی کی قلمی تعاون پر زور دیا پھر سہ ماہی نوادر شائع ہوا تو قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والی تقریباً ہر شخصیت کو رسالہ بھجوایا۔ لائبریری قائم کی اس سلسلے میں لوگوں سے کتابیں عطیہ کرنے کی درخواست کی یہی نہیں مسعود زیدی صاحب کسی کتاب یا رسالے میں کسی ادیب، شاعر، کالم نگار کا پتہ دیکھتے تو انہیں سہ ماہی نوادر بھجواتے ان کی رائے لیتے اور خطوط میں قلمی معاونت کا اظہار لکھ کر بھجواتے۔

رسالہ چونکہ خالصتاً ادبی تھا ہماری کوشش یہی تھی کہ سہ ماہی نوادر میں شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کی غیر مطبوعہ تحریروں کو جگہ دی جائے۔ معذرت کے ساتھ کہ تمام ادیب اور شاعر ایک جیسے نہیں ہوتے مگر یہاں بات ان بے صبرے ادیبوں کی کر رہی ہوں جو ایک ہی تحریر کو جلد ہی سے تمام رسائل میں چھپنے کے لیے ایک ساتھ بھجوا دیتے ہیں پھر فون پر اصرار بھی کیا جاتا ہے کہ تازہ شمارے میں ان کی تحریر کو شائع کیا جائے۔ آج کل ادیبوں میں یہ رواج خوب پھل پھول رہا ہے کہ ایک دوسرے کی تحریروں پر لمبے چوڑے تعریفوں کے پل باندھنا پھر انہیں تبصرے کا نام دے کر متن پسند لوگوں کو نوازنا اس پر شامت ہم جیسے مدیروں کی آجاتی ہے لکھنے والے لکھواتے والے راضی ادبی پرچوں کی وہی چال پرانی نہ مالی معاونت نہ ہی قلمی معاونت خیر ان مفت خوروں کو جو مفت کے رسالوں کے عادی ہو چکے ہیں خدا سیدھی راہ دکھائے۔

آج کے دور میں ایسے رسائل کو تسلسل سے شائع کرنا کسی جہاد سے کم نہیں۔ دنیائے ادب کے روشن چمکتے دمکتے ستاروں نے اس سلسلے میں سہ ماہی نوادر کے ساتھ کیا کیا یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ایک تو مفت کا رسالہ ہڑپ کر جاتے ہیں دوسرے رسید نہ تو فون پر دینا گوارا کیا اور نہ ہی کبھی حوصلہ افزا خط ہی لکھا۔ خیر مجھے تو علم ہے کہ اس ادبی دنیا میں بسنے والے حساس لوگوں کا

شیوہ نہیں ہے کہ نوادر...... سہ ماہی نوادر کے ساتھ کسی بھی قسم کا قلمی تعاون کر سکیں۔

لیجئے بات کہاں سے شروع ہوئی اور ہم جذبات میں کہاں سے کہاں تک جا پہنچے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ مسعود زیدی صاحب کو ادب لطیف سے محترمہ رئیس فاطمہ صاحبہ کا ایڈریس ملا تو انہوں نے ایک عدد رسالہ اور نظیر حسنین لائبریری کے لیے کتابیں بھجوانے کے لیے خط لکھ دیا۔

خلاف توقع خط کا جواب بہت جلد تفصیلی طور پر ملا۔ جسے پڑھ کر لکھنے والوں کے خلوص اور ادب سے گہری وابستگی کا علم ہوا۔ رئیس فاطمہ صاحبہ نے لکھا تھا کہ وہ بہت جلد نظیر حسنین میموریل لائبریری کے لیے کتابیں بھی بھجوائیں گی اور اس ادبی کاوش یعنی سہ ماہی نوادر کی کامیابی پر دلی مبارکباد بھی پیش کرتی ہیں۔ خط کی تحریر نے ہمیں فون کرنے پر مجبور کیا۔

بخدا ہم ان کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے یہ پہلی شخصیت تھیں جنہوں نے سہ ماہی نوادر کی رسید بھی ہمیں دی اور قلمی معاونت کا بھی یقین دلایا۔ رئیس فاطمہ صاحبہ سے یقیناً ہمارا کسی نہ کسی جنم میں کوئی رشتہ ضرور رہا ہوگا۔ میں پہلے ان جنموں کے رشتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ مضبوط ہے مگر رئیس فاطمہ سے ملنے کے بعد، ان کی شخصیت کا سحر ان کے رکھ رکھاؤ اور غضب کی پرستش نے مجھے یہ الفاظ کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فاطمہ باجی سے جب مسعود زیدی کی فون پر بات ہوئی تو شاہ صاحب نے انہیں لاہور آنے کی دعوت دی یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اپنے شوہر قاضی اختر جونا گڑھی کے ساتھ ایک دو ہفتے میں لاہور تشریف لا رہی ہیں۔ لاہور قیام کے دوران ہم سے بھی ملاقات ہوگی...... مسعود زیدی صاحب نے ان سے کہا کہ لاہور آ کر آپ اپنے بھائی یعنی مسعود زیدی کے گھر قیام کریں اگر میرے ہاں قیام نہیں کریں گے تو پھر ملاقات کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ارے بھائی کے ہوتے ہوئے بہن بھلا کہیں اور کیسے ٹھہر سکتی ہے۔ مسعود زیدی کے اصرار نے آخر قاضی بھائی اور فاطمہ باجی کو راضی کر ہی لیا۔

خیر وہ دن بھی آ گیا جب میری بہن اپنے شوہر کے ہمراہ کراچی سے لاہور اسٹیشن تک پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے خاص بات کا ذکر کرتی چلوں کہ باجی نے کہا کہ وہ چند دنوں میں لاہور آ رہی ہیں تو لائبریری کو دی جانے والی کتابیں میں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گی۔

maablib.org

ریل گاڑی خراماں خراماں پلیٹ فارم تک رینگتی ہوئی پہنچ کر رک گئی۔ اسٹیشن پر خوب چہل پہل تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش قابل دید تھا لوگ اپنے پیاروں کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے ہر کوئی جلد از جلد اپنے پیاروں سے ملنے کے لیے بے تاب و بے قرار تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ یہی پہلی ملاقات تھی۔ مسعود زیدی اور میں نے ریل کے ایک ایک ڈبے کا جائزہ لینا شروع کیا ہم نے اپنے مہمانوں کو تلاش کرنا شروع کیا شاید ادھر بھی یہی حالت تھی۔

یک دم ہماری نظر سامنے والے ڈبے پر پڑی نجانے نظروں میں ایسی کیا بات تھی نظریں انہی لوگوں پر جا کر مرکوز ہو گئیں۔ دل بے اختیار کہہ اٹھا کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کی تلاش میں تم یہاں آئی ہو۔ نظروں سے نظریں ملیں چہروں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی مسکراہٹوں کے تبادلے نے راہ میں آئی اجنبیت کی دیواروں کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ یوں لگا جیسے برسوں کی شناسائی ہے۔

جی ہاں یہی تو تھی پہلی ملاقات۔ رئیس فاطمہ صاحبہ سے اپنائیت کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ دوران گفتگو رئیس فاطمہ صاحبہ سے مختلف موضوعات جن میں ادب اور ادب سے متعلق بہت سی شخصیات ان کے کارناموں، ادیبوں کے مسائل ملکی حالات پر خوب باتیں ہوتی رہیں اور باتوں باتوں میں یوں لگا کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں دونوں کا ایک ایک بیٹا ادب سے رئیس فاطمہ کو جنوں کی حد تک پیار ہے اچھا پڑھنا اچھے لکھنے والوں کے کام کی دل سے تعریف کرنا نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرنا انہیں بہت پسند ہے۔ رئیس فاطمہ صاحبہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار برملا کرنا جانتی ہیں منافقت انہیں قطعی پسند نہیں ہے۔ وہ جہاں ادب میں اچھے لکھنے والوں کی تعریف کرتی ہیں تو وہاں بُری تحریروں کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور بنا کوئی لیپی رکھے بغیر سخت الفاظ میں اپنے رائے کا اظہار کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نقلی ادیب، شاعرات ہاتھ دھو کر ان کی جان تک کے دشمن بن گئے ہیں۔ رئیس فاطمہ نے نقلی یا جعلی لکھنے والوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے بے نقاب کر دیا وہ لوگ جو ادب کی الف ب سے بھی واقف نہیں اور دوسروں سے افسانے اشعار یا مضامین لکھوا کر محفلوں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتے ہیں باجی نے ایسے ہی دو نمبر ادیب، دو نمبر شاعرات کو بے نقاب کیا ہے ادیب یعنی (نقلی لوگ) رئیس فاطمہ کے بدترین دشمن ہیں۔ رئیس فاطمہ کو جھوٹ

بے تفرت ہے۔ منافقت اور منافق دونوں سے دور ہیں۔ دنیائے ادب میں آگے بڑھنے کے لیے بہت سے شاعر، ادیب، شاعرات، نے گاڈ فادر کا سہارا لیا جبکہ رئیس فاطمہ نے صرف اپنے قلم اپنی تحریروں اپنی قابلیت کو ہی اپنا مضبوط سہارا مانا اور اپنی پہچان بنائی آج لوگ انہیں انہی چیزوں سے پہچانتے ہیں۔

رئیس فاطمہ صاحبہ کے ہاں اعلیٰ اخلاق کی پاسداری کرنے کا رواج آج بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے گرد ایک حصار کھینچ رکھا ہے انہیں پتہ ہے کہ عورت ہونے کے ناطے ان کی حد کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک ختم ہوتی ہے۔ رئیس فاطمہ نام ونمود کی نمائش سے دور اپنے کام سے مطمئن مزید کام کرنے کی لگن اور حوصلہ رکھتی ہیں بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ رئیس فاطمہ صاحبہ بہت مزیدار کھانے پکاتی ہیں۔ یہ راز مجھ پر جب کھلا کہ رئیس فاطمہ صاحبہ نے لاہور قیام کے دوران اگلے دن دوپہر کو ہی یہ اعلان کر دیا کہ آج رات کا کھانا میں خود بناؤں گی مسعود زیدی اور میں نے بہت سمجھانا چاہا کہ آپ آج ہی آئی ہیں آرام کر لیں مگر باجی نے یہ کہہ کر ہمیں خاموش کرا دیا کہ..... مسعود بھائی ایک بات آپ کے گھر میں ٹھہر کر میں نے مان لی دوسری بات آپ اپنی بہن کو کچن میں جانے سے منع نہ کر کے مان جائیں..... بس پھر کیا تھا جب سے آج تک باجی جب بھی لاہور میرے گھر آ کر ٹھہرتی ہیں میرا کچن ان کے پکائے ہوئے کھانوں کی خوشبوؤں سے مہک جاتا ہے باجی بہت لذیذ کھانے جھٹ پٹ تیار کر لیتی ہیں۔ مسعود زیدی کو رئیس فاطمہ صاحبہ کے ہاتھوں کے پکے کھانے بہت پسند تھے۔

خوشبوؤں سے یاد آیا کہ رئیس فاطمہ صاحبہ کو خوشبوؤں اور پھولوں سے تو جیسے عشق ہے لاہور میں قیام کے دوران میں نے انہیں کانوں میں موتیا کے پھول اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے پہنے دیکھا تو بہت شوق سے پھول پہنتی ہیں یہی نہیں مختلف قسم کے پرفیوم خوب لگایا کرتی ہیں باجی جوں ہی پرفیوم لگاتی میرا پورا گھر ان کی لگائی ہوئی خوشبوؤں سے معطر ہو جاتا یوں تو ان کے مانوس سے قدموں کی آہٹ سے میرا گھر خوب واقف ہے مگر باجی کے آتے ہی گھر مسکراہٹوں قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

رئیس فاطمہ صاحبہ، ایک افسانہ نگار، ایک کالم نگار، ایک استاد، ایک شاعرہ جانے اور کیا کیا

ہیں مگر سب سے بڑھ کر بہترین انسان کامیاب گرہستن اور مکمل عورت ہیں۔ ان کی ذات بے شمار خوبیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ باجی رشتے نبھانا خوب جانتی ہیں کیونکہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عام انسان کی طرح لوگ کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان میں گھل مل جاتی ہیں۔ میں یہ دعویٰ ضرور کر سکتی ہوں کہ بحیثیت بہن اور دوست ہونے کے ناطے باجی کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ خوبیاں اور خامیاں تو ہر انسان میں پائی جاتی ہیں لوگوں کا ایک مخصوص گروہ بڑی باریک بینی سے بڑے بڑے نامور لوگوں کے صرف عیب ہی تلاش کرتا ہے مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں میں لوگوں میں ان کی کمزوریاں تلاش کرنے میں وقت صرف نہیں کرتی بلکہ ان میں چھپی خوبیاں ڈھونڈ کر دوسروں کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

رئیس فاطمہ کا ایک اور کام دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ان پر احسانات کی بارش کرنا ہے اور بدلے میں نیچ احسان مندوں کے ہاتھوں بڑے سے بڑے نقصانات اٹھانا اب تک باجی نے جن لوگوں پر بے شمار چھوٹے بڑے احسانات کیے ہیں انہی کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہی ہیں میں نے دیکھا کہ بعد میں باجی سر پکڑے بیٹھی رو رہی ہوتی ہیں...... وہ پہلی ہی نظر میں لوگوں کے اندر چھپے انسان کو پہچان لیتی ہیں مگر رائے مناسب وقت پر دیتی ہیں۔ باجی دوستوں کی دوست ہیں۔

وہ ایک ماں بھی ہیں بہترین ماں، بیوی ہیں تو ایک ایسی باوفا بیوی کہ شوہر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں انہیں اپنے شوہر اور اپنے بیٹے پر ناز ہے۔ رئیس فاطمہ اور ان کے شوہر اختر بھائی دونوں بھرپور آئیڈیل زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی محبت دن رات پروان چڑھ رہی ہے وقت گزرتا جا رہا ہے شادی کو کئی سال بیت چکے ہیں مگر اس شادی شدہ جوڑے کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے جیسے ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں گم ہیں۔ خدا ان کی ہنستی بستی دنیا کو یوں ہی شاد و آباد رکھے۔ رئیس فاطمہ کے لکھنے کے سفر میں اختر بھائی کا ساتھ بھی شامل حال ہے۔ جس طرح ایک کامیاب مرد کے پیچھے اس کی بیوی کا ہاتھ ہوتا ہے اس طرح رئیس فاطمہ صاحب کی کامیابی کے پیچھے ان کے شوہر اختر بھائی کا ہاتھ ہے اگر وہ شادی کے بعد باجی کو آزادی نہ دیتے اور ان پر اعتماد نہ کرتے تو شاید یہ سفر اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ مردوں کے اس معاشرے میں جہاں عورت کو قدم قدم پر ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ بھی مردوں کی طرح گھنٹوں کام کر سکتی ہے اس دنیا میں

اپنی عزت بچا کر مردوں کے درمیان رہ کر صرف اور صرف اپنے آپ پر بھروسہ رکھ کر اپنے آپ کو منوانا وہ بھی جینوئن طریقے سے پھر ہر مشکل سے مشکل کام کو چیلنج سمجھ کر کرنا رئیس فاطمہ صاحبہ کا ہی کارنامہ ہے۔

وہ اپنے کام سے پوری طرح جب تک مطمئن نہیں ہو جاتیں بے چین رہتی ہیں۔ ہماری ادبی دنیا میں چند ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا دور پاس سے بھی ادب سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے یہ خود ساختہ ادیب چاروں سمت سے ادبی دنیا کو گھیرنے میں مصروف ہیں ایک مخصوص ٹولہ بھی جو کہ صرف اسی کام میں مصروف ہے کہ نئے لکھنے والوں کی تحریروں کے بخیئے ادھیڑے یا پھر کسی ادیب کے کام پر دھواں دھار قسم کی تقریر کر کے اسے تنقید کا نام دے کر دل کی بھڑاس نکال لے۔ ایسے لوگ کالی بھیڑوں کی طرح ہمارے سروں پر چڑھ کر بول رہے ہیں ہمارے اچھے لکھنے والوں پر کیچڑ اچھال کر جانے کون سے ادب کو فروغ دے رہے ہیں۔

رئیس فاطمہ اور ان جیسے بے شمار لوگ جن کے کارناموں سے ہمارے ادب کی تاریخ بھری پڑی ہے جنہوں نے ادب میں نئے رجحانات کے ساتھ پرانے ادب پر تحقیق، تخلیق، اور تنقید برائے ادب پر مخلص ہو کر ایمانداری سے نئے آنے والوں کے لیے اس منزل کو آسان کر دیا ہے ادب کو سمجھنے کے لیے آسانیاں پیدا کر دی ہیں یہی نہیں اصل ادیب جو کام کر رہے ہیں بنا کسی ایوارڈ کے ان کا ایوارڈ ان کا کام ہے جو جلد ہی شہرت کی بلندیوں کو چھو کر گمنام اندھیروں میں بھٹکنا نہیں چاہتے جن کی خواہش یہی ہے کہ انہیں صرف ان کے کام سے پہچانا جائے۔

رئیس فاطمہ صاحبہ کا حلقہ احباب خاصا وسیع ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ آپ کو ہر جگہ، ہر محفل میں نظر نہیں آئیں گی۔ ایسا نہیں کہ انہیں ادبی محفلوں میں جانا پسند نہیں، مگر وہ صرف انہی ادبی حلقوں انہی ادبی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں جہاں واقعی ادبی ماحول، ادب پر گفتگو ہوتی نظر آئے گی۔ وہ محفلوں میں وقت برباد کرنے کی بجائے لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت گزارتی ہیں۔

فاطمہ باجی لاہور سے کراچی جا کر بھی مسلسل مجھ سے رابطے میں رہتیں، سہ ماہی نوادر کے بارے میں مفید مشوروں سے بھی نوازتی رہتیں۔ رئیس فاطمہ صاحبہ کے اندر چھپی صاف وشفاف عورت نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، میں ان پر بہت بھروسہ کرتی ہوں، میرے ساتھ ایک بھیانک

حادثہ پیش آیا۔ مسعود زیدی کی اچانک موت نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا، دوست دشمن کی پہچان اس برے وقت میں نہیں ہو پا رہی تھی۔ دراصل کھلے دشمنوں کو تو آپ پہچان لیتے ہیں مگر دوست کے بھیس میں چھپے دشمن کی پہچان چوٹ کھانے کے بعد ہی ہوتی ہے میں ایسے میں بدترین دور سے گزر رہی تھی اس سلسلے میں قدم قدم پر باجی نے میری رہنمائی کی لوگوں کی بھیڑ میں بتایا کہ اصل دوست کون ہیں۔

میں حیران تھی کہ وہ بھلا اتنی دور بیٹھ کر بھی کیسے لوگوں کے بارے میں نشان دہی کر دیتی ہیں پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ درست بھی ثابت ہوئیں۔ وہ کراچی میں رہتے ہوئے بھی ہمارے بارے میں فکر مند رہتی تھیں۔ ہم دونوں کا خونی رشتہ نہیں ہے مگر ایک رشتہ جو ہمیں جوڑے ہوئے ہے وہ قلم یعنی قلم کا رشتہ۔

رئیس فاطمہ صاحبہ نے فون کیا ملازم نے انہیں بتایا کہ زیدی اور باجی گھر پر نہیں ہیں ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ باجی نے تابش اور میرا بھی پوچھا۔ میں گھر دیر سے لوٹی سوچا صبح فون کر لوں گی، مگر مصروفیات کی بنا پر فون نہ کر سکی باجی کا جب دوبارہ فون آیا تو اس دن مسعود زیدی صاحب کا سوئم تھا۔ جب میں نے باجی کو بتایا کہ شاہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تو باجی فون پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ پھر انہوں نے اپنے بھائی مسعود زیدی کا خاکہ لکھا تعزیت کے لیے لاہور آئیں۔

مجھے گاہے بگاہے حضرت علی علیہ السلام کا قول سناتیں کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔ مسعود زیدی ادب سے بہت لگاؤ رکھتے تھے ان کے والد محترم نے اپنی زندگی کے قیمتی سال کراچی کے مختلف کالج میں درس و تدریس میں گزارے۔ مولانا ظفر علی خان پر خوب کام کیا پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی مرحوم، مسعود زیدی نے انہی کی یاد میں رسالہ شروع کیا اس حوالے سے بے شمار ادیبوں، شاعرات سے خاصی شناسائی ہو گئی تھی مگر موت ایک اٹل حقیقت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسعود زیدی کے مرتے ہی لوگوں کے اصل چہرے سامنے آ گئے ادیب نجانے کہاں چھپ گئے نجانے ان کے چہرے کیوں دھندلا گئے بچے کچھے لوگوں نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی بہت جلد اپنے دوست کو بھول گئے۔

لاہور اور کراچی میں شاید مسعود زیدی کے مرتے ہی لوگوں کی مصروفیات بڑھ گئیں جن لوگوں کی مہمان نوازی کرتے ہم لوگ تھکتے نہیں تھے وہ تو صرف چڑھتے سورج کے پجاری نکلے مردوں کو بھی اپنے فائدے کے لیے یاد کرنے والوں کو شاید یہ یاد نہیں کہ وہ بھی کبھی مریں گے اور انہیں بہت جلد ان کے کارناموں سمیت فراموش کر دیا جائے گا۔

بہت سے دوست نما دشمنوں نے تو شاید یہ سمجھا کہ میں ان سے قلمی معاونت کی بجائے شاید مالی معاونت چاہ رہی ہوں۔ میرا تقاضا تو بھئی مخصوص ادبی گروہ کے قبضہ گروپ سے لڑائی مول لینے کا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں میں بہت سی ایسی بے چاری خواتین بھی تھیں جنھوں نے مسلسل بے کاری کوشش کی میں تو سہ ماہی نوادر خود شائع نہیں کر رہی ہوں بلکہ یہ کام تو کوئی دوسرا انجام دے رہا ہے ان خواتین نے میرے پیٹھ پیچھے میرے کردار میرے رسالے کی خوب لیتا ای ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے اوچھے ہتھکنڈوں سے تنگ آ کر شاید میں سہ ماہی نوادر کی اشاعت بند کر دوں گی..... مگر یہ فاطمہ باجی ہی تھیں جنھوں نے قدم قدم پر میری ہمت بندھائی رکھی۔ مجھے مایوس نہیں ہونے دیا۔ ایک مرتبہ میں نے باجی سے پوچھا کہ آپ کی کہانیوں میں یہ کردار آپ کہاں سے لیتی ہیں جس پر باجی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا شاہین یہ سب کردار جو تمہیں میری تحریروں میں پڑھنے کو ملیں گے یہ سب تو میرے ملک میرے شہر اور میرے ہی گرد گھومتے پھرتے نظر آئیں گے۔ دراصل میں جیتے جاگتے کرداروں کو لے کر کہانی لکھتی ہوں۔ یہ سب حقیقی کردار ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اتنا لکھا آپ کے بہت سے دوست احباب ٹی وی کے مختلف چینلوں پر بڑے اچھے عہدوں پر فائز ہیں تو آپ نے کبھی ان افسانوں پر ڈرامے کیوں نہیں بنوائے۔ یا کوئی ٹیلی سیریز آپ کے لکھے ہوئے کرداروں پر کیوں نہ بن سکی۔

باجی نے کہا کہ میرا کام لکھنا تھا سو میں نے لکھ دیا۔ اب کچھ کام دوستوں کو خود بھی کرنا چاہیے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں خود اس کام کے لیے اپنے دوستوں کے پاس جاؤں کیا میرا لکھا ہوا کام انہیں خود نظر نہیں آتا۔ یہ کام میں نے دوستوں کے سپرد کیا ہوا ہے جہاں وہ نئے لکھنے والوں کو جن کی ایک یا دو کتاب منظر عام پر آئی ہے لے کر ڈرامہ بنا ڈالتے ہیں میری ڈھیروں کتابیں شاید ان کی نظر سے اب تک دور ہیں۔ کیجئے اب کچھ بات محترمہ رضیہ فاطمہ کے ادبی سفر کے حوالے سے

کرتے ہیں۔

رئیس فاطمہ صاحبہ نے اپنی ابتدائی تعلیم تعلیمات زیوڑ اور سوشل کیمبرج سے حاصل کی جبکہ انہوں نے میٹرک اسلامیہ کالج فاروویمن سے کیا گریجویشن کراچی کالج برائے خواتین سے کیا۔ کراچی کالج کا نام پہلے پہل انہی کی تحریروں کے حوالے سے اخبارات اور رسائل کی زینت بنا دوران کالج وہ یونین کی صدر اور جنرل سیکریٹری بزم ادب کی نائب صدر، اور بزم نفسیات کے مجلے 'تجزیہ' کی نائب مدیرہ اور کالج میگزین کی ایڈیٹر پھر منیجنگ ایڈیٹر بھی رہیں۔ اسی زمانے میں مختلف اخبارات مثلاً حریت، انجام، مشرق، اخبار خواتین اور روزنامہ جنگ میں باقاعدگی کے ساتھ کالم لکھتی رہیں۔ ۱۹۶۷ء میں روزنامہ کے صفحہ طلبا کے انچارج جناب نثار احمد زبیری نے کالم نگاری کا کل پاکستان مقابلہ منعقد کرایا تھا جس کا عنوان تھا 'نذر طالبات' اس مقابلے میں شرکت کی تو پورے ایک سال کے لیے رئیس فاطمہ کو ایک کالم روزنامہ جنگ میں لکھنے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں تقریری مقابلے اور مضامین نگاری کے مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کیے بی اے فائنل میں کالج کی طرف سے بہترین طالبہ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام 'بزم طلبا' میں شمولیت اختیار کی۔ کراچی کالج برائے خواتین سے گریجویشن کرنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں داخلہ لیا اس دوران اخبارات میں اور ریڈیو کے لیے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

میٹرک کرنے سے پہلے ہی ان کی کہانی ہمدرد نونہال کراچی میں شائع ہو چکی تھی۔ جس کا عنوان 'سات نکتے' تھا۔ سب سے پہلا افسانہ اخبار خواتین میں شائع ہوا پھر اس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جولائی ۱۹۷۹ء کو ان کی شادی برصغیر کے نامور عالم، ادیب، اور محقق قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کے صاحبزادے قاضی محمد اختر جوناگڑھی سے ہوگئی جو خود بھی شعر و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔

مکمل تعارف

نام: رئیس فاطمہ

ولادت: الہ آباد ۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء

گریجویشن: ۱۹۶۸ء کراچی کالج فار ویمن

ایم اے اردو ادب (فرسٹ کلاس) ۱۹۷۰ء جامعہ کراچی

لیکچرار شعبہ اردو: ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۹ء گورنمنٹ جامعہ ملیہ کالج ملیر سٹی

لیکچرار شعبہ اردو: ۱۹۷۹ء تا ۱۹۹۳ء گورنمنٹ کالج فار وویمن سعود آباد، کراچی

اسسٹنٹ پروفیسر اردو: ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۵ء گورنمنٹ کالج فار بوائز ناظم آباد نمبرا... [see below]

اسسٹنٹ پروفیسر اردو: ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۰ء گورنمنٹ کالج فار ویمن ناظم آباد نمبرا

صدر شعبہ اردو: ۲۰۰۰ء تا حال گورنمنٹ دہلی کالج فار بوائز

ڈوبتے ساحل چار طویل کہانیوں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے جبکہ جو تصانیف اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ گلاب زخموں کے (افسانے)

۲۔ موسم اداسیوں کے (۲ ناولٹ)

۳۔ شاخ نہال غم (۲ ناولٹ)

۴۔ آدھا آسمان (افسانے)

۵۔ آئینوں کے درمیان (منتخب کالموں کا مجموعہ)

۶۔ میرے خوابوں کی سرزمین (بھارت کا سفرنامہ ۲۰۰۵ء)

۷۔ زرد چنبیلی کی خوشبو (کہانیاں)

۸۔ خواب نگر کی گلیاں (بھارت کا سفرنامہ ۲۰۰۹ء)

نظر ضمیر

سلطان جمیل نسیم......'افسانوں کا سلطان'

وطن عزیز پاکستان کی جس طرح رئیس امروہوی کے خاندان نے ادب فن اور آرٹ میں خدمت کی اسی طرح صبا اکبر آبادی کا خاندان بھی اس وطن عزیز میں ادب، فن اور آرٹ کی خدمت کر رہا ہے۔ صبا صاحب کا نام تعارف کا محتاج نہیں آپ ادب کی ہر جہت پر عبور رکھتے تھے۔ ناول، افسانے، مضمون نگاری، ہر چیز کو ایک نئی جدت کے ساتھ پیش کیا لیکن آپ کو جو نمایاں مقام ملا وہ آپ کی شاعری ہے اور وہ بھی عزائیہ شاعری۔ آپ نے عربی، فارسی، سندھی اور پشتو کے کلام کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ آپ ہی نے نہ صرف اس ملک کو اپنی خدمات دیں بلکہ اس کام کو کرنے کے لیے اپنے دو سپوت سلطان جمیل نسیم اور تاجدار عادل دیے جو آپ ہی کی طرح اپنے اپنے کام میں بے مثال ہیں۔ یہ دونوں اشخاص ہیں جن کا فن ان کی ہی زندگی میں وقت کی حدیں توڑ کے آگے بڑھ گیا۔ تاجدار عادل کو تو ٹی وی کے حوالے سے سب ہی لوگ جانتے ہیں لیکن سلطان جمیل نسیم کو صرف قلم قبیلے کے لوگ ہی جانتے ہیں۔ حالانکہ ایک وقت تھا ریڈیو کا زمانہ تھا اور ریڈیو پر شہرت حاصل کرنے والے سلطان جمیل نسیم ہی تھے جو ڈرامہ نگاری، صداکاری، خاص کر رومانی کرداروں کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ مئی ۱۹۵۷ء میں آپ کا پہلا ڈرامہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے نشر ہوا۔ آپ ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے اردو ادب کو نہ صرف وطن کی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا غرضیکہ آپ پاکستان، امریکہ اور کینیڈا کی ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔

اس معاشرے میں اگر آدمی کو پیسے کا چسکا پڑ جائے تو وہ تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا یہی کچھ سلطان صاحب کے ساتھ ہوا۔ میٹرک پاس کر کے ان کے ایک واقف کار نے ان کو ٹیلی گراف کے محکمے میں نوکری دلا دی۔ لیکن جو شوق انسان کو ہو جائے تو وہ رہتا ہی ہے آپ کو بھی ادب سے بے انتہا لگاؤ تھا اپنی پہلی تنخواہ جو کہ ۸۳ روپے آٹھ آنے تھی امی کو لے جا کر دے دی اور امی نے

جیب خرچ ۵ آنے دے دیا تو آپ نے سب سے پہلے منٹو کی کتاب 'چغد' خریدی۔ آپ کو آگے بڑھنے کا شوق تھا۔ حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہو چکا تھا۔ ایک تنقیدی نشست میں آپ افسانہ پڑھ رہے تھے۔ جب آپ افسانہ پڑھ چکے تو سننے والوں میں سے ایک آواز آپ کے کان تک پہنچی جو اس طرح تھی "What a rich voice" یہ آواز حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کے ریجنل ڈائریکٹر حمید نسیم کی تھی جب نشست ختم ہو گئی تو آپ کو حمید نسیم صاحب ریڈیو اسٹیشن میں آنے کا کہہ گئے آپ میں جستجو تھی آپ بھی ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے اور پہلے ہی آڈیشن میں آپ کو ریڈیو پاکستان میں منتخب کرلیا گیا۔ آپ کا پہلا لائیو پلے 'البرامکہ' تھا اس طرح آپ کا شمار ملک کی جانی پہچانی شخصیتوں میں ہونے لگا۔

زندگی میں جدوجہد یا جستجو جب ہی کام کرتی ہے جب اس میں ہر طرح کی صلاحیت ہو۔ صرف میٹرک پاس ہی شخص اس زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لیے کافی نہیں۔ آپ کو بھی اب تعلیم کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اور آپ نے اپنی تعلیم کو نیل کالج میں پورا کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جو آپ میں نکھار آیا وہ زمانے نے دیکھا آپ کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ آپ نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ آپ کے لکھے ہوئے سات ڈراموں کے مجموعے 'جنگل زمین خوشبو' نے شہرت حاصل کی۔ اس طرح آپ ریڈیو پاکستان کے لیے درخشندہ ستارہ ثابت ہوئے۔

قمر علی عباسی جو کہ ریڈیو پاکستان اور سفرناموں کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں اقرار کرتے ہیں کہ 'سلطان جمیل نسیم کے توسط سے دو چار لوگوں میں ہمارا تاثر اچھا ہو گیا تھا...... کینیڈا سے امریکہ آنے کی خبر آپ کی پھیلی تو ایک پبلشر کا ای میل میرے پاس آیا کہ سلطان جمیل نسیم سے یہ سفارش کردیں کہ وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے کو دیں'۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ادیب پبلشرز کے چکر کاٹتے ہیں لیکن پبلشرز آپ کے چکر کاٹتے تھے یہ ہے آپ کے قلم کا کمال۔ آپ اردو ادب کے ایک مستند اتالیق ہیں اردو کے باکمال زبان دان ہیں ادب کی ہر صنف پر مکمل عبور رکھتے ہیں آپ کی بصیرت و بصارت دونوں ادب کے لیے وقف ہیں آپ نے جس دور میں ادب کی ابتدا کی اس دور میں نامی گرامی ادیبوں سے آپ کا مقابلہ تھا لیکن آپ نے اپنا لوہا منوا کر اپنے اکتساب سے اپنی پہچان بنائی۔

آپ جدت پسند اور ترقی پسند ادیب ہیں جو کچھ قرطاس پر بکھیرتے ہیں عام قاری اس کو فوراً سمیٹ لیتا ہے۔ سلیس اور ثقیل الفاظ کو استعمال کرنے پر توازن رکھتے ہیں۔ آپ خود ان کے انداز کو دیکھیں تحریر اور لفظ کی قدر و منزلت کس طرح اس افسانہ میں بیان کر رہے ہیں۔ یہ افسانہ منشور بعنوان 'عذاب' ماہ اپریل ۲۰۰۸ء میں ماہنامہ عوامی منشور میں شائع ہوا تھا اس سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ شروع اس طرح کرتے ہیں:

''علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد چوہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ چن چن کر سرکردہ لوگوں کے کان کتر لیے۔ اور ان کن کٹے سرداروں نے اس عیب کو مہر وفاداری جانا، اعزاز سمجھا اور بغیر چوں و چرا وہ تمام احکام بجالائے وہ سب کام کرنے لگے جو صرف چوہوں کے مفاد سے وابستہ تھے۔ چنانچہ پہلا حکم ملا کہ جتنے قلم ہیں سب توڑ دیے جائیں اور سارے کاغذ جلا دیے جائیں اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی اس کے باوجود چوہے ان راضی برضا ہو جانے والوں کی جانب سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ ان کو خورش و خواب سے محروم کر دینے والی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ابھی علاقے کا ایک ایسا آدمی روپوش ہے جو ان کے بارے میں ایک ایک لفظ لکھ رہا ہے کیونکہ وہ آدمی سے زیادہ لفظوں سے ڈرتے تھے کہ آدمی تو مر بھی جاتا ہے اور بک بھی جاتا ہے لیکن لفظ زندہ رہتے ہیں۔ اس لیے چوہوں نے اس آدمی کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارا چپہ چپہ دیکھ لیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''چوہوں کی بات کو لوگوں نے تقدیر کا لکھا جانا اور جیسے گئے تھے ویسے ہی پلٹ آئے، پھر دن گزرے، ماہ و سال بیتے۔ ایک سے حالات دیکھتے دیکھتے صدیوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور تقسیم رزق کے باعث انسانوں کی جسامت کم ہوئی اور قامت گھٹ گیا اور چوہے قد آدم تک پہنچے، تب ایک مخبر نے اطلاع دی کہ اس نے ایک ایسے ٹھکانے کا پتہ چلایا ہے جہاں اس گمشدہ آدمی کی موجودگی کا امکان یقینی ہے، یہ سن کر چوہے خوشی سے اور پھول گئے، پھر علاقے کے لوگ چوہوں کے زیر سایہ اس مخبر کے پیچھے چل دیے''۔

اختتامیہ جملے:

''اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنے علاقے کے سارے لوگوں کو بلایا اور کن کٹے

سرداروں سے کہا کہ گم شدہ آدمی جو تحریر چھوڑ گیا ہے اس کو بلند آواز میں پڑھ کر سب لوگوں کو سنا دو۔ سردار جب وہ تحریر پڑھ رہے تھے تو درختوں پر بیٹھے پرندے حیران تھے کہ آج انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ حمد و ثناء کے بجائے چوہوں کا قصیدہ پڑھ رہا ہے"۔

آیئے اب ترقی پسند ادب کے بارے میں ان کے خیالات جانتے ہیں۔ یہ خیالات آپ کے ماہنامہ عوامی منشور اپریل ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے:

"ترقی پسند تحریک کے ذریعہ، ادب سے زندگی کا رشتہ استوار ہوا۔ معاشرہ کا وہ طبقہ جو اکثریت میں تھا، اور کچلا ہوا تھا، استحصال زدہ تھا۔ وہ ادب کا مخاطب بھی بنا اور موضوع بھی روشنی کی جنگ ہمیشہ اندھیروں سے رہی ہے چنانچہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے ایک طرف سامراج اور اس کے گماشتوں کے خلاف قلم کو نشتر بنایا، تو دوسری جانب، مذہب، عقیدہ، رنگ اور نسل کی باتوں سے اوپر اٹھ کر، مسائل میں الجھی ہوئی استحصال زدہ اکثریت میں بیداری کی روح پھونکی، گویا سماجی شعور کا بھرپور اظہار کیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تحریک ہمارے ادب کی جاندار تحریک ہے۔ ہمارے ادب سے متعلق ذہین ترین تخلیق کار، ترقی پسند ہیں۔ اس تحریک نے ادب کی کسی ایک صنف میں نہیں بلکہ تمام اصناف میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی اس تحریک کا ثمر ہے کہ آج ہم عالمی ادب کے تناظر میں اپنے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے قابل ہوئے ہیں"۔

آپ ادب کے لیے ثقات ادیب ہیں میری دعا ہے کہ آپ جید اور اجلال اکابرین کی طرح ادب کی ہمیشہ خدمت کرتے رہیں۔

بقیہ جامعہ اردو ۔۔

پدر لطف و کرم، ظاہری آنکھ سے دیکھو تو الجھے بال، بکھری ہوئی داڑھی، چمکتی ہوئی آنکھوں پر قدرے موٹا مخصوص فریم والا چشمہ، ہمہ وقت سفید قمیض شلوار میں ملبوس سردی میں واسکٹ کا اضافہ، نادر کتب اور سیاہی والے پین جمع کرنے کا جنون یہ ہیں ہمارے اور جامعہ اردو کے مجذوب، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو سعید حسن قادری۔

ڈاکٹر عرفان شاہ

جامعہ اردو کا مجذوب

میں اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھا کہ کیا کروں اور مزید تعلیم کے لیے کس مضمون کا انتخاب ایم اے کرنے کے لیے کروں۔ اسی پریشانی میں مبتلا میں اپنے استاد، بڑے بھائی، رازداں، اتالیق، دوست اور سکونِ قلب و جاں، استادِ زندگی جناب محترم ڈاکٹر پروفیسر محمد مبین حسنی، سابق استاد وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج گلشن اقبال، کراچی اور پھر استاد شعبہ اردو وفاقی اردو یونیورسٹی کے پاس مشورے کے لیے حاضر ہوا۔ کیوں کہ وہ میری تمام خوبیوں اور نقائص سے باکمال واقفیت رکھتے تھے۔ میرا قلم جس کو ان کی محبت اور عطائے علم نے لکھنا سکھایا۔ انہیں کس طرح مرحوم لکھے، وہ میرے لیے جاوداں ہیں۔ حق مغفرت کرے عجب مردِ درویش وصف کے مالک تھے۔ میرے مربی میرے استاد جناب ڈاکٹر محمد مبین حسنی نے مجھے مشورہ دیا کہ میرا میلان ادب سے تعلق رکھتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ میں ایم اے اردو ادب میں کروں اور ساتھ ہی وفاقی گورنمنٹ اردو کالج بابائے اردو روڈ، کراچی کے شعبہ اردو کے استاد جناب سعید حسن قادری سے رابطے کا حکم دیا۔ میں نے رقعہ دینے کے لیے عرض کی تو کہا کہ فقیر انسان ہے میرا نام ہی تمہارا تعارف ہے۔ سعید حسن قادری، جناب ڈاکٹر صاحب کے استاد بھائی کا درجہ رکھتے ہیں ان کے والد گرامی ممتاز محقق عالم باعمل جناب ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب جو صدر شعبہ اردو، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی تھے۔ ڈاکٹر محمد مبین حسنی نے بھی استاد اور ان کے تحقیقی کام برائے پی ایچ ڈی، ''اردو ادب پر مولانا مودودی کی تحریک کے اثرات''، جس کے نگراں استاد الاستاد جناب پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب تھے، میں فراہمی مواد و کتب کے بنیادی ماخذ تھے۔ جناب ایوب قادری صاحب، جناب

محمد مبین حسنی سے اپنے حقیقی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے اور آپ کا کتب خانہ، میرے استاد محمد مبین حسنی کے لیے ہر وقت استفادے کے لیے کھلا رہتا۔

بہر حال ایک دن میں وفاقی اردو کالج، کے مرکزی گیٹ پر پہنچا جہاں ایک مقامی نوجوان نے جو لیاری کا بلوچ تھا اپنے مخصوص انداز میں، مجھ سے پوچھا کہاں جانا ہے، میں نے جواب دیا، شعبہ اردو، اس سے قبل کہ میں کچھ پوچھتا اس نے خود ہی کہا کہ سعید صاحب موجود ہیں، میں حیران تھا کہ اس کو میرے مدعا کا کیسے علم ہو گیا، مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتہ کہ مجھے سعید صاحب سے ہی ملنا ہے؟ اس نے کہا اس وقت ایک بجے کا وقت ہے۔ شعبہ اردو کیا دیگر شعبہ جات میں، سعید صاحب کے علاوہ کوئی استاد معجزے کے سبب ہی مل سکتا ہے، اس لیے جب آپ نے شعبہ اردو کا پوچھا تو یقیناً اس کا مطلب یہی تھا کہ آپ سعید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس کے جواب سے اس کی معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا۔

کالج میں داخلے کے ساتھ ہی بائیں ہاتھ کی راہ داری میں شعبہ اردو قائم ہے۔ میں نے کمرہ کے دروازے پر دستک دے کر حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ ایک بے باک آواز آئی "آجاؤ......!"

میرے سامنے، سفید قمیض، شلوار، میں ملبوس موٹے سیاہ فریم کے چشمے لگائے، ایک چھریرے بدن والا نوجوان شخص موجود تھا۔ میں نے مودبانہ انداز میں پوچھا 'سعید قادری صاحب آپ ہیں؟ جواب ملا بولو کیا مسئلہ ہے۔ میں نے دوبارہ تصدیق چاہی سعید صاحب آپ ہیں۔ بولو کیا مسئلہ ہے۔ اس بار لہجہ میں شدت تھی۔ میں نے کہا مجھے جناب ڈاکٹر محمد مبین حسنی نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور میرا مسئلہ...... یہ ہے؟ انہوں نے میری بات مکمل ہونے سے قبل ہی جواب دیا...... مسئلہ کوئی بھی ہو...... سمجھو حل ہو گیا ہے۔ کوئی اور بات کرو...... ؟ میں نے کہا آپ نے مسئلہ تو سنا ہی نہیں...... کہنے لگے جس حوالے سے تم آئے ہو اس سے آگے کسی بات سننے کا سوال ہی نہیں، بلکہ مسئلہ حل کرنے کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ وہ محبت تھی جو سعید صاحب، آغا صاحب سے رکھتے تھے۔

میرے داخلے کے تمام مراحل آسان تر ہوئے اور سعید صاحب سے راہ و رسم میں بھی قربت ہوتی گئی۔ سعید قادری صاحب کے جد امجد بدایوں سے تعلق رکھتے تھے اور سندھ میں آ کر آباد

ہوئے۔ ان کے دادا جناب مشیت اللہ قادری تاجر تھے۔ جن کے ۱۰لڑکے اور ۱۰لڑکیاں تھیں جن میں سعید صاحب کے والد جناب ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا تیسرا نمبر تھا۔ سعید قادری یکم اپریل ۵۸ء کو وحید آباد، گولیمار (گلبہار) کراچی میں مولد ہوئے تعلیمی مراحل گورنمنٹ پرائمری اسکول، وحید آباد، وسلطانیہ گورنمنٹ پرائمری اسکول ناظم آباد، کے ایم سی بلاک H، نارتھ ناظم آباد، میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ا، ناظم آباد سے پاس کرنے کے بعد، انٹر سے ماسٹر تک وفاقی اردو کالج سے تحصیل علم کیا۔

سعید قادری صاحب کا پہلا عشق اردو زبان اور اردو کالج سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ، اردو کالج کے نامور اساتذہ اور طلبہ کے ادبی کاموں کا تحقیقی جائزہ' کو اپنا موضوع بنایا تاکہ نفاذ اردو تحریک اور قومی زبان کے نفاذ وفروغ کے ایک پورے عہد کو قلمبند کر کے آنے والوں کے لیے ایک نشانِ راہ چھوڑ دیا جائے تاکہ قومی زبان کے عشاق اپنے جذبوں کو گرم رکھ سکیں۔

اردو کالج (موجودہ جامعہ اردو) کا مجذوب اگر کوئی اس عہد میں ہے تو وہ سعید قادری ہیں۔ نہ عہدے کی طلب نہ ذاتی تشہیر، کتاب اور شاگرد کو گھر پر فوقیت ان کا وصف خاص ہے۔ جب یونیورسٹی بنی تو اس کے نصابی تشکیل میں شعبہ اردو کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا وہ منظر عام پر آنے سے اکثر قد آور، پستہ قد ہو جائیں گے۔

عجب شخص ہے، ہمہ وقت طالبان علم پر تن من دھن سے اپنے آپ کو لٹانے میں مصروف رہتا ہے۔ فٹ پاتھ ہو یا گھر ہر لمحہ کسی کتاب کے بارے میں گفتگو، کسی طالب علم کے بارے میں فکر مندی اس کا نصیب ہے۔ گھر میں قیام تو واجبی یا مجبوری سمجھئے ان کا دارالسکون تو دراصل کمرہ جماعت، یا طلبہ کا حلقہ ہے۔

کم و بیش پچھلے ۳۰ سال سے درس و تدریس سے وابستگی کے بافیض ملک و بیرون ملک چہار سمت طلبہ و طالبات کا ایک وسیع حلقہ ان کا معتقد اور ان کی کسی خواہش کی تکمیل کا حکم اپنے کام جاری ہونے کا متمنی رہتا ہے۔ لگتا ہے کہ سعید قادری میں نفسی خواہش یا ذات پروری مردہ ہو چکی ہے۔ میں نے انہیں دینے کی جستجو میں دیکھا اپنے لیے تو کبھی صدر شعبہ بننے کی خواہش بھی نہ رکھی۔

اردو کالج اپنے مخصوص محل وقوع کے اعتبار سے پہلے بھی حساس تھا اب یونیورسٹی بن جانے کے بعد اس کی سیاسی حساسیت مزید بڑھ گئی ہے۔ ملک کے طول وعرض سے ہر رنگ ونسل مذہب اور سیاسی شعور کا طالب علم اس درس گاہ سے وابستہ ہے۔ دیگر تعلیمی اداروں کے بہ نسبت یہاں کے استاد پر ذمہ داری بہت زیادہ ہے اور غیر جانبدارانہ رویہ جو فطرت سے متضاد ہے قائم رکھنا انتہائی مشکل ہے مگر میں نے استاد محترم کو کئی مواقع پر طلبہ کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے اور طلبہ کے بڑھتے ہوئے تصادم کو تنہا اپنی ذات پر لیتے ہوئے دیکھا۔ اکثر سعید صاحب کے رفقاء ان کو طلبہ کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہ کرنے پر 'پاگل' ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر معلمی واقعی ہی منصب پیغمبری ہے تو سعید صاحب کے لیے یقیناً یہ لقب 'اعزاز' کی بات ہے۔ کیوں معلم اعظم کو بھی 'پاگل' کہا گیا تھا۔

فی زمانہ سعید صاحب اس ہنر سے نابلد ہیں جس کو لابنگ یا تعلقات عامہ کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے باوجود کے قمر وارثی، محبوب الہی، علی حسن ساجد، نیر اسعدی، امین الدین امین، عبداللہ کھوکھر، پروین حنا، ڈاکٹر کہکشاں وسیم، احتشر کاظمی، اور دیگر شاگرد ممتاز حیثیتوں کے حامل ہیں۔

جامعہ اردو کے شعبہ اردو میں اپنی کاوش سے 'ڈاکٹر ایوب قادری یادگاری کتب خانہ' اور 'ادارہ یادگار ایوب قادری' کا قیام سعید صاحب کی جہاں اپنے والد محترم سے عقیدت کا ثبوت ہے وہاں ہی اس علمی ورثے کے تحفظ کا احساس جو ادبی، علمی، تحقیقی کتب، رسائل اور اخبارات میں پھیلا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بڑا کام انہوں نے یہ بھی کیا کہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے کتب خانہ..... میں موجود اہم تاریخی رسائل کی مکمل فائیلس بیدل لائبریری شرف آباد کو عطیہ کر کے طالب علم اور عام آدمی تک اس کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے۔

مقدمہ نگاری اور تنقید سعید صاحب کا خاص میدان ہے۔ کئی کتب پر وقیع خلاصے، تنقیدی جائزے، اور پیش لفظ ان کی ادب کی مختلف جہتوں پر دسترس کی دلیل ہیں۔ اعلیٰ سطحی تدریس میں تنقید پر ان کے سیر حاصل لیکچرز طلبہ وطالبات کو مقناطیس کی طرح کھینچے ہیں۔

نظر شیریں، دل گداز، ہمہ جہت، سیماب صفت، علم پرور، صوفی منش، طلبہ وطالبات کے لیے

بقیہ ص ۲۷۶ پر

جاوید احمد خورشید

ہمارے زبیر بھائی

طالب علم بلکہ محقق پرور، تواضع پسند، وضع دار، منکسر المزاج، سانولہ رنگ، درمیانہ قد، مختصر جثے کے حامل، سفید داڑھی، سر پر ٹوپی، بے جماعت پنج وقتہ نماز کے پابند، حافظے میں سینکڑوں کتابوں، درجنوں ملکی اور غیر ملکی ادبی رسالوں، ان کے مدیروں اور لکھنے والوں کے نام محفوظ، ملکی اور غیر ملکی تجربہ کار اور نو آموز لکھاریوں اور محققین سے شناسائی اور ان کے لیے حوالا جاتی مواد فراہم کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں، معروف اور غیر معروف یا نو آموز ادیبوں کے مابین رابطے کا ذریعہ، کڑے نگراں، کتب خانے میں زیادہ سے زیادہ گوشہ جات قائم کرنے کے متمنی، کتب خانے کے لیے ہزاروں عطیہ شدہ کتابوں کے واحد محرک، وقت کے پابند، ایثار پسند۔

غالباً یہ سال ۲۰۰۹ء کے آخر کی بات ہے جب میری اور خالد امین کی پہلی ملاقات بیدل لائبریری، شرف آباد، کراچی کے مہتمم اعلیٰ زبیر بھائی سے ہوئی۔ اس سے پہلے زبیر بھائی کی شہرت جامعہ کراچی کے ان طالب علموں کے ذریعے شعبہ اردو پہنچ چکی تھی جو کتب خانہ مذکور میں جاتے رہتے تھے۔ جامعہ کراچی سے ہم دونوں سہ پہر کے وقت جب بیدل لائبریری پہنچے تو کتب خانے میں داخل ہوتے ہی زبیر بھائی کو ایک وسیع و عریض میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے ڈاک کے ذریعے آنے والی کتابوں کا اندراج کرتے ہوئے پایا۔ ہم دونوں نے سلام دعا کے بعد اپنا تعارف کرایا۔ زبیر بھائی خندہ پیشانی سے ملے۔ کتب خانے میں جانے کا مقصد علم بیان و بدیع اور عروض پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کرنا تھا۔ جس کے لیے زبیر بھائی نے نہ صرف کتب خانے میں موجود ضروری کتابوں کا ذخیرہ اپنے معاونِ خاص امان صاحب کی مدد سے فراہم کیا بلکہ جب تک ہم اس غرض سے وہاں روزانہ جاتے رہے ہمارے لیے چائے کا بھی انتظام رہا۔ اس دوران نہ صرف نادر کتابوں سے استفادے کا موقع میسر آیا بلکہ ان ادبی رسالوں کی فائلیں بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہوا جن کی پاکستان بننے سے قبل ہندوستان میں اردو کے ادبی حلقوں میں شہرت عام تھی۔ جو

بات ہمارے دلوں پر آج بھی نقش ہے وہ یہ کہ زبیر بھائی نے ہمارے لیے حوالا جاتی مواد فراہم کرنے کے لیے اپنے موبائل فون سے کئی تجربہ کار مقالہ نگاروں سے معلومات حاصل کیں۔

یہ تجربہ اس لیے بھی خوش گوار حیرت کا باعث رہا کہ میں اور خالد امین کراچی کے کئی کتب خانوں میں اس سے قبل جا چکے تھے۔ تمام کتب خانوں اور ان کے چلانے والوں میں ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے گرد سے اٹی کتابیں، حوصلہ شکن اور ناکافی معلومات کا حامل عملہ، عملے کی سرد مہری، خوفناک ویرانی، کرم خوردہ کتابیں، رسالوں کی نامکمل فائلیں اور کتب خانے کے بند ہونے کا منتظر بار بار گھڑی دیکھتا عملہ۔ شاید ان تمام عوامل کی وجوہات میں شرم ناک حد تک کسی کتب خانے کے عملے کی کم تنخواہیں ہونا شامل ہیں۔

بیدل لائبریری میں اس کے مشفق اور فرض شناس عملے کی بدولت حالات یکسر مختلف ہیں۔ گوشہ جاتی کتب خانہ ہونے کے باعث یہاں مطلوبہ کتابوں تک رسائی عام کتب خانوں کی نسبت آسان اس لیے ہے کہ یہاں ہر گوشے میں موجود کتابوں پر مشتمل دفتر موجود ہیں جنہیں دیکھنے سے کسی بھی گوشے میں موجود کتابوں کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔ الماریوں میں موجود ہزاروں کتابیں مٹی سے اٹی ہیں نہ ان الماریوں کو دیکھنے کے بعد کسی قسم کی بے ضابطگی کا احساس ہوتا ہے۔ کتب خانے کا عملہ ہمہ وقت اسکالروں کو کتابیں فراہم کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتا ہے۔ زبیر بھائی اپنے ذاتی خرچ سے طالب علموں کو کم و بیش روزانہ چائے پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر طالبات کے ساتھ تو ان کا رویہ بالکل اپنے بچوں جیسا ہوتا ہے۔ انہیں بیٹا کہہ کر مخاطب کرنا، حوالا جاتی مواد کا عکس تیار کرا کر دینا اور ان کے لیے دیگر آسانیاں پیدا کرنا ان کے معمولات میں شامل ہیں۔

زبیر بھائی کے رفیق کار امان بھائی تو کمال کے آدمی ہیں۔ رسالوں کی بھاری بھاری فائلیں کاندھوں پر اٹھائے اپنے خاص انداز سے اسکالروں کو دکھاتے نہیں تھکتے۔ بجلی کی عدم موجودگی میں بھی ہم نے اس عظیم شخص کو فارغ نہیں دیکھا۔ منہ میں اپنا ٹارچ والا موبائل فون دبائے اندھیرے میں بھی کتابوں کی ترتیب کا کام سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود زبیر بھائی ان کو کتب خانے کے آداب اور قارئین سے برتاؤ پر اصلاحی لیکچر دیتے رہتے ہیں۔

مقالے کی تکمیل کے بعد خالد امین کراچی میں امن و امان کی ناگفتہ بہ صورت حال کے باعث اس کتب خانے میں اس تواتر کے ساتھ نہیں آ سکے۔ لیکن میں یہاں تسلسل سے آ تا رہا ہوں۔ اس دوران زبیر بھائی نے یہاں آنے والے معروف اور تجربہ کار ادیبوں سے متعارف کرایا۔ جن میں اجمل کمال صاحب، محترمہ زاہدہ حنا، عقیل عباس جعفری صاحب، آصف فرخی صاحب، ابرار عبدالسلام صاحب، تحسین فراقی صاحب، رفیق احمد نقش صاحب، ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ صاحب، سحر انصاری صاحب، رفیع الدین ہاشمی صاحب، محترمہ نجیبہ عارف، صحافی زیب اذکار اور پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب تو ایم اے کے دوران ہمارے استاد بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب جن کمال اوصاف کی حامل ہستی ہیں ان اوصاف کو بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ طویل تحریر درکار ہے۔

ڈاکٹر خرم شفیق صاحب، طاہر قریشی صاحب، داؤد عثمانی صاحب، طارق حسین صاحب، اور عالمی شہرت کے حامل نعت گو شاعر اور نعت خواں جناب صبیح رحمانی صاحب کا شمار ان اسکالروں میں ہوتا ہے جو زبیر بھائی کے دوست بھی ہیں۔ یہ صاحبان چوں کہ اپنے تحقیقی کاموں کے غرض سے اکثر کتب خانے میں آتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ طالب علموں کو مکالے کا موقع میسر آتا ہے۔ ڈاکٹر خرم شفیق صاحب تو کئی ادبی رسالوں کے اشاریے ترتیب دے کر اہل الرائے کی توجہ حاصل کر چکے ہیں۔ معارف کا آٹھ دہائیوں پر محیط اشاریہ لائق ستائش ہے۔ طاہر قریشی صاحب چوں کہ پیشے کے اعتبار سے کالج میں استاد ہیں اور انشا اللہ خاں کی 'دریائے لطافت' میں نظریہ لسانِ اردو کے زبردست حامی ہیں۔ اس کے علاوہ طالب علموں کی بھی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں بطور امیدوار بیٹھنے کے خواہاں ہیں۔ یہ رہنمائی اتنی راست اور برمحل ہوتی ہے کہ طالب علم اسے اپنے لیے رہنما بنا لیں تو کوئی وجہ ایسی نہیں ہے کہ وہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہوں۔ لیکن ہمیں اس بات کا انتظار ہے کہ طاہر بھائی اس موضوع پر کب قلم اٹھاتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں۔ طارق حسین صاحب بھی اپنے تحقیقی کام میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے علاوہ طالب علموں کی بھی امکانی حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔ داؤد عثمانی صاحب تو ان سب سے آگے ہیں وہ رہنمائی کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے لیے اس ایثار کا

مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کا اپنا کام تاخیر کا شکار رہتا ہے۔ جناب صبیح رحمانی صاحب کی بذلہ سنجی کا کیا کہنا۔ ایسے ایسے موضوعات سے بھی ہنسی کا پہلو تلاش کرنا تو ان ہی کا کام ہے۔ ان کی موجودگی میں زبیر بھائی کے فلک شگاف قہقہے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس سے قبل ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ زبیر بھائی کو صرف مسکرانا ہی آتا ہے۔ ویسے زبیر بھائی کسی قیمت پر کتب خانے کا تقدس ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن وہ بھی صبیح بھائی کے سامنے شاید بے بس نظر آتے ہیں۔

جب بھی یہ تمام صاحبان اکٹھے ہوتے ہیں تو ساقی فاروقی کے الفاظ میں ان کی موجودگی ایک 'ادبی مجھلے' کا منظر پیش کرتی ہے۔ پھر زبیر بھائی کی تواضع پسندی کا کیا کہنا۔ طاہر بھائی کے لیے جلیبیوں کا اہتمام نہ کرنا، قہر طاہر کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ طاہر بھائی کے لیے ملی شاعری میں نعتیہ عناصر کی تلاش کے بعد سب سے بڑی عشرت جلیبیاں کھانا ہے۔

زبیر بھائی نے لائبریری سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی ذہانت اور طویل عرصے سے ادیبوں سے مراسم ہونے کے باعث کسی بھی کتاب یا رسالے کے مندرجات دیکھتے ہی اس کے کارآمد ہونے کے بارے میں رائے دینا پسند کرتے ہیں۔ اور طالب علموں کے لیے کوئی ایسی ضروری کتاب یا مقالہ نظر سے گزر جانے کے فوری بعد اس طالب علم کو فون کر کے مطلع کرتے ہیں یا اس کے کسی ہم جماعت کے ذریعے پیغام پہنچانے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

کتب خانے میں معروف ادیبوں سے ملنے اور بات کرنے کے آداب سے اپنے عمل اور الفاظ کے ذریعے نوجوانوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ ایک روز ایک طالبہ اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ جسے زبیر بھائی نے محسوس کیا اور پاریکھ صاحب کے جانے کے بعد استاد سے مخاطب ہونے کے آداب پر مختصر مگر سبق آموز نصیحت کی۔ رفیق احمد نقش صاحب اور ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ صاحب کی کتب خانے میں آمد کے بعد زبیر بھائی کی حتی الامکان یہ کوشش رہتی ہے کہ طلبا ان شخصیات سے استفادہ کریں۔ ان صاحبان سے طالب علموں کے لیے موزوں کتابوں کے نام معلوم کرنا، موضوعات سے متعلق معلومات حاصل کرنا اور ان کے ذاتی کتب خانوں سے طالب علموں کے لیے کتابیں مستعار لینا، زبیر بھائی کا معمول ہے۔ یہ صاحبان جس خندہ پیشانی سے کتابیں فراہم کرتے ہیں بلکہ طالب علموں کے لیے ضرورت پڑنے

پر عکس بھی تیار کرواتے ہیں، قابلِ تعریف اور علم پروری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سامنے کی بات ہے زبیر بھائی کے رویے سے متاثر ہو کر متعدد لوگوں نے اپنے آباواجداد کی کتابیں فراہم کرنے یا ان لوگوں کی توجہ اس جانب دلانے کا عندیہ دیا ہے جن کے پاس کتابیں تو ہیں لیکن ان کی خاص دیکھ بھال سے وہ خاندان قاصر ہیں۔

سیسیرو نے کتب خانے کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے کیا خوب کہا تھا کہ کسی گھر میں کتب خانے کا اضافہ کرنا ایسا ہی ہے کہ کسی گھر کو اس کی روح نصیب ہو جائے۔ تھیبس کے کتب خانے پر عبارت کندہ تھی: Medicine for the Soul ۔ بار براٹچ مین نے کہا تھا کہ میرے لیے کوئی چیز اتنی علالت کا باعث نہیں جتنی کہ کتب خانے کا بند دروازہ۔ بالبروک جیکسن کہتا ہے کہ آپ کا کتب خانہ آپ کی تصویر ہے۔ جان برائٹ کتب خانے کے تعلق سے کہتا ہے کہ اصل میں کتابوں سے پیار ہے کیا؟ یہ ایسا ہی ہے کہ ماضی کے عظیم اور اچھے لوگوں سے ذاتی تعارف حاصل ہو۔ کتابیں جب انہیں آپ الماریوں میں رکھے دیکھتے ہیں تو وہ خاموش نظر آتی ہیں، لیکن جیسے ہی میں کتب خانے میں داخل ہوتا ہوں تو ماضی کے عظیم افراد کو زندہ محسوس کرتا ہوں، اور جب میں ان کتابوں سے سوالات کرتا ہوں تو وہ کتابیں پوری وفاداری اور کلیت میں مجھے جواب دیتی ہیں جو ان میں عظیم افراد رقم کر گئے ہیں جو ہم میں نہیں ہیں۔ ہینری امیرسن فوسڈک کہتا ہے کہ زندگی ایک ایسے کتب خانے کی مانند ہے جس کا مالک ایک لکھاری ہے۔ اس میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جو اس لکھاری نے تحریر کی ہیں، لیکن اس میں سے زیادہ تر کتابیں اسی کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔

بلاشبہ بات زبیر بھائی سے آغاز ہو کر کتب خانوں کی عمومی حالت سے ہوتی ہوئی ان دانش وروں تک پہنچ گئی جنہوں نے کتب خانوں کی اہمیت کو اپنے اور قوموں کی زندگی کے لیے اہم سمجھا۔ ہماری آج مجموعی حالت کے پیشِ نظر جہاں عدمِ توازن کی ایسی ایسی مثالیں رقم ہیں کہ ان کی صرف آج نشان دہی کافی نہیں بلکہ عملی اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم اپنے اپنے شعبہ جات میں فرض شناسی کی بہترین مثالیں رقم کریں۔ زبیر بھائی اپنی دانست میں طالب علموں میں علم و آگہی کی شمعیں روشن کرنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر رہے ہیں۔ بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

مرزا عاصی اختر

ضیاالحق قاسمی اور اُن کی شاعری

ضیاءالحق قاسمی (جنھیں مرحوم لکھنے کو دل تیار نہیں ہے) کے برادر خورد جناب عطاالحق قاسمی نے روزنامہ "جنگ" میں اپنے تعزیتی کالم میں لکھا کہ ایک دن وہ بھی شاہ صاحب مرحوم کے گھر میں ہی تھے، دن بھر بارش ہوتی رہی، رات تک ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ انھیں (ضیاء کو) رات بھر بے چینی رہی۔ اسی شب پہلی بار شاعری کی دیوی اُن پر مہربان ہو گئی اور دو شعر وارد ہو گئے۔ وہ رات بھر پریشانی کے عالم میں ٹہلتے رہے کہ یہ شعر ہیں بھی، یا نہیں:

جس دن سے مری اُن سے ملاقات ہوئی
اس یاد کی پہلی ہی یہ برسات ہوئی ہے
تا صبح شب وصل رہے گی یہی رم جھم
موسم کے فرشتوں سے مری بات ہوئی ہے

مزاح گو شاعر کی حیثیت سے وہ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی وژن اسلام آباد مرکز میں انھوں نے تاحیات کراچی کی نمائندگی کی۔ حقیقت یہی ہے کہ اپنے نام اور کام کی بنا پر یہ ان کا حق بھی تھا۔

اگر اُن کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ زندگی کے بیشتر مسائل کو انھوں نے مزاحیہ اور ناقدانہ انداز میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ اکثر فی البدیہہ کہہ دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک انٹرویو میں جب اُن سے اُن کی عمر پوچھی گئی تو انھوں نے اس

قطعے میں برجستہ جواب دیا:

مجھ کو اپنا یوم پیدائش زبانی یاد ہے
کوئٹے میں زلزلہ آیا تو میں پیدا ہوا
عمر میری پورے باسٹھ سال کی اب ہو گئی
ہائے میں بھی اس بت کافر پہ کب شیدا ہوا

اوپن ہارٹ سرجری کے موقع پر بھی ایک فی البدیہہ قطعہ کہا، جو یہ تھا:

اطبا نے بتایا ہے جناب پے قاسمی کو یہ
ہوئی ہیں آپ کے دل کی کم از کم چار وِیسل بند
نکالیں ٹانگ سے اور جوڑ دی ہیں دل کے پہلو میں
لگا ہے خوب کیا کمخواب میں یہ ٹانگ کا پیوند

سید ضمیر جعفری اور دلاور فگار سے انھیں خاص عقیدت تھی۔ انھوں نے اِن نابغۂ روزگار ہستیوں کے لیے حیدر آباد میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا، جس میں سید ضمیر جعفری کو "بابائے ظرافت" اور دلاور فگار کو "شہنشاہِ ظرافت" کے خطابات دیے گئے۔ اپنی کتاب "مجھے یاد آیا" میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"سید ضمیر جعفری کے صاحبزادے فوج کی اعلیٰ ٹریننگ کے لیے لندن گئے تو سید صاحب کو بھی ساتھ لے گئے۔ لندن میں کچھ روز رہنے کے بعد ضمیر صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنے دوسرے صاحبزادے کے پاس امریکہ جا کر رہیں گے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک قطعہ کہا، جو حسبِ حال ہے:

طنز و مزاح آج بھی کتنا اداس ہے
سید ضمیر جعفری لندن چلے گئے
وہ کیا گئے کہ بزمِ طرب ہی بکھر گئی
واشنگٹن سے جیسے کلنٹن چلے گئے

"بیوی" مزاح گو شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ منفرد مزاح گو شاعر اور محقق ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی اس بارے میں ایک جچی تلی رائے ہے۔ فرماتے ہیں:

"سنجیدہ شاعری "محبوبہ" اور مزاحیہ شاعری "منکوحہ" کے گرد گھومتی ہے۔"

مزاح گو لاکھ اس الزام سے بچنے کی کوشش کرے، نہیں بچ سکتا۔ اس حوالے سے ضیاالحق قاسمی مرحوم کی شاعری کے کچھ رنگ دیکھتے ہیں:

نظام الدین سرجن کی مسیحائی کا کیا کہنا
کمالِ فن سے بڈی میری بیگم کی جو، جوڑی تھی
کہا مجھ سے ضیاء جی تم بھی سرجن ہو مگر آدھے
وہی تو میں نے جوڑی ہے جو بڈی تم نے توڑی تھی

....

میری بیگم ہیں جیلس خواتین سے
پوچھتی ہیں یہ مس فاخرہ کون ہے
آئی ڈی کارڈ میرا بنا تو کہا
اب بتاؤ مجھے "نادرہ" کون ہے

اُن کی شاعری کی بوقلمونیاں حد درجہ دل کش اور دلفریب ہیں ذرا اس قطعے کو ہی دیکھیے۔ گو کہ یہ ہمارے کلچر سے لگا نہیں کھاتا، مگر اندازِ بیاں کی دلکشی نے اِسے کیا سے کیا بنا دیا ہے:

گھر کی رکھوالی کی ہم میں استطاعت ہی نہیں
ہم نے اخراجات گرچہ کر لیے ہیں کم سے کم
اپنے ہمسائے کے کتے بھونکتے ہیں رات بھر
اپنے گھر میں بھونک لیتے ہیں کبھی مل جل کے ہم

اپنے برادرِ خورد عطاالحق قاسمی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ 35 سال تک روزنامہ "نوائے وقت" میں کالم لکھتے رہے، پھر انھوں نے روزنامہ "جنگ" جوائن کر لیا تو اس پر میں نے یہ

maablib.org

قطعہ کہا:

صحافی دوست سے پوچھا کہاں رہتے ہو یار من
بتایا حال ہی میں وہ چورنگی سے مزنگ آمد
کہا میں نے "نوائے وقت" ہی میں کام کرتے ہو
جواب آیا، نہیں آخر میں تنگ آمد بجنگ آمد

شاعری اور گلوکاری میں گہرا رشتہ ہے۔ بعض شاعر مشاعروں میں اتنے مقبول نہیں ہوئے، اُن کے کلام گایا گیا تو وہ مشہور ہوئے۔ المیہ یہ ہے کہ شاعری عمدہ بھی ہو تو لوگ گلوکار کا نام ہی یاد رکھتے ہیں، حالاں کہ انھیں شاعر کا نام یاد رکھنا چاہیے۔ اس دلچسپ صورت حال کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اس قطعے میں پیش کیا ہے:

فیض احمد فیض سے فرمائش ہونے لگیں
وہ سناتے جارہے تھے شعر کیا کیا بے بدل
ایک سامع نے کہا میری بھی فرمائش ہے ایک
اب سنائیں آپ وہ مہدی حسن والی غزل

ضیاالحق قاسمی مرحوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی شاعری تا دیر مہکتی رہے گی، اور اہل ذوق اس سے لطف اٹھاتے رہیں گے۔

ممتاز شاعر و افسانہ نگار جناب مختار کریمی کے چاروں شعری مجموعوں کی کلیات

رمزِ سخن

کے نام سے شائع ہوگئی ہے

صفحات ۲۷۲، قیمت: ۲۵۰ روپے

ناشر: بکشن ہاؤس لاہور　　　　اسٹاکسٹ: ویلکم بک پورٹ کراچی

کتاب: فہرست کتب خانہ نعت ریسرچ سینٹر	مرتب: محمد طاہر قریشی
مبصرہ: جاوید احمد خورشید	سن اشاعت: ۲۰۰۹ء (بار اوّل)
قیمت: ۳۰۰ روپے	ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

گزشتہ چند برسوں میں اردو کی ادبی تحقیق سے جن کاوشوں کو محققین میں ستائش کی نگاہ سے دیکھا گیا ان میں فہرست سازی اور اشاریہ سازی شامل ہیں۔ کم وقت میں حوالہ جاتی مواد کی تحصیل اردو ادب کے تحقیق کاروں کا ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ فہرست سازی اور اشاریہ سازی کے اس کام کی جانب توجہ نے کسی قدر اس مسئلے پر قابو پالیا ہے۔ اس کے باوجود سینکڑوں اردو ادب کے رسائل اور ذاتی کتب خانے ایسے ہیں جن میں چھپے خزانے تا حال تحقیق کاروں کے سامنے آنا ناگزیر ہے۔ یہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ جامعات میں ہونے والی سندی تحقیق میں تحقیقی کاموں کی نگرانی پر مامور اساتذہ کرام نو آموز تحقیق کاروں کو اس جانب توجہ دلائیں۔ کسی ایک رسالے کی مکمل فائل کو دیکھنے کے لیے ایک طویل وقت درکار ہوتا ہے اور اس کے باوجود کسی موزوں حوالے کا نہ ملنا کس قدر وقت کا ضیاع ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے اہل علم ہیں جو اپنے برسوں کی محنت کے بعد جمع کردہ کتابوں کی فہرست شائع کرانا چاہتے ہیں تا کہ نئے تحقیق کاروں کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے جس سے وہ دوچار ہورہے ہیں۔ فہرست سازی کا کام ہمارے ان کتب خانوں میں بھی ہونا ابھی باقی ہے جن میں ہزاروں کتابیں اور سینکڑوں رسائل پرمبنی ذخائر موجود ہیں۔

فہرست سازی اور اشاریہ سازی کو عام طور پر ایک فنی یا تکنیکی نوعیت کا کام تصور کیا جاتا ہے۔

جس میں دانش و بینش کم اور ایک خاص قسم کی مہارت فہرست ساز کے لیے کافی تصور کی جاتی ہے۔ لیکن محمد طاہر قریشی صاحب نے نعت ریسرچ سینٹر کے کتب خانے کی فہرست ترتیب دینے میں جس عرق ریزی، احتیاط اور ذہانت سے کام لیا ہے وہ نہ صرف اس تصور کو زائل کرنے کے لیے کافی ہے بلکہ فہرست سازی کے تعلق سے یہ کام نئے مباحث کے لیے دریچے بھی وا کرتا ہے۔

مرتب نے ۱۳۴۸ شعری کتابوں کی تفصیل میں جدید فہرست سازی کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفین، مرتبین اور مترجمین یا مولفین کے ناموں کے اندراج کے فوری بعد کتاب کا سن اشاعت درج کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا نام اور ان افراد کے ناموں کا اندراج کیا ہے، جنھوں نے اس میں مضامین و آرا تحریر کی ہیں۔ یہ ترتیب نہ صرف مذکورہ مصنف یا کتاب تک پہنچنے کے لیے سہل دکھائی دیتی ہے بلکہ مصنف کے نام کے فوری بعد سن اشاعت کے اندراج سے اس کی قدامت کا بھی فوری اندازہ ہوتا ہے۔ مقام اشاعت اور صفحات کی تعداد درج ہے۔ ہر کتاب کے سامنے کچھ فاصلے پر قوسین میں کتاب کا موضوع بھی ایک یا ایک سے زائد الفاظ میں رقم کیا گیا ہے۔ جو قاری کے لیے مزید آسانی کا باعث ہے۔ اس طرح نثری کتابوں میں ۷۳۱ کتابوں کی تفصیل کو مصنفین کے ناموں کے حروف تہجی کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی تفصیل میں جن جزئیات کا خیال خاص رکھا گیا ہے ان میں ابواب کے عنوانات اور مختصر نوٹ بھی تحریر کیے گئے ہیں جو کتاب کا تعارف حاصل کرنے میں ممد ہیں۔ مذکورہ کتاب کا موضوع تنقید، تحقیق، فہرست، ایم فل یا پی ایچ ڈی کا مقالہ، تذکرہ، مضامین و مقالات، میلاد، انٹرویو، آداب نعت، مسائل نعت، احوال و آثار بھی تحریر کیا گیا ہے۔ رسائل و جرائد کی تفصیل بھی ان کے ناموں میں حروف تہجی کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے۔ کسی رسالے یا جریدے کے ذیل میں رسالوں کے شماروں کی بھی تفصیل موجود ہے۔ فہرست کے آخر میں مرتب نے مزید آسانی کے لیے عنوانی اور ناموں کا بھی اشاریہ پیش کر دیا ہے۔

'عرض مرتب' کے عنوان سے مرتب نے کتاب کے آغاز میں فہرست سازی کی مشکلات، مندرجات کی ترتیب اور اندراجات کی وضاحت پر مبنی جو تجاویز رقم کی ہیں وہ یقیناً فہرست سازی

میں نہ صرف معیار کے طور پر اپنائی جا سکتی ہے بلکہ اس مضمون کو علیحدہ کسی ادبی رسالے میں بھی شائع ہونا چاہیے تاکہ اس جانب زیادہ سے زیادہ اہل نظر پڑھ سکیں اور ان مباحث کی جانب ان کی رائے بھی منظر عام پر آ سکیں۔

اردو کی ادبی تحقیق میں عالمی شہرت کے حامل محقق پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مذکورہ فہرست کی ترتیب کے حوالے سے اس فہرست میں موجود معروضہ کے عنوان میں کہنا ہے کہ "زیرِ نظر فہرست کئی اعتبار سے اہم ہے۔ ایک تو اس بنیاد پر کہ یہ ایک کتب خانے کی فہرست ہے جو ایک تخصیص رکھتا ہے۔ دوسری اہمیت یہ فہرست نعت اور متعلقات نعت کے ضمن میں مطالعہ و تحقیق کے ایک ماخذ کے حیثیت سے استفادے میں آتی رہے گی اور اپنے موضوع پر کتاب حوالہ بھی جائے گی جس کی اہمیت اور افادیت تا قیامت برقرار رہتی ہے۔ مزید..... اس فہرست کو ایک انفرادیت، خصوصیت اور توجہ یوں بھی حاصل رہے گی کہ یہ فہرست اردو میں موجود دیگر اس نوع کی فہرستوں کے مقابلے میں فہرست سازی کے جدید تر اور سائنٹفک اصولوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔

نام کتاب: یادیں مٹی نہیں   شاعر اکرام تبسم
مبصر: عطاء اللہ خان

اکرام تبسم کا شمار ہمارے ملک کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جو زود گو بھی ہیں اور کثیر التصانیف بھی۔ "یادیں مٹی نہیں" اُن کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ تخلیق وقت کا تقاضا کرتی ہے جبکہ اکرام تبسم صاحب تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں مگر وقت کے لحاظ سے کنگال، کیوں کہ وہ ماشاء اللہ ایک کامیاب تاجر ہیں اور اس حوالے سے اندرون اور بیرونِ ملک زیادہ تر حالتِ سفر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھریلو اور سماجی خدمات کی ذمہ داریاں اُن کا دامن تھامے رکھتی ہیں اور اس پر ستم یہ کہ اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کی ذمہ داری بھی پوری کرنا ہوتی ہے۔

اکرام تبسم کی شاعری ایک ایسے جھرنے کی طرح ہے جو عبادت گزاروں کے لیے سامان

وضو، تشنگان دین کو فرحت اور ذوقِ نظارگی کے لیے دل فریب و دل نشین تصویر کے لوازم پورے کرتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ بہت عمیق ہے مگر سادگیِ بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری ناقدین کے لیے فکر انگیز اور قاری کے لیے اثر انگیز ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین کو فنی اعتبار سے اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اور سننے والا لطف کے ساتھ ساتھ ان کی فکری بلندیٔ پرواز سے آشنا ہوتا ہے۔ اُن کے اس خوبصورت مجموعہ میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اُن میں ہجر و وصال کی کیفیات کے علاوہ مذہب، سماج، وطن اور دیگر معاشرتی موضوعات کو اپنی شاعری کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔ وہ بیان پر جس قدر قدرت رکھتے ہیں وہ اُن کے فن پر دسترس کی عکاس ہے۔ اُن کی کتاب کے چند اشعار کتاب اور صاحبِ کتاب کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

کون پہچانے گا ہم کو، کون دے گا احترام
دردِ دل رکھتے تھے جو وہ دیدہ ور ہی کھو گئے

رحمتِ مصطفےٰ نے کی آزاد
زندگی تھی گناہ میں جکڑی

ماضی بھی سوچوں کا حصہ بن جاتا ہے
گھر گر جاتے ہیں بنیادیں رہ جاتی ہیں

دار سے بہار کو اُتار لو
شہرِ حسن کی دُعا ہے انقلاب

دُعاؤں سے نہ کسی بد دُعا سے ڈرتا ہے
گناہ کرتے ہوئے دل خدا سے ڈرتا ہے

نام کتاب: موسم موسم ملتے تھے	شاعر: ظریف احسن
مبصر: شاہدہ حسن	ناشر: روش ویلفیئر ٹرسٹ انٹرنیشنل

''موسم موسم ملتے تھے'' کا ایک خوبصورت پاکیزہ سا ہیولا ہر محبت کرنے والے دل کے آنگن میں ایک نہ ایک دن چپکے سے ضرور اتر آتا ہے اور پھر بہت سے بے نام جذبوں کی خلش، حرف و لفظ کے پیراہن پہننے لگتی ہے۔ انسانی تعلقات کی یہ وسیع دنیا بے حد قدیم، پراسرار اور ہمہ رنگ ہے۔ یہاں ہر تعلق کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔

اک تعلق بھی کم نہیں ہوتا
سو تعلق بحال کرتے کیوں

کس تعلق کی امیدیں تھیں ہمیں
ہجرتوں کو بھی ثمر جانا تھا

اک تعلق کی استواری میں
پچھلی باتوں کو بھول جاتا ہوں

اس تعلق کو کون سمجھے گا
تیرا سودا تو میرے سر میں ہے

maablib.org

اک تعلق کی استواری ہے
زیست تم بن فقط گزاری ہے

کوئی لکھنے والا جب اپنی رفاقتوں، محبتوں، قربتوں اور دوریوں کے حوالے سے اپنا اظہار کرنے لگتا ہے تو خود اس کی اپنی ذات میں جذبوں کی دریافت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے ذریعے ہر شاعر دوسرے بہت سے دلوں سے اپنی گواہی کا طلب گار ہوتا ہے۔

ظریفؔ احسن کے اس اولین شعری مجموعے 'موسم موسم ملتے تھے" کی جو غزلیں اور نظمیں میرے مطالعے میں آئی ہیں وہ اس لیے مجھے اچھی لگ رہی ہیں کہ لطیف جذبوں، خوابوں کے علاوہ انسانی رویوں، زمانے کی شکست وریخت، سماجی و معاشرتی معاملات کے ساتھ دیگر موضوعات کو شعری تجربے میں ڈھالنے میں ظریفؔ احسن نے فکر و احساس کے کئی پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔

ایک آواز اٹھا لے جاتی ہے ہم کو
اک سائے کے پیچھے ہم بھی چلتے ہیں
تم سے پہلے ہم ہی خود کو پیارے تھے
اب یوں ہے ہم اپنے آپ سے جلتے ہیں

مگر وہ نشۂ یکتائی ٹوٹتا ہی نہیں
اگر چہ دیکھ لیا دُور تک بکھر کے بھی

اپنے حصے کے خواب لکھتا ہوں
آگہی کے عذاب لکھتا ہوں
جہاں دست و گریباں کا ہو خدشہ
ظریفؔ اس باب میں کم بولتا ہے

شہر کا شہر ہے ہاں اور نہیں کی زد پر
اور یہ جھوٹ نہیں تیرے طرف دار ہیں ہم

maablib.org MAAB 1431

وہ ایک رشتہ بڑا معتبر سا رشتہ تھا
جو اب سے پہلے مکینوں میں اور مکان میں تھا

یہ تماشا بھی دیکھتے جاؤ
اپنی باری کا کھیل جاری ہے

اُجڑے لوگوں سے دل بہلتا ہے
خود کو اک عمر سے سنوارا نہیں
دل دریچہ تو کب سے وا ہے ظریف
اس کے بن کوئی بھی نظارا نہیں

سرمئی شام جب بھی آتی ہے
میں اُداسی کے گیت گاتا ہوں

ایک بے کل اور اداس دل کی کوئی کیفیت، کوئی اضطرار، کوئی تشنگی، کوئی ناآسودگی جو زندگی کے اس سفر میں ظریف احسن کے حصے میں آئی ہے۔

کسی انجان رستے پر
کوئی چہرہ ابھرتا ہے
ہمارا دل دھڑکتا ہے
کوئی لمحہ کہیں جا کر رخِ ماضی سے جڑتا ہے
مگر جاناں!
جو سچ پوچھو
تمہارے بن کہیں کیسے
ہمارا دم نکلتا ہے

(احوال)

میں نے اپنے بارے میں
جو بھی کہا
وہ تیرا ہے
میں نے تیرے بارے میں
جو بھی لکھا
وہ میرا ہے (اثاثہ)

شب کی اپنی پرچھائیں ہے
دن کے اپنے تیور ہیں
کچھ یادیں ہیں، کچھ باتیں ہیں

اپنے اپنے شب و روز کے سب ہیں قیدی
روز و شب کے سارے منظر ناموں میں
جو چہرہ سب سے اجلا ہے
وہ تیرا ہے

(تم ہی ہو)

محبت، کیا ہوتا ہے، من آنگن، تعلق، خبر، خوشبو، پہلی بات، کیا تم کو کچھ یاد نہیں ہے، جدا نہ ہونا، مندرجہ بالا نظمیں اپنی رومانی فضا کے پس منظر میں ایک خاص جمالیاتی رخ پیش کرتی ہیں جبکہ کرب ذات، گریز کی اپنی ایک الگ فضا ہے دیگر نظموں میں سوداگر، فتح و شکست، دوام، بازی گر دنیائے عالم کے ایک خاص تناظر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بلاشبہ ظریفؔ احسن کا شعری مجموعہ ''موسم موسم ملتے تھے'' ممتاز اہمیت کا حامل ہے۔ ظریفؔ احسن شعر و ادب سے اپنی نسبتوں پر نہ صرف اعتماد رکھتے ہیں بلکہ یہی نسبت ان کی ذات کا خاصہ بھی ٹھہرتی ہے۔

نام کتاب: شکستہ آئینہ خانے	شاعر: حامد علی سید
مبصر: رؤف نیازی	ناشر: عالمی ادب فورم کراچی

ادب اپنے زمان و مکان، تہذیب و ثقافت، اور تخلیق کار کی ذہنی سطح اور طبعی رجحانات کا زائیدہ ہوتا ہے۔ بنابریں اس سے کسی ایک اور مطلق فکر یا حتمی اور کلی نظریہ کے ابلاغ و فروغ کی توقع رکھنا خیال خامی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی اس فن کاری پر پورا اترتا ہے تو لازما وہ تخلیقیت کے مقام سے نیچے آتا دکھائی دے گا۔ "شکستہ آئینہ خانے" کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے خالق حامد علی سید کی فکری اور تخلیقی جہات مختلف النوع ہیں۔ اس کی ایک جہت صحافیانہ بھی ہے۔ حرف برہنہ گفتن کی تمثیل ملاحظہ ہو:

گھر سے نکلے تھے بیچنے اخبار — بچے، تختی کتاب کیا لاتے

کبھی سوچا کسی نے اس نہج پر — ہمارا ملک آدھا رہ گیا ہے

مری تہذیب ہو آئین میرا — مری جمہوریت شائستگی ہو

کیا ترے پاس رہبر ملت — مسئلوں کا مرے کوئی حل ہے

مذکورہ بالا اشعار میں اس کا عہد بول رہا ہے۔ صاف، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں۔ درآں حال کہ زبان کا ترسیلی کردار غیر شفاف، مبہم اور نامکمل ہے۔ ایسے بہت سے اشعار کتاب میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ حامد کسی لگی لپٹی کے بغیر سہل ممتنع میں اپنی بات کہنے کا ہنر جانتا ہے۔

یہاں اب ایک ایسی فکری جہت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ جس کا آغاز تو آدم نے ایک ساتھی اور رفیق مانگ کر کیا تھا لیکن اس کی باقاعدہ تاریخ چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ انسان روز ازل سے تنہائی، بے گانگی اور افسردگی کا شکار ہے لیکن بات ہیگل کی اس ماورائیت سے کریں گے جہاں فرد خود کو مذہب کی ماورائیت کے سپرد کر کے، کار جہاں دراز سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔ مارکس نے اسے سرمایہ داری نظام میں نشان زد کیا ہے جہاں محنت کش سرمایہ کی منڈی میں بکاؤ مال بن کر خود سے alienate ہو جاتا ہے۔ وجودی مفکرین کرکگارڈ، مارٹن ہیڈیگر اور

سارتر نے اس allienation کا سبب ان منزل دبے مراد افراد کو بتایا ہے جو اپنے داخلی شعور اور تجربے کو کام میں لانے کے مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں اور افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بیگانگی کے دوسرے بڑے عوامل میں قدرتی آفات، جبری ہجرت، غربت و ناداری، منصب و مقام سے محرومی وغیرہ شامل ہیں۔ حامد کے چند اشعار جو اس آفاقی احساس کو پورٹریٹ کرتے نظر آتے ہیں۔

بے گھری محسوس کرتا ہوں میں گھر ہوتے ہوئے
جانے کیسا خوف ہے یہ بام و در ہوتے ہوئے

کوئی تو میرے ساتھ چلے تھوڑی دور تک
کوئی تو رہ گزار میں اپنا دکھائی دے

میں وہ آباد گھر ہوں بستی کا
جس میں کوئی بشر نہیں رہتا

تمام رات رہیں آسماں پہ نظریں
ہمیں تو کوئی ستارہ نظر نہیں آیا

اس تنہائی، خوف اور بے سکونی کو تخلیق کار نے اپنی خارجی آگہی اور داخلی شعور کی کسک کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملٹی کلچرل ازم اور ملٹی نیشنلزم کے دور میں چند قسطائیت پسندوں کا ماضی کی طرف مراجعتی سفر ایک بار پھر انسان اور کائنات کو ماورائیت کے اندھیروں میں ڈھکیلنے کے مترادف ہے۔ حامد علی سید کی عصری آگہی Retro-revival کے خلاف ایک جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا قلم پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

قدامتوں کی فصیلیں جو شخص ڈھاوے گا
مجھے یقیں ہے نئی بستیاں بساوے گا

یہ تیری فکر ہمیشہ سے جو قدیم رہی
اسے بھی وقت کے سانچوں میں ڈھالنا ہوگا

لے روشنی سے کام، اجالوں کی سمت آ
تیرہ شبی خیال سے اپنے، نکال کر

اور ساتھ ہی یہ انتباہ بھی ہے:

نہیں اب اتنا بھی آساں روشنی کا حصول
ہوا سے لڑنا پڑے گا دیا جلانے میں

حامد علی سید روشن خیالی کے تعلق سے برٹرنڈ رسل کے اس پیغام کو دہراتا نظر آتا ہے کہ روشن خیالی ایک من مانی طفلانہ سوچ سے باہر نکلنے کا نام ہے۔

شکستہ آئینہ خانے میں زندگی کے کئی روپ بہروپ ہیں۔ حامد کہتا ہے:

ایک تماشا ہے آگہی کیا ہے
اب یہ جانا کہ زندگی کیا ہے
اک تماشا ہے آرزوئے حیات
زندگی خواہشوں کا جنگل ہے

خواہشوں کے اس جنگل میں حامد علی سید کو اپنی ترجیحات کا تعین کرنا پڑے گا تا کہ اس کی ایک واضح شناخت ابھر کر سامنے آ سکے۔ اس کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں

سائے بھی دھوپ کے محتاج رہے ہیں اکثر
اچھا لگتا نہیں سورج سے عداوت رکھنا

maablib.org

نام کتاب: افسانچے	مصنف: محمود صدیقی
مبصر: ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	

محمود نے شاعری کے علاوہ افسانچے بھی لکھے ہیں۔ ان افسانچوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ معاشرے پر ان کی نظر کس قدر ہے وہ گہرائی میں جا کر نتائج اخذ کرنے کے عادی ہیں اس طرح وہ زندگی کے بے باک ترجمان ہیں۔ انہیں اس بات کا شعور ہے کہ موضوع کے حوالے سے بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہو جاتی ہے وہ شدت کے ساتھ پنچ لائن کا استعمال کرتے ہیں۔ دراصل یہ اصلاح کا شدید جذبہ ہے افسانے کا مکمل فلسفہ ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے تو قاری حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ محمود ذہانت کے ساتھ ساتھ فقرے بازی جس میں طنز کی تیز دھار بھی ہوتی ہے یہاں بھی ان کا مقصد ہوتا ہے اس مقصد کے خاطر وہ افسانچہ تخلیق کرتے ہیں۔ ہر چند یہ واقعات بہت مختصر ہوتے ہیں لیکن ان میں بلا کی طنز کی گہرائی ہوتی ہے۔ وہ قاری کو چونکا دینے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ سارا پس منظر بھی سامنے آ جاتا ہے اس میں بدلتے ہوئے رجحانات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ دل چسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ اس میں وہ پس منظر ہی نہیں پیش منظر کو بھی خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں برجستگی اور خیال افروزی بھی نمایاں رہتی ہے۔ یقیناً ان کے ہاں زیادہ تفصیل نہیں ہوتی ہے لیکن ان کے اشارے کنائے بے حد کاٹ دار ہوتے ہیں وہ قاری کی توجہ کو ایک جگہ مرکوز رکھتے ہیں۔

محمود اپنی شگفتہ بیانی کے حوالے سے سنجیدگی، طنز و ظرافت کے ساتھ ساتھ فلسفے افسانے کی فضا اور ماحول میں رنگ بھرتے ہیں۔ مناسب الفاظ کا استعمال مناسب جگہ کر کے اپنے مقصد کو نمایاں کرتے ہیں۔ زبان و بیان کا اپنا ایک لطف ہے۔ ان افسانچوں میں ان کے مشاہدوں نے اضافہ کیا ہے۔ ان میں جذبات نگاری اور کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے تو نہیں ہیں کہیں کہیں دل چسپی کا تار بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور قاری جلد سے جلد انجام کا انتظار کرتا ہے۔ اس لیے کہ انجام ہی محمود کی پنچ لائن ہے۔ یہ افسانچے ہر گھر کی کہانی ہیں محمود کی باریک بین نگاہ زندگی کے مختلف مسائل اور ان کے اثرات کا جائزہ لینے پر قادر ہے۔

عذرا اصغر

"شامِ تزئین"

صاحب صدر اور مہمانان گرامی خصوصی وعمومی!

قرنوں سے دلہن کی رونمائی ہوتی آئی ہے۔ کتابوں کی رونمائی کی رسم بھی رواج پا چکی ہے۔ لیکن آج ایک ایسی شخصیت کی رونمائی ہے جو شاعرہ بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ لیکن جن کی ابھی کوئی تخلیق کتابی شکل میں سامنے نہیں آئی۔ یوں وہ سینکڑوں شعر کہہ چکی ہیں اور دسیوں تنقیدی مضامین قلمبند کر کے جرائد میں چھپوا چکی ہیں۔ تو خواتین وحضرات یہ ہیں تزئین زیدی رازؔ صاحبہ آپ کے سامنے، آپ کے روبرو۔ ان کا شعری مجموعہ زیر طبع ہے۔ جس کی رونمائی بعد از طبعات۔

انشاءاللہ.....!

تزئین زیدی کئی اوصاف طبع اپنے اندر مخفی رکھتی ہیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنا تخلص رازؔ رکھا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت راز رہ نہیں پاتی یا یوں سمجھ لیجئے کہ ملنے جلنے والے، احباب ان کے اوصاف کھوج نکالتے ہیں۔ ویسے رازؔ کی اصل حقیقت یوں ہے کہ لڑکپن میں ہی محترمہ شاعری کی لت میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ اور ہر برے کام کی طرح بزرگوں سے چھپ چھپ کر اشعار گردی کرتی تھیں۔ شاعری ان کے لڑکپن کی پہلی پہلی محبت تھی جسے راز میں رکھنا لازمی تھا۔ لہذا تسکین قلب کے لیے تخلص ہی رازؔ رکھ لیا مگر جب بچپن بیت گیا اور تعلیمی مستقبل پر متلی پرچھائیں تک نہ پڑی تو یہ راز بھی راز نہ رہا اور بھید کھل گیا۔

یوں بھی عہد شباب میں بہت سے راز از خود فاش ہو جاتے ہیں۔ تزئین زیدی کا شعری راز فاش ہوا تو یہ رازؔ تخلص سے بھی دست کش ہو گئیں۔

ملنے سے پہلے ہم نے جناب رؤف نیازی سے متعدد بار ان کا نام سنا تھا اور تعریفی انداز میں سنا تھا۔ رؤف نیازی ادب کے ہی تنقید نگار نہیں ہیں انسان اور انسانیت کے پارکھ ہیں۔ کڑی نظر

سے انسان کو پرکھتے ہیں اور گہری نگاہ تخلیق پر ڈالتے ہیں۔ پھر جو نظریہ قائم کرتے ہیں بلا مروت و لحاظ اور بے کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی انسان کے بارے میں اچھی رائے دیں تو ماننی پڑتی ہے۔ لہذا تزئین زیدی کے بارے میں بھی ہم نے ان کی رائے بلا تردد مان لی۔ بلکہ ملنے کی تمنا جاگی، اشتیاق پیدا ہوا اور بڑھتا گیا۔ دراک کی ایک نشست میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ پہلی ملاقات بے حد کی رہی۔ یعنی ان کی شخصیت مکمل طور پر راز ہی بنی رہی لیکن پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں رفتہ رفتہ قربتیں بڑھتی گئیں اور کسی حد تک وہ ہم پر کھلتی گئیں۔ اپنے اس شعر کے مطابق شاید وہ سوچتی ہوں:

آرزوئے دل کو گویا سر برہنہ کر دیا
میں نے اظہار تمنا کرکے یہ کیا کر دیا؟

گویا اپنی بے تکلفی پر وہ خود حیران ہوتی ہیں۔ تزئین خوش طبع ہیں، خوش خو ہیں، خوش مزاج ہیں، خوش پوش ہیں، خوش خلق ہیں۔ یعنی کئی 'خوش' لفظ ان کی خوش رنگ شخصیت سے وابستہ ہیں۔

سامعین کرام! ابھی آپ نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بیان سماعت فرمایا۔ مگر میرا موقف یہ ہے کہ یہ تقریب ان کی کسی تخلیق کے سلسلے میں منعقد نہیں کی گئی بلکہ ان کی شخصیت کے حوالے سے ایک شام کا انعقاد کیا گیا ہے تو بات بھی شخصیت کے حوالے سے ہی ہونا چاہیے۔

لیجئے ان کی احتیاط پسند طبیعت کے حوالے سے انہی کا کیا خوب شعر ہے:

ہم نے اس ایک نام کی مالا جپی مگر
اس احتیاط سے کہ نہ آئے زبان پر

شعر کی بات نکلی ہے تو ایک شعر اور سن لیجئے:

خونِ ناحق کا یہ الزام نہ لگتا مجھ پر
آرزوؤں نے اگر سر نہ اٹھایا ہوتا

اب ذرا ان کے صبر و قناعت کا عالم بھی دیکھئے:

میں چار تنکوں کو ہی آشیاں سمجھ لیتی
وہ چار تنکے اگر ہوتے آشیاں کی طرح

تنقیدی رجحان بھی تزئین میں جبلی طور پر موجود ہے۔ خاموش طبعی سے وہ انسان کا مطالعہ کرتی ہیں اور گہری نظر سے تخلیقات کا۔ وہ اب تک متعدد تنقیدی مضامین تحریر کر چکی ہیں اور آج کل فیض احمد فیض کے فکر و فن پر مقالہ تحریر کر رہی ہیں۔ یقیناً یہ ایک تحقیقی کام ہے اور امید واثق ہے کہ تزئین زیدی یہ کام بہ احسن و خوبی کر پائیں گی۔ ان میں تحقیقی و تنقیدی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ محقق و شاعرہ کے علاوہ ان کی ایک تیسری جہت بھی ہے اور وہ ہے ماہر تعلیم کی۔ وہ بحریہ کالج میں شعبہ اردو کی صدر بھی رہی ہیں۔ اور یہ ایسی جہت ہے جس سے دیگر جہات کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ لیکن تخلیقی ذہن عطیہ خداوندی ہے۔ علم اس صلاحیت کو جلا تو بخش سکتا ہے، پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت ان کے اشعار سے عیاں ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

دل کی بستی کے حالات ہیں کچھ عجب
جو تمنا ملی سو ملی جاں بلب!

یا ان کی بصیرت کا گواہ یہ شعر:

محتاط چل رہا ہے یہاں جس کو دیکھئے
رشتوں پہ اعتبار کی عادت نہیں رہی

تنقید کے باب میں ان کا ایک اقتباس دیکھئے جو حامد علی سید کی شاعری کے ضمن میں ہے:

''اس کی معشوقہ شاعری نے اسے کیا نہیں دیا؟
تنہائی کے بوجھل لمحوں میں رفاقت کا بھرپور احساس، خیال کو رستہ، سوچ کو محور، اظہار کی قوت، احباب کی الفت، اصحاب کی قربت، اشعار کی دولت، پہچان کی صورت''

''بولتے چہرے اور سوچتی آنکھوں والی شاعرہ'' کے عنوان سے اپنے ایک اور مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''رخسانہ شبہ طراز کے کرب آگہی کی بولتی تصویر ہے۔ جو زندگی کی بے ثباتی، بے بضاعتی کے بارے میں اشتباہ و شکار ہیں۔ وہ انسان کی بے بسی اور تقدیر کی بالادستی سے واقف بھی ہے خائف بھی اور حیران بھی اور شاید اس سے نالاں بھی''

ارشادات

نجیب عمر

مکرمی صفدر علی خاں صاحب۔ تسلیمات!

'انشا' کا تازہ شمارہ (۶۸) نظر نواز ہوا۔ آپ کی عنایت، اس دور میں ادب کی خدمت کرنا، خصوصاً ادبی رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ کی سعیٔ پیہم کے لیے دعا گو ہوں اور 'انشا' کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ 'انشا' کا آئندہ شمارہ خاکہ نمبر ہوگا۔ اس خط کے ہمراہ ایک خاکہ بعنوان 'موتی' ارسال کر رہا ہوں جسے لکھا تو کئی برس قبل تھا لیکن اس کی تازگی برقرار ہے۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گا اور شامل اشاعت ہوگا۔

اس شمارے میں جناب احمد صغیر صدیقی کا افسانہ 'خواب کہانی' بہت پسند آیا۔ حضرت ایک کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں۔ انہوں نے بے حد خوبصورت اور متاثر کن افسانہ پیش کیا ہے جس کا اختصار اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ نیاز کیش

شاہین زیدی

مدیرہ......نوادر

محترم صفدر علی خاں صاحب ۔ السلام علیکم

یاد آوری کے لیے شکریہ۔ انشا باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس دفعہ کے شمارے میں بہت معلوماتی اور خوبصورت مضامین پڑھنے کو ملے۔ ان معلوماتی مضامین سے ہمارے ادبی طالب علموں کو جہاں پروفیسر حضرات کی تحریروں سے استفادے کا موقع ملے گا وہیں پر انشا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ ادبی مضامین کی اتنی معیاری اور اعلیٰ تعداد شائع کرنے پر انشا

پہلے نمبر پر آ گیا ہے۔ خاص طور پر پروفیسر عتیق احمد جیلانی صاحب اور یونس حسن صاحب کے مضامین پڑھ کر بہت لطف آیا۔ عتیق احمد جیلانی صاحب نے "اردو ادبی رسائل کی تحقیقی اہمیت پر بہت دل جمعی سے مضمون تیار کیا اور اپنے قارئین کی معلومات میں بہترین اضافہ کیا ہے۔

انشا میں شعر و شاعری کا گوشہ بھی بہت پسند آیا۔ رئیس فاطمہ صاحبہ اور دیگر شعراء کا بہترین کلام پڑھنے کو ملا مجموعی طور پر اس شمارے میں تمام مضامین اور تمام حصے داد طلب ہیں۔ اس ادبی اور معیاری پرچے کی اشاعت پر آپ مبارکباد قبول کیجیے اس دفعہ بھی انشا اپنی انفرادیت کی روایت قائم رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنا ناول آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے اور اپنی دو عدد نظمیں بھی ارسال کر رہی ہوں۔

بہرام طارق

قابل احترام صفدر علی خاں صاحب۔ آپ سلامت رہیں

آپ کے موقر ادبی میگزین 'انشا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کا میگزین بہت شاندار ہے۔ بعض مضامین اور سلسلے کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ایک بار میگزین پڑھا۔ تو بس پھر ہر شمارہ پڑھنے کا ارادہ باندھ لیا۔ میگزین کے صفحات کے توسط سے اپنے دیرینہ احباب سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ان کی تازہ تخلیقات بھی پڑھنے کے لیے مل جاتی ہیں۔ اردو زبان اور ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے آپ کی خدمات یقیناً قابل ستائش ہیں۔ زیر نظر شمارے کے متعدد صفحات دلکش اور خاصے پُر اثر ہیں۔ آپ کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعا گو ہوں۔ جملہ احباب اور 'انشا' کے تمام اسٹاف ممبرز کو دعا و سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

غالب عرفان

بھائی صفدر علی خاں صاحب۔ السلام علیکم

انشاء کا تازہ شمارہ موصول ہوئے دو ہفتے سے زیادہ بیت چکے ہیں۔ مگر رسید دینے میں تاخیر کا مرتکب اس لیے ہوا کہ صاحبزادے تقریباً چار سال بعد اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ واپس آئے، دو ماہ ٹھہرے اور روانہ ہو گئے تو وقت کا پتہ نہ چلا۔ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا'' ابھی تک پوتے اور پوتیوں کی خوشبوئیں، رگ جاں میں بسی محسوس ہو رہی ہیں! شمارہ نمبر ۶۸ بھی ہمیشہ کی طرح میری دلچسپیوں کا باعث رہا۔ ادبی مضامین میں ندرت اور علم کا خزانہ موجود تھا۔ مجھے بطور خاص 'لسانیات غالب' پسند آیا جس میں یونس حسن صاحب نے مقصود حسنی کی کتاب پر صرف ۱۲ صفحات میں بہت ہی خوبصورتی سے کتاب کی روح کو سمیٹ لیا ہے۔ افسانوں میں مختصر ترین افسانہ نجیب عمر کا 'شانتی نگا۔ موصوف نے آج کے بالخصوص کراچی کے معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ اور خوب اچھی طرح رکھی ہے۔ نجیب عمر اگر چہ اس میدان میں نئے نئے ہیں لیکن اُن کے قلم کی اٹھان بتا رہی ہے کہ وہ جلد ہی افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام حاصل کر لیں گے۔ رئیس فاطمہ کا افسانہ 'جو رہی سو بے خبری رہی'' اگر چہ ایک معیاری افسانہ تھا پھر بھی نہ تو موضوع نیا تھا اور نہ ہی اسے برتنے کے طریقے میں کوئی کشش! اس کی بے جا طوالت نے مزید بور کیا۔ غزلوں کی اشاعت میں حسن ترتیب کی کمی نظر آئی۔ بہر حال، غزل کی اشاعت پر شکر گزار ہوں ویسے میں نے چند روز قبل بھی ظفر محی الدین کی کتاب 'سرورق کی لڑکی' پر تبصرہ بھیجا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟ حسب معمول اس خط کے ساتھ ایک تازہ غزل پیش ہے۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ مخلص

عشرت رومانی

برادرم صفدر علی خان۔ سلام و نیاز

انشا کا تازہ ترین شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ محترم مختار اجمیری کی غزل اور یمنیٰ زاسید کی نظم 'آخری منزل' نے بہت متاثر کیا۔ مختار اجمیری کی غزل لفظیات کی تازگی اور اندرونی نغمگی سے مرقع ہے۔ اویس اور عروسہ نے گلشن اقبال بلاک ایک سے زندگی کے آخری سفر کا آغاز کیا اور وہ دونوں ہماری سوچ سے بہت آگے نکل گئے۔ اب ہمیں اپنے زخم برداشت کرنے ہوں گے۔ وقت تو گزر تا رہے گا مگر ایر بلیو کا حادثہ جاں گسل یادوں کے ساتھ دل و دماغ پر ایک ایسا خواب بن کر رہ جائے گا جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

یمنیٰ زاسید کی نظم اس حادثے سے وابستہ افراد کے غم واندوہ کی آئینہ دار ہے انہوں نے اس جاں سوز اور دل گداز نظم کے ذریعے جو تصویر پیش کی ہے وہ آنسوؤں سے بھی پر ہے۔

ایر بلیو کے حادثے نے کتنے ہی روشن چراغ گل کر دیے۔ چھ ماہ سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے مگر ابھی تک کسی بھی ایم این اے یا سینیٹر یا بر سر اقتدار حکومت کے اتحادی اور مخالفوں نے لواحقین کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ حادثے کی رپورٹ مکمل طور پر سامنے نہیں آئی شاید یہاں بھی نوکر شاہی کا دخل ہے یا ہم لوگ بے حسی کی معراج پر پہنچ کر پتھر بن گئے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سبھوں پر رحم کرے۔ آمین

سید شاہ عالم زمرد

محب گرامی صفدر علی خاں صاحب

گلہائے عقیدت، اللہ سدا شاد باد رکھے۔ شمارہ ۶۸ باصرہ نواز ہوا۔ ممنون ہوں آپ

maablib.org

نے یاد رکھا۔ انشا خالصتاً ادبی اور خوبصورت شمارہ ہے۔ جس میں نامور ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں اس نازک دور میں ادب کو زندہ رکھنا آپ ہی کی جہد کا کرشمہ ہے۔ احمد صغیر صدیقی نجیب عمر اور پروفیسر رئیس فاطمہ کے افسانے بے حد پسند آئے۔ خاکہ نمبر کا انتظار رہے گا۔ ایک نظم تمنائے کر حاضری دے رہا ہوں۔ قبول فرمایئے۔ نیاز مند

اسد عباس خان (جھنگ)

برادرم صفدر علی خاں صاحب

مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے۔ اور یہ شعر شہزاد نیر کا ہے، شہزاد نیر ایک ایسا شاعر ہے کہ جس کی شاعری میں اول سے آخر تک صرف شاعری ہی جاری وساری ہے:

دشمن کی پہچان کہاں پھر اس کا دھیان کہاں
اندھوں کو سالار کیا، بے دیکھے وار کیا

عجیب صورت حال ہے کہ آج ہم نے اندھوں کو سالار کیا ہوا ہے، ہماری ادبی صورتحال سے لے کر سیاسی، قومی اور ملی صورت حال تک ہمارے تمام سالار اندھے ہیں۔

صفدر علی خاں صاحب! ہم ایک مختلف صورتحال میں زندہ ہیں۔ ہمارے ذہن مفلوج اور جذبے کند ہو چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ہی ہماری شعری اور ثقافتی تہذیبیں مرتی جا رہی ہیں۔ شعر وسخن کی موت کے اعلان جاری ہو رہے ہیں۔ اس تاریکی میں نذیر قیصر، علامہ ضیا حسین ضیا، محمد شفیع بلوچ، شہزاد نیر، انور سدید، میر ظفر حسن، شاکر کنڈان، اور احمد صغیر صدیقی کی تحریریں اور شاعری اور زرنگار، تجدید نو، انشا، قرطاس، سنبل، پیغام آشنا، روشنائی، نقاط، العارفین، نوازش، عکاس، اور پہچان جیسی ادبی دستاویزات روشنی بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔ نذیر قیصر نے کہا تھا کہ ''ہم نے ایک جنت کی خواہش میں اپنے اندر کتنے دوزخ بھر لیے ہیں'' بری شاعری سے پیٹ بھرنا اپنے اندر دوزخ بھرنا ہے۔ بری طرح کی ہوئی شاعری بھی شاعر کو سزا دیتی ہے۔ ہم اچھی شکلوں، اچھے رنگوں، اچھے چہروں اور اچھی آوازوں سے ڈرتی

ہوئی قوم ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں وہ تخلیقی لمس نہیں رہا جو شعر سے آشنا ہوتا ہے کیونکہ ہم اس اپاہج معاشرے کے دہانے پر کھڑے ہیں جہاں لتا، محمد رفیع، مکیش، کشور، نور جہاں جیسے لوگوں کے نغمے دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں مہدی حسن کی غزلیں سسک رہی ہیں۔ اب استاد برکت علی خان اور سلامت علی خان کی سترا کھماج میں 'لاگے تو سے نین' کون سنتا ہے تال دیپ چندی کے 'بھیرویں پوربی انگ' اور پنڈت بھیم سین جوشی کے سترا گارا کے لیے کس کے پاس وقت ہے۔ یاد کرنے والی چیزیں ہم نے بھلا دیں کس طرح ہم اپنے ادبی، ثقافتی ورثے سے دور ہو گئے!!!

تازہ انشا کا شمارہ بہت سے سوالات اور مباحث کو جنم دے رہا ہے۔ سوالات پیدا نہ ہوں تو جوابات تلاش نہیں کیے جا سکتے۔

خورشید بیگ میلسوی کی حمد اور نعت سے حرف حرف عشق جھلکتا ہے، میلسوی صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری سے تازگی کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ جو آپ نے اب کی بار مضامین کا انتخاب کیا ہے اتنا کڑا، جاندار اور شاندار ہے کہ بس۔ یہاں امر یہ درپیش ہے کہ کس مضمون نگار کا نام لیا جائے اور کس کا نہ لیا جائے۔ طنز و مزاح سے قطع نظر، فرمان فتح پوری کے مضمون سے لے کر حیدر طباطبائی کے مضمون تک ایک کہکشاں بنتی ہے، تمام مضامین دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ہر صاحب کا اپنا اسلوب ہے۔

غزلیں پڑھیں، اچھی لگیں مگر یہ شعر بار بار پڑھا۔ اور لطف اٹھایا اور بہت لطف اٹھایا:

ہم کو کہ جو تھے درون خلوت
وحشت کو خبر میں رکھ لیا
(احمد صغیر صدیقی)

خواب کہانی، انتہائی عمدگی سے لکھی گئی کہانی ہے۔ کہانی کا سارا جمال اس کے اختصار میں ہے اور یہ جمالیہ اختصار جلال میں تبدیل ہو رہا ہے۔ رئیس فاطمہ کا افسانہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ بڑے افسانے (کہانی) کو مختصر ہونا چاہیے) اور اچھے افسانے کو اس

سے بھی زیادہ مختصر ہونا چاہیے (بسمت جان)۔ نظموں کا انتخاب لاجواب ہے۔ بالخصوص میر ظفر حسن کی اور عینی از سید کی نظمیں اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر پرچہ شاندار ہے اور بہت ہی خوبصورت ادب پیش کیا گیا ہے اس ادبی دستاویز کے لیے ہمیں صفدر علی خاں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

کرامت بخاری

برادر محترم صفدر علی خاں صاحب السلام علیکم

آپ کا انشا نظر نواز ہوا خط لکھنے میں تاخیر ہوگئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ہمارا دور خلفشار کا دور ہے مادیت کا عفریت پنجے گاڑ رہا ہے۔ انسان ابتلا کا شکار ہے۔ تنہائی اور مایوسی بڑھتی جارہی ہے ایسے حالات میں آپ کا ادب سے جڑے رہنا اور زبان و بیان کی خدمت کرنا عبادت کی طرح ہے۔ جہاں خاندانی نظام ٹوٹ رہا ہو، اقدار اور روایات ٹوٹ رہی ہوں وہاں ادیب کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اللہ کرے سب احباب اچھے ہوں۔ آجکل staff college ٹریننگ پر ہوں۔ مصروفیت زیادہ ہے۔ دعائیں۔ مخلص!

صاحبو! تزئین کی تنقید میں تخلیقی معنویت کی خصوصیت بھی موجود ہے اور دلکشی بھی۔ ان کی تنقید ان کی شخصیت کی طرح بھاری بھر کم ہے مگر بوجھل اور بدنما نہیں ہے۔ فکر کی جولانی و تدبر ان کی تحریر کا حاصل ہی نہیں ہے ان کی شخصیت کا حصہ بھی ہے۔

آج کی شام اترتی بہار کی ایک شام ہے جسے شام تزئین زیدی نے اپنے گلاب رنگ میں بہار آفرین کر دیا ہے۔

تزئین آپ کو یہ شام مبارک ہو۔ خدا کرے اور بہت سی ایسی شامیں آپ کی زندگی میں آئیں اور بار بار آئیں۔ آمین!

maablib.org

ضیاء اللہ کھوکھر

فہرست خاکے

بزم چراغاں: سلیمان اطہر جاوید، مکتبہ جدید نئی دہلی ۲۰۰۳ء، ۱۳۳

بزم دانشوراں (مجموعہ مضامین): صالحہ عابد حسین، ہریانہ اردو اکیڈمی فرید آباد ۱۹۸۷ء، ۱۸۳

بزم رفتگاں جلد اول: صباح الدین عبدالرحمٰن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۱ء، ۳۶۰

بزم رفتگاں جلد دوم: صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۱ء، ۲۹۱

بقائے دوام: قمر یورش، ادبستان پبلشرز اسلامیہ پارک لاہور ۱۹۸۵ء، ۱۹۰

پاکستان محبت: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۸۹ء، ۱۳۲

پوچھیں تو جانیں: مبارک مونگیری، مبارک مونگیری میموریل اکیڈمی اردو بازار لاہور ۱۹۹۴ء، ۳۰۳

بہار کے پہلے پھول، تعزیتی حاشیے: جیلانی بی اے، تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور ۱۹۹۴ء، ۳۰۳

بہار کے نو چراغ: سید محمد حسنین، اردو سوسائٹی بہار پٹنہ ۱۹۵۴ء، ۱۷۳

پیار محبت نازک خیالاں: ڈاکٹر آفتاب احمد، مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۸۸ء، ۳۸۷

بیسویں صدی کے تیر و نشتر: خوشتر گرامی، بیسویں صدی دریا گنج دہلی ۱۹۷۳ء، ۴۳۰

بیدار دل لوگ (شخصی خاکے) شاہ محی الحق فاروقی: اکادمی بازیافت کراچی ۲۰۰۳ء، ۲۷۸

پراگندہ طبع لوگ: غلام رضوی گردش، اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ ۱۹۸۱ء، ۱۵۶

پراگندہ طبع لوگ: داؤد رہبر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء، ۳۲۲

پورٹریٹ: رحیم گل، مکتبہ ارژنگ پشاور ۱۹۷۹ء، ۲۰۰

پورٹریٹ: رحیم گل، دراجہ بک ہاؤس انارکلی لاہور ۱۹۹۴ء، ۱۶۸

پیاز کے چھلکے: ممتاز مفتی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۸ء، ۲۳۲

تابندہ و پائندہ: سید محمد قاسم نوری، کوہ نور پبلی کیشنز لاہور ۱۹۶۸ء، ۱۹۰

تماشائے اہل قلم: محمد لطف اللہ خاں، مکتبہ دانیال کراچی ۱۹۹۶ء، ۳۶۸

تیور: نعمان منظور، ریاض گروپ آف پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء، ۱۷۳

جان پہچان: نظیر صدیقی: اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۷۹ء، ۲۳۰

جان پہچان: نظیر صدیقی، کاروان ادب ملتان ۱۹۹۱ء، ۲۰۳

جان پہچان (حصہ دوم) محمد ہارون پاشا، تابندہ پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء، ۲۳۰

جانے پہچانے لوگ: رضا علی عابدی، مکتبہ دانیال کراچی ۲۰۰۳ء، ۲۵۷

جانے پہچانے لوگ: قمر یورش، ادبستان پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء، ۱۲۸

جانے پہچانے لوگ: قمر یورش، طہ پبلی کیشنز اردو بازار لاہور ۲۰۰۳ء، ۱۹۲

جانے والوں کی یاد آتی ہے: صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۳ء، ۳۳۲

جراثیم ادب، شریف الدین عظیم آبادی، کراچی ۱۹۸۸ء ۳۱۰

جلتے بجھتے سورج: قدرت اللہ شہزاد، مکتبہ الہام بہاولپور ۱۹۹۹ء ۱۱۲

جلوہ ہائے صد رنگ: ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۸۵ء، ۱۹۲

جمال ہمنشیں، لطیف کاشمیری، ادارہ علم و دانش شاہ نذر دیوان راولپنڈی، ۱۹۸۵ء، ۱۶۰

جناب محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۱ء ۳۱۵

جنہیں میں نے دیکھا، کوثر نیازی، جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء ۲۲۰

جنہیں ہم بھول بیٹھے ہیں (یاد رفتگاں) ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزم علم و فن سرگودھا ۲۰۰۳ء ۳۲۰

جو ملے تھے راستے میں، احمد بشیر ایونس جاوید، گورا پبلشرز لوئر مال لاہور ۱۹۹۶ء ۲۹۱

چالیس چہرے، رفیق ڈوگر، عقاب پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۷ء ۱۲۸

چاند چہرے، اے حمید، مکتبہ قریش اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء ۵۲۰

چراں والا کورو: ڈاکٹر سید امجد حسین، پبلک آرٹ پریس پشاور ۲۰۰۳ء ۲۷۵

چند ادبی شخصیتیں: شاہد احمد دہلوی، مکتبہ جدید نئی دہلی ۲۰۰۳ء ۲۷۰

چند ارباب کمال، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ۳۲۰

چند بزرگ، اختر حامد خاں، بزم ارباب سخن پاکستان کراچی ۱۹۸۲ء ۲۰۰

چند تصویر بتاں، عبدالسلام قدوائی ندوی / مشیر الحق، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۹ء ۱۲۸

چند معتبر حوالے، امجد علی شاکر، سنگت پبلشرز لاہور ۲۰۰۶ء، ۱۷۶

چند نا قابل فراموش شخصیات، عبدالرحمن خان منشی، عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان ۱۹۸۰ء ۳۳۶

چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۲۰۰۳ء ۱۳۰

چند یادیں، خواجہ جمیل احمد، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۷۷ء ۵۱۲

چند یادیں چند تاثرات: عاشق حسین بٹالوی، آئینہ ادب انارکلی لاہور ۱۹۶۹ء، ۳۳۸

چہرہ در چہرہ، مجتبیٰ حسین، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی ۱۹۹۳ء ۱۵۲

چہرہ نما: شاہد حنائی، اکادمی بازیافت کراچی ۲۰۰۱ء، ۱۲۶

چہرے، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۲ء، ۲۱۵

چہرے باتیں یادیں لوگ، اطہر رضوی، اکادمی بازیافت کراچی ۲۰۰۸ء، ۲۱۳

چہرے مہرے، حمیدہ اختر رائے پوری، مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۲۰۰۳ء ۲۰۰

چہرے مہرے، رفیق ڈوگر، جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۱ء ۲۲۳

چہرہ نما: محمد منصور آفاق: ۱۹۸۵ء ۷۱

حرف برہنہ، شور صہبائی، ارتقا مطبوعات یونیورسٹی روڈ کراچی ۲۰۰۳ء ۱۳۰

خاکہ نگری، اشفاق احمد ورک، اکادمی بازیافت، کراچی ۲۰۰۲ء ۱۹۲

خاکہ نما، منظر علی خان منظر، افسر پبلی کیشنز فیڈرل بی ایریا کراچی ۱۹۹۱ء ۲۲۳

خاکی خاکے، سلمان باسط، استعارہ، اسلام آباد ۱۹۹۹ء ۱۱۳

خاکے: عوض سعید، مکتبہ شعر وحکمت حیدرآباد دکن، ۱۹۸۵ء ۱۳۹

خدوخال، رحیم گل، رابعہ بک ہاؤس انارکلی لاہور ۱۹۹۳ء ۱۱۰

خوش باشیاں، یوسف عالمگیرین فائن پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ۱۱۸

دبستانوں کا دبستان، احمد حسین صدیقی، فضلی بک سپر مارکیٹ کراچی ۲۰۰۳ء ۵۳۶

درد آشنا چہرے، کشمیری لال ذاکر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۹۸ء ۱۶۰

دس پھول ایک کانٹا، خواجہ افتخار، خواجہ پبلشرز نسبت روڈ لاہور ۱۹۸۳ء ۲۲۸

دل کے قریں رہتے ہیں، احمد یوسف ایجوکیشنل ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء ۲۰۷

دلی والے، ڈاکٹر صلاح الدین، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۱ء، ۳۵۷

دلی والے، (جلد سوم) ڈاکٹر صلاح الدین، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۳ء، ۳۰۷

دلی والے، (جلد چہارم) ڈاکٹر صلاح الدین، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۷ء، ۳۷۲

دوسرا البم، فارغ بخاری، آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور ۱۹۸۳ء، ۱۹۰

دھنک کے باقی ماندہ لوگ، امراؤ طارق سیپ پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۶ء ۱۸۳

دیار خوش نفساں، غلام رضوی گردش، معیار پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۲ء، ۳۳۵

دید باز دید، تابش مسعود الحسن دہلوی، حیات اکیڈمی فیڈرل بی ایریا کراچی ۱۹۹۰ء ۱۷۸

دید وشنید، رئیس احمد جعفری، کتاب منزل کشمیری بازار لاہور، ۱۹۴۸ء، ۵۷۶

دید وشنید، ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی شیر بہادر، الشفا ایبٹ آباد، ۵۴۳

دید وشنید، رئیس احمد جعفری، رئیس اکیڈمی گلشن اقبال، کراچی ۱۹۸۷ء ۳۷۳

شرف ملاقات، محمود علی، گورا پبلشرز لاہور ۱۹۹۷ء ۲۶۲

شناخت پریڈ، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور ۱۹۹۳ء ۱۳۶

صورت گران عصر، عطش درانی، مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۸۷ء ۱۷۶

ضلع بجنور کے جواہر، فرقان احمد صدیقی، مجلس اشاعت ادب نئی دہلی، ۱۹۹۱، ۲۶۳

طویل نظم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، گابا سنز اردو بازار جناح روڈ کراچی، ۱۹۹۳ء ۷۶

عزیزان محترم، عبدالعزیز بلوچ، مرکز ادب حسین آگاہی ملتان، ۱۹۷۵، ۱۵۲

عظمت رفتہ، ضیاء الدین احمد برنی، تعلیمی مرکز گیدول لکھراج روڈ کراچی، ۱۹۶۱ء ۵۱۲

عظمت کے نشان، محمد الیاس الاعظمی، ادب کدہ اعظم گڑھ ۲۰۰۵ء، ۲۹۶

عکس بر عکس، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ۳۶۲

عکس و شخص، عنوان چشتی ادارہ عارض بادی پور دہلی، ۱۹۶۸ء، ۲۲۸

علیک سلیک، یوسف ناظم بے باک پبلشنگ ہاؤس مالیگاؤں ۲۰۰۲ء، ۱۴۸

عہد ساز لوگ، ابوالفضل صدیقی، الفیصل اردو بازار لاہور ۳۳۵

غزالان رعنا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۹۰ء ۱۹۲

فل دستہ، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور ۱۹۹۳ء، ۱۹۰

قامت جاناں، یوسف کامران سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۱۹

قد آدم، اکبر حمیدی، بکر پبلشرز اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ۱۸۲

کاروان رفتہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۳ء ۲۲۸

کاروان سرائے، مستنصر حسین تارڑ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء، ۱۷۶

کتابی چہرے، ضمیر جعفری، مکتبہ الحقائق راولپنڈی، ۱۹۹۳ء، ۲۲۸

کلوز اپ، اعجاز رضوی، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور ۱۹۸۹ء ۱۰۹

کہاں گئے وہ لوگ، حزیں کاشمیری، اردو کتاب گھر لاہور ۲۰۰۵ء، ۹۵۶

کھلی کتاب، عابد سہیل، بیلی گنج لکھنؤ، ۲۰۰۳، ۲۰۸

کیا خوب آدمی تھا (تقاریر آل انڈیا ریڈیو) حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی، ۱۹۳۱ء ۱۴۰

کیا خوب آدمی تھا (سید عابد حسین ڈاکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۲۰۰۳، ۱۱۹

کیا قافلہ جاتا ہے، نصر اللہ خان، مکتبہ تہذیب و فن کراچی، ۱۹۸۳، ۲۵۵

گلدستۂ احباب، ڈاکٹر اسلم فرخی، حوری نورانی مکتبۂ دانیال کراچی ۱۹۸۴ء ۳۶۳

گلہائے رنگ رنگ، پروفیسر منور رؤف بک سینٹر حیدر روڈ راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ۲۳۱

گلہائے رنگ رنگ، پروفیسر منور رؤف، ادارہ تحقیق و تصنیف پشاور، ۱۹۸۰ء، ۲۳۱

گنجہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی، ۱۹۶۰ء ۲۶۷

گنجہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور ۱۹۷۱ء، ۲۷۲

گنجینۂ گوہر، شاہد احمد دہلوی، مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۸۶ء ۲۲۸

گنجینۂ گوہر کھلا، صادق الخیری، شہباز بک کلب کراچی، ۱۹۸۵ء، ۲۷۸

متاع بے بہا، حافظ لدھیانوی، بیت الادب گلستان کالونی فیصل آباد ۱۳۰۶ھ، ۲۳۲

متاع گم گشتہ، حافظ لدھیانوی، بیت الادب گلستان کالونی فیصل آباد ۱۹۹۰ء، ۲۳۱

مت سہل ہمیں جانو، انور ظہیر خاں، وہ دو بابھاوے نگر کرلا (ویسٹ بمبئی) ۱۹۹۶ء، ۱۷۲

مت سہل ہمیں جانو، ڈاکٹر محمود الرحمٰن، پیپچ کوورنگ کارپوریشن، اسلام آباد ۱۹۸۶ء ۱۱۳،

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، (جلد دوم) مجتبیٰ حسین / حسن چشتی، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء، ۳۵۲

مجھے تو حیران کر گیا وہ، احمد عقیل روبی، ورڈز آف وزڈم القرطبہ کمپلیکس لاہور ۱۹۹۳ء ۱۱۳

مجھے یاد آنے والے (سوانحی خاکے) محمد ثناء اللہ عمری، مجلس پنجم آکدھرا ۱۹۹۶ء، ۲۳۹

محبتیں ہی محبتیں، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن / عاصم محمد کلیار، الوقار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء، ۲۸۶

محبی، محمد طفیل، فروغ اردو انارکلی لاہور ۱۹۸۱ء ۱۸۰

محفل، حسن الدین احمد، ولا اکیڈمی حیدرآباد دکن ۱۹۸۲ء ۲۱۵

مخلصے، بیدم، حیرت شملوی، انیس شاہ جیلانی، حیرت شملوی اکادمی محمد آباد رحیم یار خان ۱۹۸۱ء، ۲۵۰

مردم دیدہ، چراغ حسن حسرت، دار الاشاعت، پنجاب لاہور ۱۹۳۹ء ۱۹۸

مزید گنجے فرشتے، عطاء الحق قاسمی، شفیق پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۷ء، ۲۵۶

مسافران راہ وفا (حصہ اول) حافظ محمد ادریس، مکتبہ احیائے دین منصورہ لاہور ۱۹۹۳ء، ۲۲۷

معظم، محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۷۳ء، ۲۰۱

ملاقاتیں، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۱ء، ۳۵۲

منتخب سوانحی خاکے، سید نجم الدین نقوی، انوار بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۷ء ۱۷۶

مہاتما سے روپ کوورنگ، گاندھی تاتھ بھگن / عبدالحی، ڈاکٹر نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، ۱۹۸۷ء، ۱۵۹

میرا کوئی ماضی نہیں، سحاب قزلباش، فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار کراچی، ۱۹۹۵ء، ۱۷۵

میری محبتیں، حیدر قریشی، نایاب پبلی کیشنز محلہ کھوکھراں خانپور، ۱۹۹۶ء، ۱۹۲

میرے بزرگ میرے ہم عصر، ڈاکٹر وقار راشدی، مکتبہ اشاعت اردو کراچی، ۱۹۹۵ء، ۲۸۸

میرے عہد کے عہد ساز، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، القمر انٹر پرائزز لاہور ۲۰۰۳ء، ۳۰۲

میرے ہمسفر، احمد ندیم قاسمی، اساطیر ٹیمپل روڈ لاہور ۲۰۰۲ء، ۲۲۳

میں اور میرے، ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی، کاروان ادب ملتان صدر ۲۰۰۴ء، ۱۹۰

ناخن کا قرض، میرزا ادیب، امتزاج پبلی کیشنز اسلام پورہ لاہور ۱۹۸۱ء، ۲۳۶

نایاب ہیں ہم، صادق الخیری، شہباز بک کلب، کراچی، ۱۹۸۳ء، ۳۶۶

نایاب ہیں ہم، آوارہ سلطان پوری، اردو قبیلہ تھانے امبر بمبئی، ۱۹۹۷ء، ۱۹۰

نذرانہ اشک، مولانا محمد ثناء اللہ عمری، ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ، ۱۹۹۷ء، ۳۶۸

نفوس برگزیدہ، قاضی محمد انیس الحق نفیس اکیڈمی بنگلور، ۱۹۷۷ء، ۱۳۳

نقوش تابندہ، اخلاق احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ۲۶۸

نقوش تاثرات، ۱۹۵۸ء، محمد امام امامی، انجمن ترقی اردو بنگلور، ۳۸۲

نقوش خاطر، عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا آزاد اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ۱۲۸

نقوش رفتگاں، محمد تقی عثمانی، ادارۃ المعارف، کراچی ۱۹۹۴ء، ۳۶۸

نقوش رفتگاں، محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن لاہور ۲۰۰۳، ۴۲۸

نقوش رفتہ، رفعت سروش، چند اردو روڈ نئی دہلی ۱۹۸۳ء، ۲۰۰

نگینہ بیکری کا قلندر، کشمیری لال ذاکر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ۱۱۳

نئی محبتوں کے سفیر، ذاکر لال کشمیری، شان ہند پبلی کیشنز دریا گنج نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ۲۰۰

نئے خاکے، اختر حامد خان، سٹی پریس بک شاپ عبداللہ ہارون روڈ کراچی، ۱۹۹۹ء، ۱۲۲

نیم رخ، باقر مہدی، اظہار پبلی کیشنز ممبئی، ۲۰۰۵ء، ۳۲۰

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے، مولانا عبدالماجد دریابادی، مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۷۸ء، ۲۳۲

وہ آئیں گھر میں ہمارے، عبدالقوی ضیاء (علیگ) بزم تخلیق ادب کراچی ۱۹۹۷ء، ۲۲۳

وہ اور میں، فضل الرحمٰن نعیم، رائٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان لاہور ۱۹۸۰ء، ۲۵۲

وہ جا رہا ہے کوئی۔ فرخ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۲ء، ۱۰۳

خاکہ نمبر

وہ صورتیں کس دیس بستیاں ہیں، جگن ناتھ آزاد، ۔۔۔ بک ہاؤس پبلی کیشنز جموں، ۲۰۰۳ء، ص۲۳۸

وے صورتیں الٰہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۳۹۲

ہم سفروں کے درمیاں، شمیم حنفی، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص۲۷۲

ہم قبیلہ، علی جواد زیدی، اتر پردیش، اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص۲۵۲

ہم نفسان رفتہ، رشید احمد صدیقی، سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص۱۵۸

ہم نفسوں کی بزم میں، شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۲۹۶

ہو بہو، پروانہ ردولوی ایس ایم تحسین حوض رانی مالویہ نگر نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۲۳۰

ہو بہو، مشہود حسن رضوی، مکتبہ الہام ماڈل ٹاؤن، بہاولپور، ۱۹۹۶ء، ص۱۵۹

ہو جائیں نہ مبہم تیری تصویر کے خاکے، عبدالسبحان بسوی، شکیل برادرز لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۱۷۶

یادِ رفتگاں، خواجہ محمد عبدالمجید، ضیا محل دہلی، ۱۹۳۱ء، ص۱۲۰

یادِ رفتگاں، جگر بریلوی، مکتبہ انوار ۔۔۔ ۱۹۳۱ء، ص۳۰۶

یادوں کے اجالے، قمر یورش، یورش اکیڈمی، فیروز پور روڈ لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۱۳۳

یادوں کے دیے، محمد حمزہ فاروقی، مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی، ۲۰۰۱ء، ص۱۳۸

یادوں کے زخم، سید عطا حسین، کلیم فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ، ۱۹۹۶ء، ص۲۰۸

یادوں کے سائے، سید مقصود زاہدی، کاروان ادب ملتان صدر، ۱۹۷۶ء، ص۲۰۸

یاران تیز گام، کشمیری لال ذاکر، ایجوکیشنل بک ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۱۵۲

یاران دیرینہ، ڈاکٹر بریلوی، ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۳۰

یاران رفتہ، یوسف بخاری دہلوی، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۱۹۰

یاران کہن، عبدالمجید سالک، چٹان، پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۲۳۰

یاران مکتب، بیدار ملک، پاکستان اسٹڈی سینٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۵۶۰

یاران نجد، مقبول جہانگیر، نسیم بک ڈپو، کچہری روڈ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۷۶

یہ بیچارے لوگ، شاہدہ بخاری، شاد پبلی کیشنز کوئٹہ، ۲۰۰۶ء، ص۱۸۷

یہ لوگ، سری نواس لاہوٹی، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۱۰۹

یہ لوگ بھی غضب تھے، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۵۳

وقت کے تقاضوں کی تکمیل...

ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان

ISO 9001:2008 & ISO 22000:2005 CERTIFIED

Website: www.hamdard.com.pk

UHU
stic The rub-on adhesive in a stick

- UHU's lipstick-style applicator makes it the neatest way to glue!
- Convenient! Just take off the cap and rub it on. There's no quicker, easier way to paste clippings in scrapbooks, work on arts and crafts projects, keep photo albums, seal envelopes, stick down notes and do hundreds of other jobs.
- Works on paper, cardboard, photos, fabric, polystyrene and more.
- Dries wrinkle-free.
- Was hable, non-toxic formula makes it safe for children.
- Perfect for school, home or office.

...the cleaner better way to glue